حیدر قریشی کا ادبی سفر

عامر سہیل

حیدر قریشی کا ادبی سفر

عامر سہیل

Haider Qureshi Ka Adabi Safar

By Aamir Sohail

حیدر قریشی کے فکروفن پر کئی جامعات میں کام ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے۔ عامر سہیل کا یہ مقالہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ مقالہ نگار نے جستجو اور لگن کے ساتھ حیدر قریشی کے بنیادی مزاج اور اُن کے تنقیدی اور تحقیقی کام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالے کی اشاعت سے جہاں مقالہ نگار کے اس تحقیقی کام کی اہمیت واضح ہوگی وہیں حیدر قریشی کے فکروفن کے کئی پہلو بھی نمایاں ہوں گے جو اُردو ادب کے قاری کے لیے دل چسپی کا سبب ہوں گے۔ حیدر قریشی کا کام بہت پھیلا ہوا ہے ایک مقالے میں اس کا احاطہ ممکن نہیں لیکن عامر سہیل نے امکان بھر کوشش کی ہے کہ بنیادی پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے حیدر قریشی کے کام سے ادبی قاری کو متعارف کرا سکیں اور وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب رہے ہیں۔ **ڈاکٹر رشید امجد** (اسلام آباد)

حیدر قریشی ایک عرصے سے اردو کی ادبی دنیا میں اپنی تحریروں سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی ادبی سرگرمیاں دنیا کے ہر اُس کونے میں مشہور ہو چکی ہیں جہاں اردو کا نام ہے۔ اکثر حیدر قریشی کا ذکر یورپ میں اردو ادب کے سفیر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ حیدر قریشی کی کثیر الجہت تخلیقات پر کئی باوقار ادیب اپنی رائے لکھ چکے ہیں اور برصغیر کے دونوں ممالک میں یونیورسٹیوں کے طالب علم ان کی ہمہ پہلو ادبی خدمات کے موضوع پر اپنے علمی مقالے بھی لکھ چکے ہیں۔ عامر سہیل نے بھی یہی موضوع چُن کر حیدر قریشی کے ادبی سفر کو اپنے زاویے سے دیکھنے کی اور خود اپنے طریقے سے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اپنا علمی کام عامر سہیل نے بڑی محنت اور لگن سے کیا ہے۔ ۳۱۶ صفحات پر مشتمل اس ضخیم تحریر کو حیدر قریشی پر موجودہ ادب میں ایک نمایاں اضافہ کہنا بالکل بجا ہوگا۔ میرے خیال میں اس مقالے کا موضوع بذاتِ خود بڑی اہمیت کا حامل ہے اور عصری دنیا میں اردو زبان اور زبان والوں کے متعدد مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔۔۔ زیرِ نظر مقالے میں ایک منفرد زاویہ نظر سے حیدر قریشی کی ادبی کارکردگی کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ عامر سہیل کے مقالے کی معلوماتی حیثیت بھی خاص طور سے قابلِ تعریف ہے۔ مقالہ نگار نے ایک تو بڑے سلیقے سے حیدر قریشی کے پورے ادبی ذخیرے کی اور ان پر لکھی ہوئی اور ان سے تعلق رکھنے والی تحریروں کی مکمل فہرست بنائی ہے۔ خود حیدر قریشی کی تصانیف کی درجہ بندی کر کے مقالہ نگار نے ہر صنف کی تفصیلات پیش کیں اور ان کی سب تصانیف پر موجود تنقیدی سرمائے کا تعارف کرایا ہے۔ عصری دور کے کسی اور اردو ادیب کی تصانیف اور اس سے منسلک ادب کے بارے میں زیادہ وسیع، واضح اور باترتیب تفصیلات کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ **ڈاکٹر لدمیلا وسیلئیوا** (ماسکو، روس)

حیدر قریشی کا ادبی سفر

(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

عامر سہیل

سقراط بکس۔ایبٹ آباد

HAIDER QURESHI KA ADABI SAFAR

(M.Phil Research Paper, Urdu Department, Hazara University Mansehra)

BY: Aamir Sohail

Year of 1st Edition 2015

نام کتاب:	حیدر قریشی کا ادبی سفر
مصنف:	عامر سہیل
اشاعت:	ستمبر 2015
ناشر:	عامر سہیل
سرورق:	ارشد خالد
مطبع:	BPH پرنٹرز لاہور
قیمت:	300 روپے

SUQRAT BOOKS ABBOTTABAD

Aamir Sohail

Department of Urdu

Abbottabad Public School

Mansehra Road,

Abbottabad(22030),KPK,Pakistan.

e mail: aamirsohailaps@hotmail.com

Mobile: 0331-57 27 998

....

بہ تعاون

Arshad Khalid

AKKAS INTERNATIONAL Islamabad

House No.1164,Street No.2,Block C,

National Police Foundation,Sector O-9,

Lohi Bheer, ISLAMABAD.

Mobile: 0300-5114739,

e mail: akkasurdu2@gmail.com

....

انتساب

جبرائیل بن عامر

سقراط بن عامر

حدیث بنتِ عامر

اور

اپنی ہم قدم میمونہ عامر کے نام

ہم بھی اک دوسرے سے کاش وہ باتیں کرتے

یہ پرندے جو سرِ شاخِ شجر کرتے ہیں

(ڈاکٹر طارق ہاشمی)

فہرست

1-	مقدمہ	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	7
2-	پیش لفظ	عامر سہیل	21
3-	**باب اول**	حیدر قریشی کی تخلیقی نثر (افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، یاد نگاری، انشائیہ نگاری، سفر نامہ نگاری)	25
4-	**باب دوم**	حیدر قریشی کی شاعری (غزل، ماہیا نگاری، آزاد نظمیں)	117
5-	**باب سوم**	حیدر قریشی بحثیت محقق	177
6-	**باب چہارم**	حیدر قریشی بحثیت نقاد	227
7-	**باب پنجم**	حاصل تحقیق	283
8-	**کتابیات**		297
9-	**سوانحی خاکہ**	(مرتب: ارشد خالد)	307
10-	**تاثرات**		
	ڈاکٹر رشید امجد		315
	ڈاکٹر لدمیلا وسیلئیوا		316
	ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی		317
	ڈاکٹر عابد سیال		318

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
ایسوسی ایٹ پروفیسر۔یونیورسٹی آف دہلی

مقدمہ

(حیدرقریشی کاادبی سفر)

حیدرقریشی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔اُردو مراکز سے دور جرمنی میں رہ کر بھی وہ ادبی دنیامیں اپنی موجودگی کا احساس گزشتہ چار دہائیوں سے دلاتے آرہے ہیں۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں وہ بیک وقت ایک اچھے محقق،ناقداورتخلیق کار ہیں۔لہٰذاان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیناکسی عام ناقداورمحقق کے بس کا کام نہیں ہے۔ایسی ہمہ جہت شخصیت پرکام کرناکسی رشی مُنی کی طرح تپسیہ کرنے کے مترادف ہے۔

اردوادب میں تپسیہ کرنے والے تپسوی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔عامر سہیل اردو کے کمیاب تپسیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے پاکستان کے شہرایبٹ آباد میں رہ کر پاکستان کی یونیورسٹیوں کی لائبریریز، اساتذہ اوردوستوں کی ذاتی کتب خانوں کی مدتوں خاک چھانتے رہےاورحیدرقریشی کی شخصیت اورفن سے متعلق موادحاصل کرتے رہے جویقیناً انتہائی مشکل کام ہے۔اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے ہاتھ پاؤں توڑکرایک تپسوی کی طرح بیٹھنا اورتمام مواد کا مطالعہ کرنا اورپھراپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کارلاکر حیدرقریشی کےفن اورشخصیت کومتعین کرنا۔عامر سہیل نے اس کام کوانجام دینے میں تحقیق وتنقید کاحق ادا کردیا ہے۔ان کی زیرِبحث تصنیف ''حیدرقریشی کا ادبی سفر'' ان کی تحقیقی وتنقیدی وژن کی بہترین مثال ہے۔عامر سہیل نے اتنی کم عمری میں اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے ہندوپاک ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی سرگرم ادبی محفلوں میں اپنی منفرد پہچان بنالی ہے۔سائبراسپیس کی ادبی دنیاپربھی ان دونوں حضرات کی حکمرانی ہے۔حیدرقریشی جیسی قدآورشخصیت کے تمام ادبی کارناموں پرریسرچ کرنے کے لیےجس طرح کےمحقق وناقد کی ضرورت تھی عامر سہیل بالکل ویسے ہی ہیں۔

حیدرقریشی نے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے نظم ونثر کے بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اورکم وبیش ہرصنف میں اپنے فن کا جوہر دکھایا ہے جس میں صنف افسانہ خاص اہمیت کی حامل ہے۔عامر سہیل نے حیدرقریشی کے تمام افسانوں کا مطالعہ اوران کے افسانوں کے تمام ناقدین کا مطالعہ کرنے کے بعد افسانے کی

شعریات کی روشنی میں انہیں بحیثیت افسانہ نگار جس طرح متعارف کرایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرقریشی ہم عصر افسانہ نگاروں کے کہکشاں میں اگر چمکتے ہوئے ستارے کی مانند ہیں تو عامر سہیل بھی معاصر افسانے کے جوہرشناس ہیں۔فکشن کے ناقدین میں بیشترحضرات افسانے میں حقیقت نگاری کی اہمیت پرزوردیتے ہیں اوراگرانہیں فکشن میں حقیت نگاری کی کمی محسوس ہوتی ہے تو ناقص فکشن قرار دیتے ہیں جبکہ حقیقت یہ کہ کسی فکشن میں حد سے زیادہ حقیقت نگاری فکشن کی اصل روح کو مجروح کردیتی ہے۔عامر سہیل بھی فکشن میں حقیقت نگاری کی زیادتی کے قائل نہیں ہیں۔ان کا خیال ہے کہ حقیقت اورفنتاسی کے درمیان توازن ضروری ہے۔اسی لئے حیدر قریشی کے افسانوں پراظہارخیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

> ''حیدرقریشی کےافسانے اگرسرسری نظر سے بھی دیکھے جائیں تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کی بنیاد بیشتر خارجی محسوسات پر رکھتے ہیں یعنی جو کچھ وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وہی سب کچھ ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اورنفسیاتی سطح پر ہوتی ہے۔اُن کے افسانوں میں حقیقت شناسی اور خیال پرستی کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ ان کا یہی امتزاجی اسلوب فنی اورفکری سطح پر ہرافسانے کومعیاری بناتا ہے۔''

حیدرقریشی کے افسانہ نگاری کے متعلق عامر سہیل کا خیال درست ہے کیوں کہ ہر بڑاافسانہ نگاراپنے افسانوں کے کردار کوحقیقی دنیا کے بجائے خیالی دنیا میں متعین کرتا ہے اورافسانے کا تانابانا بھی فنتاسی کی دنیا میں ہی بنتا ہے۔اسی لئے افسانہ اورناول کوفکشن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حیدرقریشی کاتخلیقی کینوس کافی وسیع ہے۔لہٰذا اُن کے افسانوں کے تمام فنی اورفکری لوازمات کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں ہے لیکن صاحبِ مقالہ نے حیدرقریشی کے افسانوں کا باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے لیے اپنے مطالعہ کوکئی حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہرحصہ میں کئی ذیلی موضوعات کے تحت تجزیہ پیش کیا ہے۔مثلاً پہلا حصہ ''حیدرقریشی کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ'' ہے جس کے تحت اُنھوں نے ''تصوّف اورروحانیت کے عناصر''، ''فلسفہء توحید''، ''قومی سوچ کے دھارے''، ''تجزیات اوراُصول سازی''، ''منفی سماجی رویّوں کی عکاسی''، ''ایٹمی جنگ کا مسئلہ'' وغیرہ موضوعات کی روشنی میں حیدرقریشی کے افسانوں کا جائزہ پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے حیدرقریشی کے افسانوں میں دنیاومافیہا کے تمام مسائل سمٹ آئے ہیں۔ان موضوعات کے مطالعے سے عامر سہیل کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اُن کا خیال درست ہے کہ انسان کا فکری نظام سماجی ماحول سے وابستہ ہوتا ہے۔انہوں نے حیدرقریشی کے افسانوں میں ''منفی سماجی رویّوں'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حیدرقریشی کےافسانوں میں زندگی کے جیتے جاگتے مسائل کا گہرا شعور اورادراک ملتا ہے ۔انسان کا ہرنظامِ فکر چاہے وہ فلسفہ وحکمت ہو یا مذہب یا پھرفنونِ لطیفہ کے مظاہر، یہ تمام شعبے سماجی اور اقتصادی ماحول سے پوری طرح وابستہ ہوتے ہیں لیکن ادیب کا تخیل فکرو احساس کےاُن مدارج تک رسائی حاصل کرلیتا ہے جہاں دیگرمظاہرانسانی کے پر جلنے لگتے ہیں۔''

عامر سہیل نے اس اقتباس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حیدرقریشی نہ صرف روحانی اوراخلاقی قدروں کے رمزشناس ہیں بلکہ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں۔ان تمام تجزیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدرقریشی سیاسی،سماجی،معاشرتی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ایٹمی جنگ کے خطرات سے بھی باخبر ہیں اوراپنے قاری کواپنی تخلیقات کے ذریعہ واقفیت بھی فراہم کررہے ہیں۔عامر سہیل نے مطالعہ کے دوسرے حصے میں'' فنی اور اُسلوبیاتی مطالعہ'' کے تحت پلاٹ، وحدتِ تاثر، کردار نگاری، شاعرانہ انداز بیان، خیال افروزی، تاریخی حکایات اوراقوال کا برمحل استعمال، علامت کا استعمال، سادگی، اثرپذیری، فضا بندی جیسے فنی اوراسلوبیاتی خوبیوں کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے حیدرقریشی کے افسانوں کاتنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔اس جائزے سے جہاں حیدرقریشی کے افسانوی اسلوب اورافسانے کےفن پران کی مہارت کا احساس ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عامر سہیل نے ان کے افسانوں کے تجزیہ میں اپنے ناقدانہ وژن کا استعمال کس طرح کیا ہے اوروہ فن افسانہ کےتمام لوازمات اورشعریات سے وہ کس قدر واقف ہیں۔

افسانوں کے علاوہ حیدقریشی نے خاکے بھی لکھے ہیں اورخاکہ نگاری میں بھی اپنا منفرد مقام حاصل کیا ہے۔صاحبِ کتاب نے خاکہ نگاری کےفن، اہمیت اورارتقاپرسیرحاصل ناقدانہ بحث کی ہے۔اوراس کی اہمیت پرزور دیتے ہوئے بجافرمایا ہے کہ

''ایک اچھااور معیاری خاکہ کسی شخص کامحض ظاہری اور باطنی تجزیہ ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے عہد کا ادبی، سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور ثقافتی منظرنامہ بھی مرتب کرتا ہے۔''

حیدرقریشی کے خاکے دوحصوں پرمشتمل ہیں۔ پہلے حصے میں اپنے خاندان کے افراد پراوردوسرے حصے میں ادیبوں اوردوستوں پرخاکے ہیں۔عامر سہیل نے دونوں حصوں کے تمام خاکوں کا مطالعہ اُسلوبیاتی اورفنی سطح پرکیا ہےاور یہ نتیجہ اخذکیا ہے کہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے خاکوں میں حیدرقریشی کا اُسلوب وہ نہیں ہے جودوستوں اورادیبوں کے خاکوں میں ہے۔حیدرقریشی کے اُن خاکوں جواہلِ خاندان سے متعلق ہیں، کے اسلوب پرتبصرہ کرتے ہوئے عامر سہیل نے صحیح لکھا ہے کہ

''اُنھوں نے اپنے اہلِ خانہ کےحوالے سے جو خاکےتحریر کیے وہ روایتی یا تاثراتی نوعیت کے برعکس

اعلی ادبی اقدار کا جامع مرقع بن گئے ہیں۔وہ محض تعارفی اورسوانحی معلومات پرانحصار کرنے کے بجائے گہرے ادبی شعور کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔''

عامر سہیل نے اہلِ خاندان اوردوستوں وادیبوں کے خاکوں کے اُسلوب میں جوبنیادی فرق ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' حیدرقریشی نے جوخاکے اپنے اہلِ خانہ کے حوالے سے تحریر کیے ہیں ان میں طنزومزاح کا خاصا اہتمام نظرآتا ہے جبکہ ادیبوں پرلکھے گئے خاکوں میں یہ عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔'' عامر سہیل کےتنقیدی تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب میں اعلیٰ ادبی قدروں کے قائل ہیں۔عام طور پرخاکہ نگاراپنے اہلِ خانہ اوررشتہ داروں کا جب خاکہ لکھتا ہے تواکثر جذباتی ہوجاتا ہے اوران کی کمزوریوں کونظرانداز کرکے صرف خوبیوں کوپیش کرتا ہے لیکن حیدرقریشی نے اس کے برخلاف کمزوریوں اورکمیوں کوبھی سامنے لانے کے لیے مزاحیہ اُسلوب کا استعمال کیا ہے جس کی طرف عامر سہیل نے بطورخاص اشارہ کیا ہے اوراس کی اہمیت پرزوردیا ہے۔سنسکرت کے اچاریوں کی طرح عامر سہیل کا بھی خیال ہے کہ ادب میں طنزومزاح کی اگرچاشنی نہ ہوتووہ ادب میں دلکشی پیدانہیں ہوسکتی ہے۔عامر سہیل نے خاکے کے اصول وضوابط کی روشنی میں حیدرقریشی کے خاکوں میں ماضی پرستی، شخصی تجزیات، نفسیاتی نکتے، خاکہ نگار کی اپنی شخصیت کاعکس، اَن دیکھی شخصیت کا خاکہ، مافوق الفطرت عناصر، شگفتہ مزاجی، حیدرقرشی کی تحریروں میں زوجہ مبارکہ جیسے ذیلی عنوانات کے تحت تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جس سے ان خاکوں میں حیدرقریشی کی ہمہ گیریت کا اندازہ ہوتا ہے ساتھ ہی خاکہ نگاری کی تنقید میں عامر سہیل کی مہارت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ناقدین کا خیال درست ہے کہ تخلیق کار کی شخصیت کے ارتعاشات اس کی تخلیق میں موجود ہوتے ہیں۔حیدرقریشی کے خاکوں میں بھی اُن کی شخصیت کی پرچھائیاں موجود ہیں۔حیدرقریشی کے خاکہ نگاری پرتبصرہ کرتے ہوئے آپ نے خاکہ کےفن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔آپ کا کہنا ہے:

''خاکہ نگاری توازن کافن ہے اگر یہ توازن برقرار نہ رہے تو صاحب خاکہ کی شخصیت اُبھر نے کے بجائے مسخ ہوجاتی ہے۔حیدرقریشی شخصیت کی پرکھ کے لیے معروضی اورموضوعی دونوں زاویوں کواہمیت دیتے ہیں وہ بذات خود باغ وبہار طبیعت کے مالک ہیں اوراپنی عملی زندگی میں خلوص، محبت اپنائیت اور دوستی کو خاص اہمیت دیتے ہیں، یہی تمام اوصاف ان کے خاکوں میں جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔''

فاضل مصنف نے حیدرقریشی کے خاکوں کے اقتباس کوپیش کرتے ہوئے 'شاعرانہ تخیل اورانداز بیان' پربھی اظہارخیال کیا ہے۔اُن کا خیال ہے کہ حیدرقریشی نے اپنے بیشتر خاکوں میں شاعرانہ طرزنگارش اختیار کی ہے۔رشید احمد صدیقی نے بھی خاکے کےفن پراظہارخیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''یہ تاریخی دستاویز اور شاعری کے درمیان کی چیز ہے۔اس کا تمام تر تعلق حافظے میں موجود یادوں کو جگا کر انہیں ذاتی ،خوشگوار اور غیر رسمی لب و لہجے میں بیان کر دینے سے ہے''۔

حیدر قریشی نے اپنے خاکوں میں حقیقت نگاری اور خیال افرینی کے علاوہ طنز و مزاح اور اشعار کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔عامر سہیل نے ان تمام پہلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے حیدر قریشی کی خاکہ نگاری کا جو تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

حیدر قریشی نے اپنی کھٹی میٹھی یادوں کو بھی الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور یادوں پر مبنی مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے جس کا نام ''کھٹی میٹھی یادیں'' ہے۔اس کتاب کا مطالعہ عامر سہیل نے بطور خاص کیا ہے اور اس فن کو ''یادنگاری'' سے تعبیر کیا ہے۔ان کے مطابق یادنگاری کی روایت اردو میں نہیں ملتی ہے البتہ انگریزی زبان میں اس کی روایت موجود ہے۔شاید اسی لیے اردو میں اس موضوع پر اب تک کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے۔حیدر قریشی کے بعض ناقدین نے یادنگاری کو خودنوشت سے تعبیر کیا ہے لیکن ہمارے نقاد نے دلیلوں کی روشنی میں اسے رد کر دیا اور کافی غور و فکر کرنے کے بعد اس کے فن کو متعین کیا اور اس کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو یقیناً قابل تعریف ہے۔انہوں اس کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یادنگاری'' اصل میں سوانحی ادب کی ذیلی شاخ ہے اور دیگر ادبی اصناف کی طرح اپنا الگ وجود اور شناخت رکھتی ہے۔اس کے کچھ اجزا خودنوشت سوانح اور خاکہ نگاری سے مناسبت رکھتے ہیں لیکن اپنے بنیادی اوصاف کے باعث اس کا ذکر جداگانہ صنف کے طور پر کیا جانا چاہیے۔''

عامر سہیل نے یادنگاری پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے اسے سوانحی ادب کی ایسی صنف قرار دیا ہے جس میں گزرے ہوئے زمانے کے تجربات ،مشاہدات اور واقعات کو از سرنو تازہ کیا جاتا ہے۔تاہم ان کا خیال ہے کہ ''یہ خالصتاً شخصی اور نجی واقعات پر مشتمل بیانیہ ہوتا ہے جس کا مقصد اپنے دوستوں ،عزیزوں اور قریبی رشتے داروں کی یادوں کو غیر رسمی مگر ادبی سطح پر محفوظ کرنا ہے۔'' آپ نے یادنگاری کے اسلوب بیان پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اس کے اسلوب میں بے تکلفی پائی جاتی ہے۔

آپ نے حیدر قریشی کی یادنگاری کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے اور یادنگاری کی تمام خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اظہار خیال کیا جس سے اُن کی نثری تنقید میں مہارت کا احساس ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کی یادنگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حیدر قریشی کی یادوں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ بالکل ذاتی اور نجی تجربات اور مشاہدات کو ایسے شگفتہ اور پر اثر اُسلوب میں بیان کرتے ہیں کہ قاری بذات خود غیر محسوس

> طور پر ان کے حسی تجربات کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔اُن کی ذاتی خوشیاں اور کرب پڑھنے والے کا ذاتی کرب اور خوشی بن جاتے ہیں۔یادوں کے بیان میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جب انفرادی تجربات اجتماعی روپ کے حوالے سے اُبھرتے اور ڈوبتے محسوس ہوتے ہیں''۔

بچپن سے لے کر ان کے جرمنی آنے اور پھر جرمنی میں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کا ذکر حیدر قریشی نے جس دلکش انداز میں کیا ہے وہ لاجواب ہے۔زندگی کے ہر موڑ پر چھوٹے بڑے جو واقعات وحادثات پیش آئے ہیں ان کا ذکر بھی یادوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ہر شعبہ ہائے زندگی میں اپنا پسند و ناپسند بھی قلم بند کیا ہے۔تصوف،تفکر،مذہب ،اخلاقیات،سماجی،سیاسی نظریات جیسے موضوعات پر بھی حیدر قریشی نے کھل کر لکھا ہے۔ان تمام پہلوؤں پر عامر سہیل نے اظہار خیال کیا ہے۔حیدر قریشی نے ان تمام موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ یادوں پر مبنی ہے اس لیے اس میں غضب کی روانی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قاری اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت خود کو حیدر قریشی کا ہمنوا محسوس کرنے لگتا ہے جس کی طرف عامر سہیل نے اشارہ کیا ہے۔

حیدر قریشی کی نثری نگارشات میں انشائیے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔انشائیوں کا مجموعہ ''فاصلے ،قربتیں''میں حیدر قریشی اس فن پر مہارت کا شاندار مظاہرہ کیا ہے۔آپ نے حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کرنے سے پہلے انشائیہ کے فن ،اس کی اہمیت اور انشائیہ کے ارتقا پر کھل کر بحث کی ہے۔انشائیے کے بیشتر ناقدین نے انشائیہ کو مضمون کی بدلی ہوئی شکل سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ہمارے دوست ایسے ناقدین سے بالکل اتفاق نہیں کرتے ہیں بلکہ ان ناقدین کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔اس سلسلے میں وزیر آغا ،اکبر حمیدی اور کئی دیگر ماہرین انشائیہ کے اقتباسات کو کوٹ کیا ہے اور سیر حاصل بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ کی تنقید پر ان کی گہری نظر ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''انشائیے کے موضوعات عموماً ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور انشائیہ نگار اپنے زورِ تخیل اور شخصی زاویہء نظر اختیار کرتے ہوئے موضوع کے ایسے پوشیدہ گوشے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے جو اَب تک نظروں سے اوجھل تھے۔انشائیہ نگار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چنیدہ موضوع کو معمولی یا غیر معمولی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔''

عامر سہیل نے حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے انشائیہ کے عنوان کی اہمیت پر زور دیا ہے۔حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں کا آغاز ایک شعر سے کیا ہے اور اس کا منطقی جواز یہ دیا ہے کہ ''ہر شعر مرکزی موضوع پر مبنی ہے اور موضوع زیر بحث کی بہت سی اَن کہی باتیں شعر کی زبانی بیان ہو جاتی ہیں۔'' وہ انشائیے

میں اختصار اور جامعیت کے بھی قائل ہیں۔انشائیے کے متعلق ناصر عباس نیر کے اس خیال کہ ''انشائیہ انسان کی ذہنی اور تہذیبی ترقی کے ایک مرحلے پر نمودار ہوتا ہے''، سے اتفاق کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ ''یہی ذہنی اور تہذیبی ترقی انشائیے میں فکریات کے ایسے عناصر پیدا کرتی ہے جن کا مطالعہ حیات و کائنات کی تقسیم میں آسانیاں پیدا کرتا ہے'' عامر سہیل نے انشائیے کے متعلق بصیرت افروز خیالات پیش کرنے کے بعد حیدر قریشی کے انشائیوں کے متعلق یہ رائے دی ہے کہ ''ان کے انشائیوں میں فکری اکائیاں دھیمے سروں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔'' حیدر قریشی کے انشائیوں میں جو تفکر کے عناصر پائے جاتے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں اُصول اخذ کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے، سماجیات پر بھی ان کی نظر ہے۔ان کے انشائیوں میں سائنسی عناصر، ادبی مشاہدات و رتجربات،نفسیات ، مشاہدہء باطن اور اخلاقیات بدرجہ اتم موجود ہے۔کتاب میں ان تمام پہلوؤں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ناقدانہ اظہار خیال کیا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ انشائیے کی تنقید پر وہ بصیرت افروز نظر رکھتے ہیں۔

حیدر قریشی کے نثری سرمایوں میں سفرنامے بھی شامل ہیں جن کا بغور مطالعہ برادرم عامر نے کیا ہے اور سفرنامے کے فن، ارتقا اور خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے حیدر قریشی کے سفرناموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔حیدر قریشی کا سفرنامہ چونکہ عمرہ اور حج سے متعلق ہے اس لیے اُنھوں نے سفرنامے کے اس حصے پر عالمانہ بحث کی ہے جن کا تعلق خدا کے تصورِ انوار پرستی اور ارض پرستی کے ساتھ ہے۔اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے حیدر قریشی نے اپنے سفرنامہ میں درست فرمایا ہے کہ:

> ''اسلام نے اللہ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہہ کر اسے روشنی کے عام مظاہر سے ارفع قرار دیا، دوسری طرف بت پرستی کو ختم کر کے خانہ کعبہ کو زمینی مرکز بنا دیا، یوں اسلام نے انوار پرستی اور ارض پرستی کے مروجہ تصوارت سے ہٹ کر ایسا معتدل تصور عطا کیا جو خالق کائنات کے بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کرتا ہے۔''

حیدر قریشی کے اس اقتباس پر عامر سہیل نے عالمانہ تبصرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کس قدر خدا کی ذات وصفات، کونیات، غایت وجودیات پر اُن کی گہری نظر ہے:

> ''حیدر قریشی نے خدا کی ذات وصفات کے حوالے سے جو باتیں لکھی ہیں وہ بظاہر بہت سادہ نظر آتی ہیں لیکن اگر اُن پر غور کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے خدا کے بارے میں ایسے تمام دلائل یا تصورات جن کا تعلق کونیات، غایت، وجودیات یا اخلاقیات سے بنتا ہے اور جس کی رو سے ذات باری تعالیٰ کا ایک میکانکی تصور اُبھرتا ہے اُن کی نفی کر دی ہے اور اس کے برعکس خدا کے اس ارفع تصور کو نمایاں کیا ہے جو قرآنی تعلیمات کا عطا کردہ ہے اور خدا

> کے بارے میں ہمارے تمام تصورات کو راست سمت رکھتا ہے۔''

حیدر قریشی کے زیر بحث سفرنامہ میں تاریخی مقامات کی معلومات بھی فراہم کرائی گئی ہے جن میں حضور اکرمؐ کا مقام پیدائش، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکان، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور متعدد دیگر صحابہ کرامؓ کے مکانات شامل ہیں۔جن کے نشانات اب ختم ہو چکے ہیں۔حیدر قریشی نے ان مقامات کے لیے اظہار افسوس کیا ہے۔صاحبِ کتاب بھی حیدر قریشی کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔اُنھوں نے اس کے علاوہ اس سفرنامہ میں موجود حیدر قریشی کے صوفیانہ خیالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تصوف میں حیدر قریشی کا مسلک خانقاہیت نہیں بلکہ اجتماعیت ہے اور وہ تصوف کو زندگی کی حرکی قوت سمجھتے ہیں اور دنیا تیاگ دینے والی روحانیت اور تصوف کو خاطر میں نہیں لاتے۔'' فاضل محقق کے تبصروں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ صرف تنقید و تحقیق ہی نہیں بلکہ تصوف اور دینیات میں بھی عمل دخل رکھتے ہیں۔

حیدر قریشی نے نثر کے علاوہ شاعری میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔شعری اصناف میں غزلیں، آزاد نظم اور ماہیے میں اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔اس کتاب میں حیدر قریشی کے تمام شعری سرمایے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔غزل کی شعریات کی روشنی میں حیدر قریشی کی غزلوں میں موجود سماجی شعور، اقدار کی شکست وریخت ، نئے نئے معاشرتی مسائل ،فکر و فلسفے ، جذبہ محبت، منفی اقدار پر طنز، تہذیبی دھارے اور فلسفہ عشق وغیرہ موضوعات پر باریک بینی سے بحث کی ہے اور تنقیدی رائے دی ہے۔مثلاً فلسفۂ عشق تبصرہ کرتے ہوئے عامر سہیل نے لکھا ہے:

> ''حیدر قریشی کا فلسفۂ عشق رجائیت پر مبنی ہے اور یہی ان کے فکر و تخیل کی اصل پہچان ہے۔ ان کی شاعری میں یہ جذبہ کبھی جنون اور کبھی والہانہ محبت کی صورت سامنے آتا ہے اور فکری تہہ داری میں اضافہ کرتا ہے''۔

عامر سہیل کی تنقیدی تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں روایتی تصور عشق کے قائل نہیں ہیں ۔عشق ان کے نزدیک جستجو اور طاقت کے مترادف ہے۔ ہمارے دوست شاعری میں شوریدہ سری اور تلخی کے قائل بھی نہیں ہیں۔وہ مسائل سے گھبرانے کے بجائے اس سے سامنا کرنے کے قائل ہیں۔اسی لیے حیدر قریشی کی غزل کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''مسائل کی آگ نے ان کی شخصیت اور فن کو جلایا نہیں، کندن بنایا ہے۔وہ اپنی ناراضگی، تکلیف اور دکھ کا اظہار بھی تہذیب اور شائستگی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔'' حیدر قریشی کی غزلوں میں جو فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز فکر ہے اس پر بھی اُنھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ان کا خیال درست ہے کہ'' حیدر قریشی کے فکری اُسلوب جہاں حیات و کائنات کے اہم مسائل سے تعرض کرتا ہے وہاں شعری اُسلوب میں فنی محاسن کی موجودگی معیار و اعتبار کے نئے علاقے قائم کرتی ہے''۔اس کے علاوہ حیدر قریشی کی غزلوں کے حوالے

سے صنعتوں اورشعری لوازمات مثلاً تلمیحات،تغزل،صنعت تضاد یا طباق،قوافی میں صنعتِ تضاد کی مثال،تکرار لفظی،تکرارِ مطلق،تکرار مستانف،تکرار مع الوسائط،تشبیہات واستعارات،سہلِ ممتنع،تراکیب کا استعمال اورشعری محاسن کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اورحیدرقریشی کی غزلوں میں ان تمام لوازمات کے استعمال کا جائزہ پیش کیا ہے۔آخر میں انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''حیدرقریشی کافکری اُسلوب جہاں حیات وکائنات کے اہم مسائل سے تعرض کرتا ہے وہاں شعری اُسلوب میں فنی محاسن کی موجودگی معیار واعتبار کے نئے علاقے قائم کرتی ہے۔اُنھوں نے اپنا وسیلۂ اظہار موثر بنانے کے لیے عمدہ الفاظ،معیاری زبان وبیان،بلیغ تراکیب،معنی خیز استعارات وتشبیہات اور جدید علائم ورموز کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔مواد وہیئت کا سلجھا ہوا امتزاج اور ارتکاز اُن کی غزل کا وقار بڑھاتا ہے۔''

حیدرقریشی نے غزلوں کے بعد ذیلی اصناف شاعری ''ماہیا''میں بھی طبع آزمائی کی اور اس فن کو بلندی تک پہنچانے میں ایک شاعر،محقق اورناقد کی حیثیت سے اہم رول ادا کیا ہے۔ماہیا دراصل تین مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر ترین نظم ہوتی ہے لیکن اس میں حسن وعشق کے علاوہ ہرطرح کے مضامین پیش کئے جاتے ہیں۔ماہیا میں بلا کی نغمگی پائی جاتی ہے شاید اسی لئے فلموں میں اس کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔نے حیدرقریشی کی ماہیا نگاری کا فنی وفکری مطالعہ جس طرح سے پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔حیدرقریشی کے ماہیوں میں نعتہ اور منقبتی ماہیوں کی تعداد کافی ہے۔لہٰذا عامر سہیل نے فکری محاسن کے تحت حیدرقریشی کے نعتہ اور منقبتی ماہیوں کا جائزہ پیش کیا ہے اوران ماہیوں میں حضرت محمدؐ سے عقیدت اورمحبت،خانہ خدا میں حاضری کی کیفیت،حضرت علیؓ کے فرمودات سے اکتساب اورصوفیائے کرام سے نیاز مندی وغیرہ کے جو جذبات بدرجہ اتم موجود ہیں ان کا بطور خاص جائزہ پیش کیا ہے۔حیدرقریشی نے اپنے ماہیوں میں مظاہر فطرت،سماجیاتی مسائل،ثقافتی رنگ،لوک داستانوں کا ذکر،عمر گریزاں کا احساس ملتا ہے جن پر عامر سہیل نے کھل کر تنقیدی تبصرے کئے ہیں۔

عامر سہیل نے فکری محاسن کا جائزہ لینے کے بعد ماہیا کے اُسلوبیاتی اورفنی محاسن سے بھی بحث کی ہے۔ان کا خیال ہے'' فکروفن کا یہ امتزاجی عمل خیال کی شیرازہ بندی میں حسن وجمال کے رنگ پیدا کرتا ہے۔ان فنی محاسن کا مطالعہ اصل میں شاعر کے ذہنی اُفق اور جودتِ طبع کا مطالعہ بھی ہے''۔اس ضمن میں انھوں نے حیدرقریشی کے ماہیوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی کامیابی میں محاکات نگاری کا بہت اہم رول ہے کیوں کہ حیدرقریشی کے ماہیوں میں بعض مناظر کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔آپ نے ماہیوں کے اوزان سے بھی بحث کی ہے۔آپ کا خیال ہے کہ حیدرقریشی نے ہی ماہیا کے معیاروا وزان متعین کیا ہے اورانہیں کے وضع کردہ اوزانوں اوراصولوں کو تمام ماہیا نگاروں نے اپنایا۔آپ لکھتے ہیں:

''ماضی میں شعرائے کرام نے ثلاثی اور ہائیکو کے اوزان میں ماہیے لکھے جس کی وجہ سے ماہیے کی اپنی شناخت گم ہوکر رہ گئی تھی۔حیدرقریشی نے اس صنف کے اوزان اورمزاج کی وضاحت کے لیے جو تحقیقی اورتنقیدی مضامین لکھے تھے،وہ بالآخر ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اُردو ادب میں ماہیے کو دوسری تمام اصناف سے الگ سمجھا جاتا ہے اوراسے مخصوص اوزان کی مدد سے لکھا جارہا ہے۔حیدرقریشی نے ماہیے کو اپنا اصل مقام دلانے میں کلیدی اورتاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔''

عامر سہیل نے اپنی تحقیق وتنقید سے حیدرقریشی کی ماہیا نگاری پر جس طرح سے روشنی ڈالی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔انہوں نے ماہیے کے ثقافتی پس منظر اوراس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ''حیدرقریشی نے اپنے ماہیوں میں کئی ایسے الفاظ برجستہ استعمال کیا ہے جو عوامی محلِ استعمال تو رکھتے ہیں لیکن ادبی زمرے میں نہیں آتے تھے۔یہ ان کا لسانی شعور ہے کہ اصل زبان کی چاشنی اور سادگی کو قائم رکھا ہے''۔عامر سہیل نے حیدرقریشی کے ماہیوں کا جائزہ لیتے وقت سراپا نگاری،جدتِ ادا،مجاز کی صورتیں،خیال بندی،تخیل اورمکالماتی انداز کو اپنے بحث کے دائرے میں لائے ہیں اوران کی اہمیت افادیت پر زور دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ماہیا بلکہ تمام اصناف شاعری کے ناقد ہیں۔

حیدرقریشی نے جس طرح غزل اور ماہیا کی تخلیق میں اپنے فکروفن کا جوہر دکھا ہے اسی طرح آزاد نظم میں بھی انہوں نے قابل قدر تخلیقی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔صاحبِ کتاب نے بھی حیدرقریشی کی آزاد نظموں کا فنی وفکری مطالعہ کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ''حیدرقریشی کی فکر اور توانائی کا جو معیار اُن کی غزلوں اور ماہیوں میں نظر آتا ہے وہ آزاد نظم میں بھی اپنی پوری رعنائی اور توانائی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔''فاضل مصنف نے ان کی آزاد نظموں کے فکری محاسن کے ضمن میں فطرت پسندی،ثقافتی تصورات،فلسفیانہ تناظر،دین اسلام سے محبت اوررومانوی عناصر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اورآزاد نظم میں حیدرقریشی کی فکری وژن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔مثلاً فلسفیانہ تناظر پر اظہار خیال کرتے ہوئے حیدرقریشی کی فلسفیانہ بصیرت کو جس طرح پیش کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عامر سہیل بھی فلسفے کے رمز شناس ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''حیدرقریشی کی شعری جمالیات میں ایک بڑا حصہ فلسفیانہ پہلوداری کا بنتا ہے۔اُن کی نظم ''تخلیق در تخلیق'' کائناتی سچائیوں کو کلیت کے دائرے میں رکھ کر سمجھا جارہا ہے۔اس فکری نظم میں کائنات کی قوتِ تخلیق کو انسان کی جمالیات،اخلاقیات اورتہذیبی وثقافتی حوالوں کی مدد سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔حیدرقریشی خود بھی حسنِ اَزل اور کائنات میں اُبھرنے والی صورتوں سے لطف اندوز ہورہے ہیں اورقاری کو اپنے ساتھ اس فلسفیانہ گہرائی میں اترنے کا

موقع فراہم کرتے ہیں۔کائنات کے عملِ تخلیق میں چھپا ارتقا کا راز حیدر قریشی کے لیے باعث کشش ہے۔وہ گُل کی معنویت کو ارتقا سے جوڑ کر فکری جمالیات کا تاثر گہرا دیتے ہیں‘‘

عامر سہیل نے حیدر قریشی کی نظموں میں فکری عناصر کا جائزہ لینے کے بعد فنی اور اُسلوبیاتی محاسن کا بھی تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔اس ضمن میں خود کلامی، تجرید و تجسیم، تلمیحات، گداز کی کیفیت اور امیجری جیسی صنعتوں کی تعریف و توضیح پیش کی ہے اور اس کی اہمت پر زور دیتے ہوئے فنی اور اسلوبیاتی سطح پر حیدر قریشی کی آزاد نظم کا جائزہ پیش کیا جو قابلِ تعریف ہے۔مثلاً امیجری کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’شاعری میں امیجری کا استعمال خاصا وسیع اور عمیق معنویت کا حاصل ہوتا ہے۔انگریزی لفظ امیجری ہمارے ہاں اُردو اصطلاح کے مطابق ’’محاکات‘‘ سے قدرے وسیع ہے اور اس میں لفظی پیکر یا محاکات کے تمام تلازمات از خود شامل ہو جاتے ہیں، بلکہ تمثال کے تمام رنگ بھی اسی کی ذیل میں آتے ہیں۔حیدر قریشی کے ہاں امیجری کا استعمال کئی نظموں میں ملتا ہے‘‘۔

حیدر قریشی کی نثری اور نظمیہ تخلیقات کا تنقیدی جائزہ جس انداز سے لیا گیا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم عصر ناقدین کی کہکشاں میں انہوں اپنی موجودگی درج کرالی ہے۔عامر سہیل نے حیدر قریشی کی تخلیقی تصانیف کے علاوہ تحقیقی اور تنقیدی تصانیف کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جس سے ان کے تنقیدی وژن کا پتہ چلتا ہے۔

عامر سہیل نے حیدر قریشی کے خالص تحقیقی کاموں کو پرکھنے کے لئے تحقیقی اُصول وضوابط کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔اس سلسلے میں عامر سہیل نے ڈاکٹر خلیق انجم کے حوالے سے ادبی محقق کے تین اہم فرائض یعنی حقائق کی تصدیق یا تردید، نئے حقائق کی تلاش، حقائق کی تشریح و تعبیر کی روشنی میں محقق کی اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’ایک سنجیدہ اور ذمہ دار محقق ان فرائض کی ادائیگی کے بعد پوشیدہ ادبی خزانوں کی بازیافت کرتا ہے۔تحقیق کا اصل کام ہی سچائی کی تلاش ہے۔جو تحقیق داخلی اور خارجی حوالوں سے خود مکتفی ہو وہی قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے اور علم وادب کے نئے نئے پہلو سامنے لاتی ہے۔معروضیت اور حقیقت پسندی کی بدولت تحقیقی اُمور کی قدر بڑھتی ہے۔‘‘

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحقیقی عمل کو کافی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ماہیے کی تحقیق میں حیدر قریشی کارناموں کا جائزہ انہوں نے کافی دیانت داری سے لیا ہے۔تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں آپ نے حیدر قریشی کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ:

’’حیدر قریشی کی تحقیقات میں یہ مثبت عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ماہیے کی تحریک میں جہاں ان کا ذوقِ تکمیل خضرِ راہ کا فریضہ انجام دے رہا تھا وہاں اُن کی قوتِ استدلال، خود اعتمادی اور توضیحِ فکر، حقائق کی فراہمی میں ہمدرد معاون ثابت ہوئے۔یہ ان کی ذہین فعالیت اور وسیع النظری کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اُنھوں نے جہاں مرد ماہیا نگاروں کی تخلیقی کاوشوں کو متعارف کرایا، وہاں خواتین کی ادبی خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا‘‘۔

تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں لیکن ہمارے دوست نے حیدر قریشی کی تحقیقی صلاحیتوں کی وضاحت کرنے کے لئے ان کی تصانیف جو صرف ماہیے سے متعلق ہے کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ حیدر قریشی کی تحقیقی تصانیف کی بدولت ماہیا کا صحیح معیار متعین ہوا، اس کی نئی تعریف و توضیح سے اس صنف کی غیر معمولی مقبولیت ہوئی۔ماہیے سے متعلق دیگر مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے حیدر قریشی کی تمام تصانیف کا مطالعہ ’’حیدر قریشی کے تحقیقی موضوعات‘‘ اور ’’حیدر قریشی کے محققانہ اوصاف‘‘ کی روشنی میں کیا ہے۔حیدر قریشی کے تحقیقی موضوعات کی کے تحت ’ماہیے کا آغاز وارتقا‘، ’ماہیے کے اصل اوزان کی دریافت‘ ’ماہیے کی تحریری صورت کا مسئلہ‘، ’ماہیے کے موضوعات‘، ’ماہیے کے مزاج کا مسئلہ‘، ’اردو میں ماہیے کا اصل بانی‘، ’ماہیے کے فروغ میں خواتین کا حصہ‘، ’ماہیا اور ادبی رسائل‘، ’حیدر قریشی کے مصاحبے اور تحقیقی زاویے‘ اور ’ماہیے کے سالانہ تحقیقی جائزے‘ جیسے عنوانات قائم کر کے عامر سہیل نے حیدر قریشی کی ماہیا نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ماہیے کے متعلق انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

’’ماہیا پنجابی تہذیب وثقافت کا زائیدہ ہے اور اس میں گہرے فلسفیانہ اور فکری موضوعات کے برعکس جذبوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔پنجابی میں ماہیے کی جو روایت چلی آرہی ہے، اُس میں پیار ومحبت کا اظہار عورت کی طرف سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن مرد کے اظہاریے بھی موجود ہیں۔دورِ جدید میں عورتوں کی نسبت مردوں نے اس صنف پر خصوصی توجہ صرف کی جس کی وجہ سے یہ صنف اپنی انفرادیت اور اہمیت منوانے میں کامیاب رہی ہے۔‘‘

عامر سہیل نے حیدر قریشی کے محققانہ اوصاف کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔حیدر قریشی نے تحقیق کے مراحل سے گزرتے وقت توازن، غیر جانب داری کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔انہوں نے معتدل تحقیقی روش اختیار کیا اور عروض سے واقف ہونے کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔انہوں نے حوالے درج کرنے میں بھی احتیاط برتی ہے یہاں تک کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔انہوں نے دستاویزی تحقیق سے بھی استفادہ کیا ہے اور مستقل مزاجی کا ثبوت پیش کیا ہے۔تجزیاتی اور وضاحتی اُسلوب ایسا اختیار کیا ہے کہ قاری بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔مختصر یہ کہ انہوں نے سادہ اُسلوبِ نگارش سے انحراف نہیں کیا ہے۔ان تمام نکات کی روشنی حیدر قریشی کے تحقیقی نگارشات

کاتنقیدی جائزہ پیش کیا جس معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کا اپنا ذہن کس قدر محققانہ ہے۔ حیدر قریشی کے اسلوب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے درست کہا ہے کہ:

> ''حیدر قریشی کی تمام تحقیقی تحریروں میں تجزیات اور تشریحات کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ سائنسی اور وضاحتی اُسلوب ان کی تحقیقات میں قطعیت پیدا کرتا ہے صنف ماہیا پر ان کا موٴقف جہاں تاریخ کی روشنی میں استدلال قائم کرتا نظر آتا ہے وہاں مسائل کو استخراجی اور استقرائی طریقوں سے واضح کرنے کا عام رجحان بھی ملتا ہے۔''

عامر سہیل نے حیدر ''قریشی بحیثیت محقق'' کا جائزہ لینے کے بعد حیدر قریشی کا مقام بحیثیت نقاد بھی متعین کیا ہے۔ حیدر قریشی کی تنقیدی تصانیف میں ماہیے سے متعلق کتابوں کے علاوہ ان کے خطوط، تقاریر اور مستقل تنقیدی مضامین ہیں جن کے ذریعے انہوں نے تنقیدی عمل کو آگے بڑھایا ہے۔ نیز ان کے تبصرے اور کتابوں کے دیباچے بھی ہیں جن میں تنقیدی عناصر موجود ہیں۔ آپ نے تمام تنقیدی سرمایے کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں منصف مزاج اور معقولیت پسند نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ تہذیبی رکھ رکھاؤ اور اثر آفرینی ان کے تنقیدی اسلوب کے مضبوط ستون ہیں۔'' عامر سہیل نے ان کی تنقید پر تبصرہ کرتے ہوئے کافی احتیاط برتنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تنقید کی تعریف، موضوع اور حدود پر مختلف ناقدین کی رائے اور اقتباس کی روشنی میں تنقیدی تبصرے کرتے ہیں۔

حیدر قریشی کے اہم تنقیدی موضوعات کا مطالعہ کرنے کے لیے انھوں نے حیدر قریشی کی تنقیدی نقطۂ نظر کے کئی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ مثلاً اُردو زبان وادب اور مغربی ممالک، تنقید نگاروں پر تبصرے اور تجزیے، افسانوی مجموعوں پر اظہارِ رائے، معاصر ناول پر تنقیدی نظر، سفر ناموں پر مختصر تبصرے اور تاثرات، تحقیقی کاموں کا محاکمہ، سوانحی ادب پر نقد ونظر، شعری مجموعوں پر ناقدانہ نظر، ادبی شخصیات

پر نقد ونظر، ادب میں سرقہ اور جعل سازی کی نشاندہی اور ماہیے پر تنقیدی مباحث جیسے عنوانات کے ذیل میں حیدر قریشی کی تنقیدی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے بعد حیدر قریشی کے تنقیدی رویے اور اُسلوب پر ناقدانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے حیدر قریشی کی تنقیدی رویوں کو کا مطالعہ، تنقیدی نظریات اور طریقِ کار، کفایت لفظی اور سادگی، حقیقت پسندی، تشریحی اور توضیحی انداز، معروضی تنقید، فکری عناصر، عصری آگہی، تخلیقی اُسلوبِ تنقید، ادبی دیانت داری، موضوع اور اُسلوب کی سنجیدگی وغیرہ جیسے موضوعات پر بحث کی ہے اور ان کا جائزہ لیا ہے تاکہ بحیثیت ناقد حیدر قریشی کا مقام متعین کیا جا سکے۔ جنابِ سہیل نے متذکرہ تمام موضوعات کی تعریف اور اہمیت پر بھی اظہارخیا کیا ہے۔ مثلاً معروضی تنقید کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ''معروضی تنقید کا ناقد اگر ایک طرف زیرِ بحث مسئلہ پر غیر جانب داری کا ثبوت دیتا ہے تو دوسری جانب وہ اپنے انفرادی ذوق کو بھی بروئے

کار لاتا ہے۔ جمالیاتی قدروں اور اُسلوبیاتی اوصاف پر بات کرنا معروضی تنقید کے اہم زاویے ہیں۔'' اس کے بعد آپ نے معروضی تنقید کی ذیل میں حیدر قریشی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''حیدر قریشی کی تحریروں میں معروضی تنقید کا عنصر اپنے تمام مثبت پہلوؤں کے ساتھ موجود ہے۔ اس ضمن میں ذوق و وجدان کی رہنمائی بھی وہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے مروجہ اسالیب سے اپنی الگ راہ نکالتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تنقیدات اصل فن پارے کے صوری اور معنوی حسن کی نقاب کشائی کریں۔ وہ تنقید کی بڑی بڑی اصطلاحات سے نہ خود مرعوب ہوتے ہیں اور نہ دوسروں پر رعب جھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہر تنقیدی مضمون میں اخلاقی مطالبات کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور جذبہ، خیال، مواد اور ہیئت میں خاص تناسب قائم رکھتے ہیں۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کا تنقیدی رویہ کیا ہے اور وہ تنقید کے کن اصولوں کے قائل ہیں۔ مختصر یہ کہ عامر سہیل نے حیدر قریشی کے ادبی سفر پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس میں انہوں نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ حیدر قریشی کے تمام تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی سرمایوں کا جا طرح جائزہ لیا ہے اور حیدر قریشی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عامر سہیل ایک منجھے ہوئے ناقد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوگی۔

▪▪

پیش لفظ

سب سے پہلے خداوندِ کریم کا شکرادا کرتا ہوں کہ اُس کی عطا کردہ ہمت اور صحت کی وجہ سے یہ مشکل کام پایۂ تکمیل تک پہنچا اگر خدا کی مرضی شاملِ حال نہ ہوتی تو اس تحقیقی کام کا انجام پانا مشکل تھا۔ آج جب اپنے اس کام کو دیکھتا ہوں تو جہاں قلبی طمانیت کا احساس ہورہا ہے وہاں اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ اگر میرے والدین زندہ ہوتے تو میری اس خوشی میں وہ بھی شریک ہوتے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کا وہ جہان اچھا کرے، آمین!

ایم فل (اُردو) کا کورس ورک مکمل کرنے کے بعد جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو اندازہ ہوا کہ جس کام کو میں آسان سمجھ رہا تھا اُس میں پیچیدگی کی کئی صورتیں مجھے پریشان کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہیں، لیکن نبی پاکؐ کے صدقے اور شعبہءاُردو ہزارہ یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام کی بدولت میری ہر مشکل آسانی میں بدلتی چلی گئی۔ اپنے تحقیقی مقالے کے لیے میرے پیشِ نظر اُردو کے حوالے سے کئی موضوعات ایسے تھے جن پر کام کیا جاسکتا تھا لیکن کافی سوچ بچار کے بعد میں نے ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' پر کام کرنے کا ارادہ کرلیا اور اس موضوع پر اپنے نگران ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی صاحب کے ساتھ کئی دن تک تبادلۂ خیال کرتا رہا، اس دوران یہ تسلی بھی ہوگئی کہ اس موضوع پر کام کرنے کی خاصی گنجائش موجود ہے۔

حیدر قریشی پر کام کرنے کی کئی وجوہات ہیں اُن میں پہلی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ ایک نیا موضوع ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی دریافت بھی ہے جو گزشتہ چار دہائیوں سے اُردو ادب میں تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی حوالوں سے معیاری کام کررہا ہے۔ قریشی صاحب کافی عرصے سے جرمنی میں مقیم ہیں اور ادبی مراکز سے دور ہونے کے باوجود اُردو ادب کے مرکزی دھارے میں شامل ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اُن کے علمی ادبی مضامین ومقالات پاک و ہند اور یورپی ممالک کے بین الاقوامی رسائل میں طبع ہوتے رہتے ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ اُن کے مجموعی ادبی کام کو نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اُس فکری نظام کو تلاش کیا جائے جس کے تحت یہ تمام ادبی سرگرمیاں وقوع پذیر ہورہی ہیں۔

میں نے موضوع کی منظوری کے بعد جب مواد کی جمع آوری کا کام شروع کیا تو خاصا پریشان ہوگیا کیوں کہ میرے موضوع سے متعلق بیش تر اہم کتابیں انڈیا سے شائع ہوئی تھیں جن تک میری رسائی بوجوہ محال تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ کچھ مواد ایسا تھا جو پاکستان میں شائع ہونے کے باوجود نایاب ہوچکا تھا اور اُن کتابوں کے

نسخے جن حضرات کے پاس تھے وہ بھی پاکستان کے دوراُفتادہ علاقوں کے رہنے والے تھے۔ یہ صورتِ حال خاصی پریشان کُن تھی کیوں کہ ایک عام ملازمت پیشہ آدمی نہ تو اتنا سفر کرسکتا ہے اور نہ اتنا سرمایہ لگانے کی استطاعت رکھتا ہے۔ آخر خدا کا نام لے کر پہلے تو میں نے حیدر قریشی کے اُن احباب کی فہرست بنائی جن سے متعلقہ مواد ملنے کی توقع تھی اور اُس کے بعد بہ ہزار دقت اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔ خدا خدا کرکے رابطے کی صورتیں نکلنا شروع ہوگئیں اور کام قدرے سست روی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ان میں کئی لوگ ایسے تھے جو اصل کتاب کی فوٹو کاپیاں ارسال کرتے رہے اور کچھ نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصل کتابیں اس شرط کے ساتھ بھیج دیں کہ بعد از استفادہ واپس کردی جائیں۔ البتہ چند مہربان دوست ایسے بھی نکل آئے جن کی پہلی اور آخری شرط یہی تھی کہ اُنھی کے پاس جا کر استفادہ کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے، بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے ان کے پاس بھی جانا پڑا۔ مجھے ان انوکھے تجربات اور مراحل سے گزرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ''مردہ بدست زندہ'' کا مطلب کیا ہوتا ہے!

اس رنگا رنگ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی بھی نہیں ہے، خدا کا شکر ہے کہ ایسے احباب آس پاس موجود تھے جن کی وجہ سے مجھے لکھنے پڑھنے کے دوران سہولت رہی، ان میں حیدر قریشی کی دیرینہ دوست ڈاکٹر ارشد خالد صاحب کا ذکر ضروری ہے۔ جناب ارشد صاحب نے اپنے ذاتی خرچ پر مجھے ایسی نایاب کتب ارسال فرمائیں جو اُن کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں اور میرے تحقیقی کام میں حد درجہ کارآمد تھیں۔ مددگار احباب میں ایک اہم نام ڈاکٹر نذر خلیق صاحب کا بھی ہے، ان کی بدولت مجھے اولین مآخذ آسانی سے دستیاب ہوئے جس کی وجہ سے میرے تحقیق مراحل کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ ڈاکٹر نذر خلیق گاہے بگاہے فون کرکے مجھے مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے جس کی وجہ سے میرے کام کی رفتار تیز رہی۔ خدا اُنھیں سلامت رکھے!

جب میں نے مقالے کا باب اول لکھنا شروع کیا تو مجھے فکشن کے حوالے سے کچھ ایسی کتابوں کی ضرورت پڑی جنھیں اگر میں خود تلاش کرتا تو خاصا وقت ضائع ہوجاتا، مشکل کی اس گھڑی میں اپنے پرانے دوست سیّد ماجد شاہ کو آواز دی وہ سارے کام کاج چھوڑ کر میری مطلوبہ کتب کی تلاش میں مصروف ہوگئے اور صرف دس دنوں کے اندر اندر وہ تمام کتب ڈھونڈ کر اسلام آباد سے ٹی سی ایس کرادیں جن کی وجہ سے میرا تحقیقی کام سہولت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ خدا اُنھیں ہمیشہ سکھی رکھے!

کتابوں کی فراہمی کے ضمن میں جناب حیدر قریشی نے بذاتِ خود جس دوستانہ انداز میں میری معاونت کی اُس کی عملی مثالیں کمیاب ہیں۔ جنابِ قریشی نے مجھے اپنی وہ تمام کتابیں جو مجھے کسی اور جگہ سے نہیں مل رہی تھیں ایک ساتھ جرمنی سے روانہ کردیں اور اپنے انڈین کتابوں کے ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) والوں کو ہدایت بھی کردی کہ میری مطلوبہ کتب جلد از جلد پاکستان بھیج دی جائیں۔ غرض تھوڑے عرصے میں مجھے وہ تمام

بنیادی مآخذ دستیاب ہو گئے جن کی وجہ سے میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔خدا حیدر قریشی صاحب کی ہمت اسی طرح جواں رکھے!

مجھے یہ بات لکھتے ہوئے بڑی خوشی کا احساس ہو رہا ہے کہ میرے مقالے کے نگران ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی صاحب نے قدم قدم پر نہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ مسلسل حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔دورانِ تحقیق میرا طریق کار یہ رہا کہ ایک باب مکمل ہونے کے بعد اُن کو یونیورسٹی میں جا کر دے آتا تھا وہ کچھ دن اپنے پاس رکھ کر اور اچھی طرح دیکھ کر اُسی پر اپنی تفصیلی رائے لکھ دیتے اور میں اُنھی کے بتائے ہوئے نکات کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتا تھا۔مقالہ لکھنے کے دوران مجھے جس وقت بھی کوئی اُلجھن پیش آتی میں فوراً اُنھیں فون کر دیتا اور اپنی خودغرضی کی وجہ سے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ اُن کے آرام کا وقت بھی ہو سکتا ہے،لیکن ڈاکٹر الطاف صاحب ہمیشہ فون پر بہت شفقت ، ہمدردی اور تحمل سے میرے مسائل سنتے اور میری اُلجھنوں کو دور کر دیتے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر اس مقالے میں کوئی خوبی ہے تو وہ اُنھی کی وجہ سے ہے اور مقالے میں موجود تمام خامیوں کی ذمہ داری صرف مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ڈاکٹر الطاف صاحب چوں کہ خود جدید تحقیقی اُصولوں سے واقف ہیں لہٰذا اُن کی کوشش تھی کہ میں بھی اپنی تحقیق میں جدّت پیدا کروں، مجھے اس ضمن میں کتنی کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ میرے اساتذہ ہی کر سکیں گے،میں نے بہر حال پوری ایمان داری اور دیانت داری کے ساتھ یہ تحقیقی فریضہ انجام دیا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ اسے جانچ پرکھ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

میرا مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔باب اول میں حیدر قریشی کی تخلیقی نثر کے پانچوں اہم ادبی حوالے مثلاً افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، سفرنامہ نگاری اور یادنگاری پر بات کی گئی ہے۔میرا طریقِ تحقیق یہ رہا ہے کہ اُن تمام بنیادی پہلوؤں کو اس انداز سے زیرِ بحث لایا جائے جس کی مدد سے حیدر قریشی کے فکری اور ادبی نظام کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو جائے۔باب دوم شعری مباحث کا احاطہ کرتا ہے اس میں زیرِ بحث شخصیت کی غزل، آزاد نظم اور ماہیا نگاری کے فنی اور فکری جہتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔باب سوم میں حیدر قریشی کو بحیثیت محقق موضوعِ بحث بنا کر اُن کی تمام تحقیقات کو جدید تحقیقی اُصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم کا تعلق اُن کی تنقیدی خدمات کے ساتھ ہے جس میں معروضی اندازِ نظر اپناتے ہوئے تمام ادبی کام کے فنی و فکری محاسن پر سیر حاصل مباحث اُٹھائے گئے ہیں۔باب پنجم میں حیدر قریشی کے فکری نظام کو بنیاد بنا کر اُن کی مجموعی ادبی خدمات کا محاکمہ پیش کیا ہے اور حاصلِ تحقیق کے اہم نکات اخذ کرنے کی طرف توجہ کی گئی ہے۔

تحقیق ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے جس میں محض ایک حوالہ تلاش کرنے کے لیے بسا اوقات پوری لائبریری چھاننا پڑتی ہے، دورانِ تحقیق میرے ساتھ ایسا کئی بار ہوا اور مجھے بار بار ایبٹ آباد، حویلیاں، ہری پور، مانسہرہ اور بالاکوٹ میں احباب کے ذاتی کتب خانوں کا رخ کرنا پڑتا تھا۔میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ تمام احباب نے وقت بے

وقت مجھے برداشت کیا اور کتابوں سے استفادہ کرنے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔اس کے علاوہ ادارہ فروغِ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)، اکادمی ادبیات پاکستان اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے کتب خانوں سے مقدور بھر استفادہ کیا ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے بھی مسلسل رابطہ رکھا تھا بلکہ شعبۂ اُردو کے اساتذۂ کرام کی پراجیکٹ لائبریریوں سے بھی وقتاً فوقتاً استفادہ کرتا رہا،اس خصوص میں اپنے تمام اساتذۂ کرام ،ڈاکٹر نذر عابد صاحب (صدرِ شعبۂ اُردو)،ڈاکٹر محمد سفیان صفی صاحب،ڈاکٹر محمد رحمان صاحب اور ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی صاحب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔آخر میں اپنے استاذِ گرامی ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کیوں کہ اُنھوں نے ہی مجھے ہزارہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تحریک دلائی تھی۔خدا اُن کے درجات بلند کرے!

میرے گھر کے تمام افراد نے جس طرح میری ہمت بندھائی اور میری مصروفیات کی وجہ سے اپنے تمام کاموں کو موخر رکھا وہ بجائے خود اہم ہے۔گھر کے تمام افراد نے اپنی ضروریات پر میرے مقالے کو جس طرح ترجیح دی وہ اُن سب کی علم دوستی اور محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بچوں میں حدیث بنت عامر، جبرائیل بن عامر، سقراط بن عامر کی مسکراہٹوں نے کام آسان کیا اور زوجہ میمونہ عامر نے ہر مقام پر آسانیاں پیدا کیں، خدا سب کو خوش آباد رکھے!

احباب میں واحد سراج، احمد حسین مجاہد، امان اللہ امان خان، توفیق الرحمٰن، عمر رضا ملک، شہزاد میر، واجد علی، جانِ عالم ،صاحبزادہ جواد الافیضی، فیاض احمد، فاریض خان سواتی، عادل سعید قریشی، محمد طیب صدیقی، شہزاد میر، محمد شعیب آفریدی اور سید ماجد شاہ کی مسلسل تشویق نے میرا حوصلہ بحال رکھا اور مجھے ہر ممکن مدد فراہم کرتے رہے۔

مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ میں آج جس مقام پر بھی ہوں اس میں میرے اُن تمام اساتذہ کی محنت، لگن اور شفقت شاملِ حال رہی ہے جن سے میں کسبِ فیض کرتا آیا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی مجھے اِن سب اساتذہ کا تعاون حاصل رہے گا۔اپنے حوالے سے صرف اتنا کہوں گا:

ے پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں
ہم اور خاک میں مل جائیں گے اُٹھانے سے

عامر سہیل

صدرِ شعبۂ اُردو

ایبٹ آباد پبلک سکول۔مانسہرہ روڈ، ایبٹ آباد

موبائل:0331-5727998 /گھر: 0992- 406571۔۔ برقی رابطہ:aamirsohailaps@hotmail.com

باب اول

حیدر قریشی کی تخلیقی نثر

(۱.۱) افسانہ نگاری

(۱.۱) حیدرقریشی کے افسانے

حیدرقریشی کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا ایک اہم حوالہ افسانہ نگاری ہے۔اُنھوں نے جہاں تحقیق وتنقید، یادنگاری، کالم نگاری، انشائیہ نگاری، سفرنامہ نگاری، خاکہ نگاری اور شاعری میں ممتاز مقام حاصل کیا وہاں افسانوی ادب میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ قیصر تمکین اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> ”یورپ میں موجود اُردو قلم کاروں کی فہرست میں حیدر قریشی کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ویسے تو انہوں نے مختلف اصنافِ ادب میں اپنی محنت وریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت قابلِ لحاظ ہے، بعض بالکل ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصری کہانی کاروں میں ان کا ایک بالکل علیٰحدہ اور نا قابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے۔“ (۱)

ڈاکٹر انور سدید اسی رائے کی توثیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”حیدر قریشی بظاہر ادب کی کئی اصناف میں ایک طویل عرصے سے بڑی پختہ کاری سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اَسرار کی گھتیاں اُن پر باندازِ دگر کھولتی ہے۔“(۲)

حیدرقریشی کے افسانے اردو ادب کے معاصر بین الاقوامی رسائل وجرائد میں طبع ہونے کے علاوہ انٹرنیٹ پر اور کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ تحقیقی مقالے کے اس حصے کا مقصد حیدر قریشی کے افسانوں میں متنوع موضوعات، رجحانات اور تکنیکی تجربات کی نشاندہی اور جستجو ہے۔ نیز اُن عوامل اور محرکات کو تلاش کرنا ہے جو سماجی اور فکری سطح پر افسانہ نگار کو متاثر کرتے رہے ہیں۔

حیدرقریشی کے افسانے اگر سرسری نظر سے بھی دیکھے جائیں تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کی بنیاد بیش تر

خارجی محسوسات پر رکھتے ہیں یعنی جو کچھ وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وہی سب کچھ ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اپنے موضوع کی طرف ان کی پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی پر سطح ہوتی ہے۔اُن کے افسانوں میں حقیقت شناسی اور خیال پرستی کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ان کا یہی امتزاجی اُسلوب فنی اور فکری سطح پر ہر افسانے کو معیاری بناتا ہے۔

حیدرقریشی کی کہانیوں میں دوستانہ ماحول کی کارفرمائی ہے۔تمام کردار ہمارے جانے پہچانے ہیں جن سے ہمارا روزمرہ کا واسطہ پڑتا ہے۔واقعات، مشاہدات اور محسوسات میں فطری جذبوں کا رنگ بھرنا اور قاری کے فکرونظر کو متحرک رکھنا اُن کے افسانوں کا خاصہ ہے۔اُن کی تقریباً ہر کہانی کسی خاص واقعے پر مبنی ہوتی ہے اور کہانی میں موجود نفسیاتی اشارے نئے جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔

حیدرقریشی کے اب تک شائع ہونے والے تمام افسانوں اور تراجم کی تفصیل تاریخی ترتیب کے ساتھ اس طرح ہے:

۱۔ **روشنی کی بشارت**
تجدید، اشاعت گھر، اسلام آباد طبع ۱۹۹۲ء

۲۔ **میں انتظار کرتا ہوں** (افسانوں کا ہندی ترجمہ)
ساہتیہ بھارتی، دہلی، طبع ۱۹۹۶ء

۳۔ **افسانے** (روشنی کی بشارت، قصے کہانیاں)
معیار پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۹ء

۴۔ **ایٹمی جنگ** (تین افسانے، اردو اور ہندی میں۔۔ان افسانوں کا ہندی ترجمہ فاطمہ تبسم نے کیا تھا جو معروف ادیب مشرف عالم ذوقی کی اہلیہ ہیں)
معیار پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۹ء

۵۔ **And I Wait** (منتخب افسانوں کا انگریزی ترجمہ)
(افسانوں کا انگریزی ترجمہ ناظم خلیل نے کیا ہے)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء

۶۔ حیدرقریشی کے دو افسانے ”کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار“ اور ”اپنے وقت سے تھوڑا پہلے“ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں البتہ ان کے کلیات بعنوان ”عمر لاحاصل کا حاصل“ میں موجود ہیں، یہ کلیات جس میں پانچ شعری اور چھے نثری مجموعے شامل ہیں اسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۲۰۰۹ میں شائع کیا تھا۔

حیدرقریشی کے تاحال ستائیس (۲۷) افسانے منظرِ عام پر آئے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

☆ **روشنی کی بشارت (مجموعہ)**

۱۔ میں انتظار کرتا ہوں
۲۔ گلاب شہزادے کی کہانی
۳۔ غریب بادشاہ
۴۔ دُھند کا سفر
۵۔ آپ بیتی
۶۔ روشنی کی بشارت
۷۔ ایک کافر کہانی
۸۔ ماما
۹۔ اندھی روشنی
۱۰۔ حوا کی تلاش
۱۱۔ اپنی تجدید کے کشف کا عذاب
۱۲ بے ترتیب زندگی کے چند بے ترتیب صفحے
۱۳ پتھر ہوتے وجود کا احساس

☆ **قصے کہانیاں**

۱۔ کاکروچ
۲۔ روشن نقطہ
۳۔ دو کہانیوں کی ایک کہانی
۴۔ گھٹن کا احساس
۵۔ بھولے کی پریشانی
۶۔ شناخت
۷۔ انکل انیس
۸۔ ۲۷۵۰ سال بعد
۹۔ بھید
۱۰۔ اعتراف

۱۱۔ بابا جمالی شاہ کا جلال
۱۲۔ مسکراہٹ کا عکس

☆ **دونوں مجموعوں کے بعد کے افسانے**

۱۔ کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار
۲۔ اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

اب یہ تمام افسانے حیدر قریشی کے کلیات بعنوان'' عمرِ لاحاصل کا حاصل''میں شامل ہیں۔ یہ کلیات انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے اور تمام افسانوں کو انٹرنیٹ پر بلاگ کی صورت میں عام کر دیا گیا ہے۔ جن کا مطالعہ ان ویب گاہوں پر ممکن ہے:

۱۔ http://my27books.blogspot.de/
۲۔ http://kuliat-library.blogspot.de/

حیدر قریشی کے افسانے جدید طرزِ احساس، منفرد اُسلوبِ نگارش اور دل کش فنی وفکری اقدار کی بدولت جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں خالص تخیل کے بجائے حقیقی دنیا کے تجربات ومشاہدات اور زندگی کے اصل نشیب وفراز کا بیانیہ ملتا ہے۔ واقعات کی بُنت اور کرداروں کی نفسیاتی سطحوں کو اس خاص قرینے سے پیش کرتے ہیں کہ حقائق کی فتح یقینی ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہر قلم کار کی تصنیف اور تخلیقات پر اس کی اُفتادِ طبع اور فکر کا گہرا اثر ملتا ہے بالکل اسی طرح حیدر قریشی کے تقریباً تمام افسانے اُن کی اپنی طبیعت، رجحانات، خیالات اور افکار و نظریات کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب وتمدن سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں خالص مشرقی وضع داری نہایت خوش اُسلوبی سے اپنی جگہ بناتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عملی مسائل پر بات کرنا پسند کرتے ہیں اور زندگی کے عملی اور نزاعی مسائل پر غیر شخصی انداز سے تنقید کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے لکھا تھا:

''ساری دنیا ساری کائنات کا تجربہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نکتے سے تو شروع کی جا سکتی ہے۔'' (۳)

حیدر قریشی کا فکری دھارا اس ایک نکتے کو بآسانی ڈھونڈ نکالتا ہے اور یہ نکتہ پھیلتے پھیلتے کہانی کی وحدت میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی کئی رنگوں میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ کہیں اظہار کا رنگ تجرید، علامت، تصوف اور روحانیت کا لبادہ اوڑھے نظر آتا ہے تو کہیں رومان پرور فضا کسی نشاط آفریں جذبے کو جلا بخشتی ہے۔ کسی مقام پر ایٹمی جنگ کا منظر نامہ فکر ونظر کو متحرک کرتا دکھائی دیتا ہے، غرض اُنھوں نے اپنے عہد کے پُر پیچ عوامل اور رجحانات سے افسانوی ادب میں نئے چراغ روشن کیے ہیں۔

(الف) حیدر قریشی کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

حیدرقریشی کے افسانوں میں فکری موضوعات کا تنوع وسعت کا حامل ہے۔اُن کے افسانوں میں انسان اور سماجیات کے حوالے سے خیال انگیز رویے اور کیفیات اُبھرتی نظر آتی ہیں۔اِن اہم موضوعات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) تصوّف اور روحانیت کے عناصر

حیدرقریشی کے افسانوں کا غالب رجحان تصوف اور روحانیت پر مبنی ہے۔اس نوع کے افسانوں میں جہاں عرفان و شعور کے در وا ہوتے ہیں وہاں نفسیاتی عوامل کی روشنی میں ذہنی کیفیات کا فہم بھی حاصل ہوتا ہے۔مثلاً ان کے افسانے''ایک کافر کہانی'' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

صوفی ، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ ، منزل اور سفر ہو جائیں (۴)

اور اب پہلی سطر ملاحظہ ہو:

''بڑی عجیب اذیت ہے، میں نماز پڑھتا ہوں، رکوع تک
نماز ٹھیک رہتی ہے لیکن سجدے میں کہیں اور پہنچ جاتا ہوں
'' (۵)

اس افسانے کی داخلی فضا روحانی خوشبو سے مزین ہے اور قاری دورانِ مطالعہ خود کو اس وجدانی ماحول میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔افسانہ نگار نے کچھ مقامات پر ابراہیم بن ادھمؒ ، رابعہ بصریؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ملائکِ آسمانی اور آخر میں سرورِ کونینؐ کا تذکرہ شامل کیا ہے،لیکن کمال یہ ہے کہ ہر ہستی کا ذکرِ خیر ایک خاص معنوی تناظر کے ساتھ اصل موضوع کا حصہ بنتا ہے اور دورانِ مطالعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صاحبِ حال صوفی اپنے باطن میں وحدت الوجود کی تپش محسوس کر رہا ہے اور دیگر صوفیائے کرام کی تعلیمات سے تشفی کا متلاشی ہے۔وحدت الوجود کی تاویل میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول افسانے کی مجموعی فضا کو سمجھنے کے لیے کلید فراہم کرتا ہے:

'' جو شخص حق میں محو ہو جاتا ہے اور جو کچھ ہے حق ہے،
اگر ایسی صورت میں وہ سب کچھ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔''

(۶)

اصل میں حیدرقریشی کا فکری نظام روحانیت سے خاص علاقہ رکھتا ہے اور اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے فکری مسلک کو فکشن میں اس طرح ڈھال لیں کہ فنی لوازم کا حق ادا ہو جائے اور جو کچھ ان کی آنکھ نے دیکھا اور محسوس کیا ہے اُس راحتِ قلبی میں قاری کو بھی شریک کر لیا جائے۔

اُن کا ایک اور افسانہ**''روشنی کی بشارت''**صوفیانہ تجربے پر مبنی ہے۔اس میں صاحبِ حال کا مکاشفہ دل پذیر پیرائے میں ہمارے سامنے آتا ہے۔خدا کی ذات پر کامل ایمان اور کائنات کے ذرّے ذرّے میں اُس کا عکس و جمال دیکھنے والا شخص ہی ایسے مشاہدات کا ترجمان اور مکلّف ہوسکتا ہے۔

''روشنی کی بشارت'' میں نطشے کی ایک تمثیل درج ہے اور اس تمثیل کو متعارف کرانے کا بڑا مقصد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نطشے نے یورپ میں خدا کا انکار کر کے جو کفر پھیلایا تھا حیدرقریشی نے اُسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے وجود باری تعالیٰ کو کشفی اور وجدانی واردات کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ماہنامہ**''شاعر''** کے مدیر افتخار امام صدیقی نے حیدرقریشی سے اپنے انٹرویو کے دوران دو ایسے سوال پوچھے جن کا براہِ راست تعلق خدا اور متصوفانہ مسائل کے ساتھ ہے،سوال و جواب ملاحظہ ہوں:

'' سوال: کیا آپ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو اپنے فن پاروں میں سموتے ہیں؟
جواب: میرے ہاں تو تجربے اور مشاہدے ہی باطن میں رچ بس کر فن پارے بنتے ہیں۔
سوال: کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟
جواب: بہت گہرا یقین اور اس یقین کے کئی ذاتی
تجربے بھی ہیں''(۷)

''روشنی کی بشارت'' میں یہ ذاتی تجربہ موجود ہے۔افسانہ نگار نے اُس روحانی پیچیدگی کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے کہ نورِ خداوندی ہمیشہ اپنے زمانے سے آگے چلتا ہے اور وہ صفرِ مدت لازماً آئے گی جب نورِ خداوندی اور مخلوق کا باہمی فاصلہ ختم ہو جائے گا اور یہی ادراک کی کامل منزل ہوگی۔

اُردو ادب کے معروف نقاد اور افسانہ نگار دیویندر اسر رقمطراز ہیں :

'' وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جنھیں ہر چیز
صاف صاف دکھائی دیتی ہے جن کے دل میں کبھی کوئی
شک پیدا نہیں ہوتا جن کے پاس ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک
جواب موجود ہے''(۸)

جوگندر پال کا کہنا ہے:

'' حیدرقریشی کے یہاں ایمان کا کراماتی عمل کلیدی
حیثیت کا حامل ہے۔ایمان زندہ رہے تو معجزوں کا رونما
ہوتے چلے جانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔حیدرقریشی
کے ایمان کی توانائی اسے انہدام کی ہیبت سے محفوظ رکھتی

ہے''(۹)

حیدر قریشی کے تین اور افسانوں میں روحانی عناصر کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے ان میں ''روشن نقطہ'' ، '' دو کہانیوں کی ایک کہانی '' اور ''بابا جمالی شاہ کا جلال'' شامل ہیں۔ روحانی کیفیات کے حامل یہ افسانے مادّیت سے بھری دنیا کو قلبی راحت مہیا کرتے ہیں۔ اِن افسانوں کا پس منظری مطالعہ کچھ یوں ہے کہ مادّی دوڑ میں مبتلا انسان کی روح پر کثافت کا غلاف اس قدر دبیز ہو چکا ہے کہ انسان کی اصل شناخت مشکل ہوتی جارہی ہے۔

(۲) فلسفۂ توحید

حیدر قریشی کے کئی افسانوں میں مسرت کے ازلی وابدی مرکز یعنی فلسفۂ توحید پر گفتگو ملتی ہے۔ افسانہ **''روشن نقطہ''** میں ضمنی موضوعات پر بات کرتے ہوئے غیر محسوس طور پر جب فلسفۂ توحید کا ذکر چل نکلتا ہے تو افسانہ نگار اس حوالے سے درج ذیل نکات اَخذ کرتا ہے:

''
(ا) جان بوجھ کر بھٹکنے والے لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں۔
(ب) محبت خود محبوب اور محبّ کے درمیان پردے کا نام ہے۔
(ج) پردہ ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اگر یکتائی کے سفر درست طور پر کیے جائیں تو سارے پردے چاک ہوجاتے ہیں۔
(د) علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھادیا ہے۔
(ر) الف تو بہت زیادہ ہے۔ بات ایک نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔''(۱۰)

حیدر قریشی نے توحید کے فلسفیانہ اور روحانی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ تمام نکات خاص قرینے سے پیش کیے گئے ہیں اور کسی مقام پر سپاٹ پن کا احساس نہیں ہوتا۔ فکر و نظر کی ہم آہنگی اور توازن اس افسانے کے نمایاں اوصاف ہیں۔

(۳) قومی سوچ کے دھارے

حیدر قریشی نے اگرچہ اس موضوع پر کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن قومی سوچ کا مسئلہ اُن کے نظامِ فکر کا لازمی حصّہ ہے۔ اُن کے دو افسانے **'' دُھند کا سفر ''** اور **'' اندھی روشنی ''** میں قومی سوچ کے حوالے سے واضح اشارے ملتے ہیں۔ افسانہ نگار نے ایسے لوگوں کو بے نقاب کیا ہے جو ہر وقت اپنی قوم کے سیاست دانوں اور دفتری عہدے داروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ایک روز اتفاق سے افسانہ نگار کو ریل کے سفر میں ایسے ہی لوگوں سے واسطہ پڑ گیا جو حکومت پر گالیوں کی بوچھاڑ کررہے تھے۔

'' گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔ گالیاں ریلوے کے

مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئر مین تک
پہنچ چکی ہیں۔ پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آجاتے
ہیں'' (۱۱)

افسانہ نگار کے نزدیک یہ ناپسندیدہ عمل ہے اسی لیے وہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا ہے۔ **''اندھی روشنی''** میں اس بات پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ آخر اپنے ملک میں گندم کے وافر ذخائر کی موجودگی میں دوست ملک سے گندم کیوں خریدی جارہی ہے، یہ ''دوست ملک'' محض ذاتی اغراض کی خاطر گندم کی خرید وفروخت میں ملوث ہیں۔

(۴) تجزیات اور اُصول سازی

حیدر قریشی کا فکری نظام زندگی کے گہرے اور پیچیدہ تجربات سے جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں تجربات اور مشاہدات کی ایک بھرپور دنیا آباد ہے، اس دنیا سے وہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں اُسے اصولوں کی صورت میں تخلیق نثر کا حصہ بناتے چلے جاتے ہیں، مثلاً :

''مرد ہمیشہ عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں
کی ذمہ داری بھی عورت پر ہی ڈال دیتا ہے اور عورت
......وہ اپنی سادگی کے باعث ہر نا کردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ
تسلیم کرلیتی ہے۔ آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو
رہا ہے'' (۱۲)

افسانہ **''اندھی روشنی''** کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:

''سچ کا کوئی لباس نہیں ہوتا اسی لیے ننگا نظر آرہا ہے۔''
(۱۳)

اُصول سازی کے حوالے سے یہ جملہ بھی اہمیت کا حامل ہے:

''جان بوجھ کر بھٹکنے والے لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں۔''
(۱۴)

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

''من حیث القوم ہم مردہ پرست ہیں''
(۱۵)

حیدر قریشی نے مختصر افسانے کے تمام اہم امکانات کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ افسانہ اپنے

تمام تر اجتماعی، تہذیبی اور فنی مضمرات کے باعث ایک ذاتی صحیفہء اظہار بھی ہے۔
ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں :

'' حیدر قریشی کے افسانے میں تجربے کا نقش ہے ،
مشاہدے کی باریکی ہے، زندگی کے فلسفے کی جھلک ہے
اور اشارات وکنایات ہیں ۔ساتھ ہی تفہیم کی فکر نمایاں
ہے'' (۱۶)

حیدر قریشی زندگی کے بظاہر عمومی رویوں سے خصوصی نتائج اخذ کرتے ہیں ۔ یہ نتائج یا اصول پائیدار ہونے کے علاوہ اپنا ایک وسیع اطلاقی نظام بھی رکھتے ہیں۔

(۵) منفی سماجی رویّوں کی عکاسی

حیدر قریشی کے افسانوں میں جہاں صوفیانہ اور روحانی عقائد ونظریات پر مشتمل موضوعات نظر آتے ہیں وہاں زندگی کے ٹھوس مسائل پر بھی اُن کے افسانے ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرے کی سفلی قوتوں کو جاگر کرنے کے لیے جو کچھ لکھا اُسے پڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔
پروفیسر جیلانی کامران نے لکھا تھا:

''سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن لیا
ہے'' (۱۷)

حیدر قریشی کے افسانے اس فکر کی تائید کرتے ہیں ؛خصوصاً اُن کے دو افسانے **''انکل اُنیس''** اور **''بھولے کی پریشانی''** منفی سماجی رویوں کی عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔

''اُنکل انیس'' سماج کے ایسے دُکھتے رویّوں کو موضوع بناتا ہے جو عام ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، اگر کسی ادیب کا تخلیقی ذہن فعال ہو تو نئے سماجی رشتوں سے ادب کے نئے افق اور فکر کے نئے زاویے تلاش کیے جاسکتے ہیں؛''انکل انیس'' ایسے ہی لمحوں کی داستان ہے جب اَخلاقی بحران سماجی عملیت کو متاثر کر کے فرد کے مثبت رویوں میں اضمحلال کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔
انکل اُنیس کا کردار سفلی صفات کا حامل ہے، ایک طرف تو وہ اپنے دوست انور کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کیے ہوئے ہے اور دوسری جانب خواتین کے سماجی حقوق کے حوالے سے مہم بھی چلا رہا ہے، اس مہم میں کچھ اور خواتین اس کے ہمراہ ہیں جو شہر شہر گھوم کر حقوقِ نسواں کا پرچار کرتی پھر رہی ہیں، یوں انکل انیس معزز شہری کے روپ میں اپنی سفلی کارروائیوں میں مصروف رہتا ہے۔
افسانہ نگار اس تمام صورتِ حال کا تجزیہ اِن الفاظ میں کرتا ہے :

'' ہماری دنیا، سارے معاشرے، سارے فرقے، سب
کے نزدیک مجرم وہی ہے جو پکڑا جائے۔ جو مہارت کے
ساتھ جی بھر کر گناہ کرے، جرائم کا مرتکب ہو لیکن پکڑا نہ
جائے وہ متقی، پرہیزگار اور مومن ہے'' (۱۸)

انکل انیس اور اس کے ساتھ شامل خواتین شہر شہر گھوم کر عوام وخواص میں یہ پیغام عام کر رہے ہیں کہ مرد اور عورت کی باہمی تفریق ختم کر کے صرف انسان کی بات کی جائے تا کہ انسانیت کو فروغ حاصل ہو۔ جب کہ افسانہ نگار کا موقف یہ ہے :

''اگر یہ بات ہے تو پھر انسان کے زمرے میں صرف مرد
اور عورت کو ہی نہ سمجھیں مخنثوں کو بھی اس میں شامل
کریں۔ انسانی برادری میں سب سے زیادہ تضحیک، ظلم
اور استحصال کا شکار تو مخنث طبقہ ہے'' (۱۹)

یہ مکالمہ حقیقت کا دوسرا رُخ دکھاتا ہے کہ ہم نے انسان کی تعریف اتنی محدود کر دی ہے کہ اُس میں مخنث کو شامل کرنا بدتہذیبی خیال کیا جاتا ہے۔ معاشرہ خواہ مشرقی ہو یا مغربی وہ اصلاً عدم مساوات پر اُستوار ہوتا ہے، یہی عدم مساوات سماجی انتشار پیدا کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے معاشرے کے اس منافقانہ رویے کو بے نقاب کر کے اصل تلخ حقائق سامنے لائے ہیں۔
جہاں تک حقوق نسواں کا تعلق ہے اُس ضمن میں افسانہ نگار نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''خواتین کے لیے اتنے حقوق مانگیئے جتنے آپ اپنی ماں،
بہن، بیوی اور بیٹی کو دے سکیں'' (۲۰)

افسانہ نگار نے اس کہانی میں انسانی کردار کے دوغلے پن کو سامنے لایا ہے اور اُن رویوں پر کاری ضرب لگائی ہے جو منافقت پر مبنی ہیں۔ ہمارے آس پاس کتنے ہی کردار نیکی، خیر، شرافت، انسان دوستی اور دانش وری کا بہروپ اپنائے خود فریبی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ حیدر قریشی نے یہاں مصلحت کوشی کے بجائے حقائق نگاری کو ترجیح دی اور افسانوی ادب کے وسیع امکانات کو عملاً سچ کر دکھایا۔
شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے:

''بڑی صنف وہ ہے جو ہمہ وقت تبدیلیوں کی متحمل ہو سکے۔'' (۲۱)

مختصر اُردو افسانے میں یہ صفات موجود ہیں لیکن اُن کی تکمیل اور حصول کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ لکھنے والا بذاتِ خود اعلیٰ تخلیقی اور تخیلی وژن کا مالک ہو۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی رقمطراز ہیں :

''حیدر قریشی سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر رونما ہونے
والے انقلاب کو بھی دیکھ رہیں ....اپنے افسانوں میں
انسانی زندگی کے بیش تر مظاہر کو اپنے اندر جذب کرتے
ہیں، اسی لیے اُن کے یہاں زمینی خوشبو، عصری تازگی،
نئے تخلیقی روّیے اور برتاؤ کی توانائی ملتی ہے'' (۲۲)

اصل میں برتاؤ کی یہی توانائی کہانی کو تہہ در تہہ بناتی ہے۔ تخلیقی عمل اور کہانی پن کی ایک اپنی مابعدالطبیعیات ہوتی ہے جو سماجیاتی اقدار کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اُنھیں تجزیاتی عمل سے گزارتی ہے اور پھر وہ لمحہ آجاتا ہے جہاں حقائق منکشف ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔

منفی سماجی رویوں کی دوسری نمائندہ کہانی **''بھولے کی پریشانی''** ہے۔ اس کہانی میں گاؤں کا ایک تہتر سالہ بوڑھا چوہدری بیوی کے مرنے کے بعد اپنے علاقے کی جوان عورت سے دوسری شادی کرلیتا ہے۔ یہ عورت طلاق یافتہ ہے اور گاؤں سے بھاگ بھی چکی ہے۔ چوہدری نے اپنی مردانگی چمکانے کی خاطر شادی تو کرلی مگر اُسے مطمئن کرنا اُس کے لیے ممکن نہ تھا۔ آخر وہ مختلف حیلے بہانوں سے اپنے ملازم کو (جس کا نام بھولا ہے) بیوی کے کمرے میں بھیج دیتا ہے۔ چوہدری کی جوان بیوی بھولے کو گناہ پر مجبور کرنے کے بڑے جتن کرتی ہے لیکن بھولا بھاگ جاتا ہے۔ جب وہ دوبارہ کسی کام سے مالکن کے کمرے میں جاتا ہے تو چوہدری کی بیوی بھولے کو نمک حرام ہونے کا طعنہ دیتی ہے اور اُدھر بچارہ بھولا دل ہی دل میں سوچ رہا ہوتا ہے:

''بتایئے بھلا میں نے نمک حرامی کی ہے خدا کی قسم میں نمک حرام نہیں ہوں...
اور وہ بیڈروم کی کنڈی باہر سے کس نے لگائی تھی؟ رب جانے کیا چکر ہے'' (۲۳)

یہ کہانی بہت انوکھی ہے اور طنز کی کاٹ اتنی گہری اور پہلودار ہے کہ مزید تشریح اور توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایسے موضوعات کو فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے افسانہ نگار ہونے کے علاوہ نفسیات کا پختہ شعور رکھنا بھی ضروری ہے۔ سماج کے منفی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے نفسیاتی تکنیک، احساس، تجربہ اور مشاہدہ مل کر تخلیقی عمل کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں زندگی کے جیتے جاگتے مسائل کا گہرا شعور اور ادراک ملتا ہے۔ انسان کا ہر نظامِ فکر چاہے وہ فلسفہ وحکمت ہو یا مذہب یا پھر فنونِ لطیفہ کے مظاہر، یہ تمام شعبے سماجی اور اقتصادی ماحول سے پوری طرح وابستہ ہوتے ہیں لیکن ادیب کا تخیل فکر واحساس کے اُن مدارج تک رسائی حاصل کرلیتا ہے جہاں دیگر مظاہرِ انسانی کے پر جلنے لگتے ہیں۔ گوئٹے نے جو بات ایکرمین (EKERMANN) کو ۱۱/ جون ۱۸۲۵ء میں کہی تھی۔ اُس کی صداقت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی گی اُس نے کہا تھا:

''ادبی تخلیق اپنے ماحول سے آگاہی اور اُس کے اظہار کی طاقت کا نام ہے۔'' (۲۴)

حیدر قریشی کا مشاہدہ اور مطالعہ خاصا گہرا ہے اُنھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور اپنی کہانیوں میں برتا ہے۔ عصری معنویت اُن کو اتنی عزیز ہے کہ اُس کا عکس **''بھولے کی پریشانی''** میں تو نظر آتا ہی ہے دوسرے افسانوں میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

(۶) ایٹمی جنگ کا مسئلہ

حیدر قریشی نے جہاں اپنے قُرب و جوار کے اہم سماجی موضوعات پر افسانے تخلیق کیے وہاں عالمی مسائل کے بدلتے منظرنامے بھی اُن کی کہانیوں کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ ایٹمی جنگ ایک ایسا موضوع ہے جس پر دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اُردو ادب میں اس موضوع کو اگرچہ کم برتا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ موضوع اجنبی نہیں ہے۔

حیدر قریشی نے اس عالمی مسئلے پر تین یادگار افسانے تحریر کیے جن کے موضوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ حوّا کی تلاش (مشمولہ: ''روشنی کی بشارت'')
۲۔ گلاب شہزادے کی کہانی (مشمولہ: ''روشنی کی بشارت'')
۳۔ کاکروچ (مشمولہ: ''قصے کہانیاں'')

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان افسانوں کی پہلی اشاعت کا کھوج لگایا ہے۔ اُن کی تحقیق کے مطابق یہ اشاعتی سلسلہ اس طرح عمل میں آیا:

''پہلا افسانہ ''حوا کی تلاش'' سہ ماہی ''اوراق'' (لاہور)
کے فروری، مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا،
دوسرا افسانہ ''گلاب شہزادے کی کہانی ''اوراق'' ہی کے
اپریل، مئی ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ تیسرا
افسانہ ''کاکروچ'' ماہنامہ ''صریر'' (کراچی، فروری
۱۹۹۲ء) سائنسی ممکنات کے بیان پر مشتمل ہے۔'' (۲۵)

اُردو ادب میں تقسیم ہند کے فسادات، عالمی جنگوں اور تحریکوں کے حوالے سے افسانے اور ناول لکھنے کی روایت خاصی زرخیز ہے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے اثرات بھی فکشن پر صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ معروف ادبی رسالہ ''نیا دور'' کا ''فسادات نمبر'' اور اس حوالے سے دیگر رسالوں کے خاص نمبروں کا مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُردو ادب علاقائی، ملکی اور عالمی مسائل سے کبھی غافل نہیں رہا اور ہر عہد میں اپنا مثبت کردار

ادا کرتا آیا ہے۔

حیدر قریشی کے جنگ نامے **''حوا کی تلاش''** ، ''گلاب شہزادے **کی کہانی''** اور'' **کاکروچ''** اس تاریخی روایت کا تسلسل ہیں۔اُن کے فکری نظام میں تمام انسانی برادری کے مشترکہ مسائل کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

عالمی جنگ کے تناظر میں حیدر قریشی کا پہلا افسانہ **''حوا کی تلاش''** سامنے آتا ہے جس میں ایٹمی جنگ کی خون ریزی اور بربریت کو موضوع بنا کر یہ منظر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر ایٹمی جنگ کے بعد کرہِ ارض سے تمام بنی نوع انسان کا صفایا ہو گیا تو دنیا میں نئے انسان کی شروعات کیسے ہوگی؟ افسانے کا ماحول خاصا پیچیدہ ہے۔فضا آفرینی کا تاثر گہرا کرنے کی خاطر قرآنی آیات وتلمیحات،انجیلی حکایات، ماضی کے استعارے اور عبرت انگیز مناظر کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قرآنی آیات درج کر کے اُن کی تاویل وتشریح کی جارہی ہے، بہر حال یہ اُن کا ادبی حق ہے کہ وہ افسانے کی بُنت میں کون سا طریقِ کار زیادہ موزوں خیال کرتے ہیں۔

یہ افسانہ پُر اثر ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو کس طرح روئے زمین سے انسان کے تمام آدرشوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔''حوا کی تلاش'' صیغہ واحد متکلم میں لکھا گیا ہے اور آغاز میں یہ طبع زاد شعر دیا گیا ہے:

ے مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے(۲۶)

کہانی کا مرکزی کردار ایٹمی جنگ کے بعد زندہ بچ جاتا ہے اور وہ حیرت واستعجاب کے عالم میں ایک نامعلوم سمت میں چلتا جارہا ہے۔راستے میں ایک جگہ اُسے یہ دل خراش منظر نظر آیا اور وہ رُک گیا:

''میں نے اپنے سامنے بکھرے ہوئے ایٹم بم کا شکار
ہونے والے منظر کو دیکھا اور مجھے اصحابِ فیل کی خوش
قسمتی پر رشک آنے لگا جو صرف کھائے ہوئے بھُو سے کی
مانند کر دیے گئے تھے۔'' (۲۷)

افسانہ نگار کے نزدیک اس جنگ کی ذمہ داری مشرق ومغرب دونوں پر عاید ہوتی ہے۔اگر چہ جنگ کے پس منظر میں

''تیل کی دولت'' چمک رہی تھی جسے بقول افسانہ نگار:

''دونوں بڑی قوتیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں''(۲۸)

آخرش دُنیا نے ''ایٹم برائے اَمن'' کا عملی نمونہ دیکھ لیا۔اَب ہر طرف اَمن ہی اَمن ہے،سکون ہی سکون ہے۔ ایٹمی تباہی نے مزید ایٹمی جنگوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے۔کہانی کا کردار کہتا ہے:

''ایٹمی جنگ نے آدم کی نسل کو صفحہءِ ہستی سے نیست و
نابود کر دیا تھا، اور اب ابنِ آدم ہونے کے ناطے اس
وقت مجھے اپنا سب سے پہلا فریضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ
جس طرح بھی ممکن ہو آدم کی نسل کو اس دھرتی پر قائم رکھا
جائے ۔شاید میں اس نئے عہد کا آدم ہوں۔مگر حوّا
......؟'' (۲۹)

اس نئی حوا کو پانے کے لیے ''میں'' کا سفر جاری ہے۔''میں'' کا کردار پورے افسانے پر حاوی ہے۔افسانے میں ایک کردار ''روشنی'' کا بھی ہے۔ یہ روشنی کائنات کی ازلی وابدی سچائی ہے اور ہر لمحہ سلبی قوتوں کو کچل کر ایجابی قوتوں کی پاسداری کرتی ہے۔ یہ وہی روشنی ہے جو آسمانی صحائف کی صورت میں ہدایت اور عبرت کا سامان مہیا کرتی ہے۔

کہانی کے مرکزی کردار ''میں'' کی تلاش بارآور ثابت ہوتی ہے اور بالآخر اُسے حوا مل جاتی ہے۔دونوں آپس میں لپٹ جاتے ہیں۔ایسے موقع پر حیدر قریشی کا اپنا شعر اس منظر نامے کی بہتر ترجمانی کرتا ہے:

ے قسمتوں نے ملا دیا ورنہ
تم کہیں کے تھے،ہم کہاں کے تھے (۳۰)

یہ افسانہ رجائی نقطہءِ نظر کی عکاسی کرتا ہے کہ اگر جنگ نے دنیا کا خاتمہ کر دیا تو آباد کاری کا عمل دوبارہ شروع ہو جائے گا۔اُمید کی اس کیفیت میں دکھ اور اُداسی کی کیفیات بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔''حوا کی تلاش'' میں افسانہ نگار کا انفرادی شعور اجتماعی شعور سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔

نجمہ رحمان نے لکھا ہے :

'' تخلیقات محض فرد کی تمنائیں اور خواب نہیں ہوتے بلکہ معاشرے
اور ماحول کی آرزوئیں بھی ہوتی ہیں جس کے عناصر سے مل کر خود
اُس کی شخصیت تشکیل پاتی ہیں''(۳۱)

افسانہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایٹمی جنگ میں مشرق اور مغرب دونوں برابر کے شریک ہیں۔تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔اب وہ وقت آچکا ہے جب مشرق ومغرب کو اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپس میں مل بیٹھنا ہوگا۔اور دنیا میں حقیقی امن قائم کرنے کی خاطر دونوں کو گلے ملنا پڑے گا۔

حیدر قریشی کا دوسرا افسانہ ''**گلاب شہزادے کی کہانی**'' ایٹمی جنگ کے نئے رخ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ داستانوی رنگ میں لکھا ہوا افسانہ ہے۔ جو اصل کہانی کو چار درویشوں کی زبانی آگے بڑھاتا ہے۔ افسانے میں مرکزی خیال کے متوازی کچھ ذیلی موضوعات بھی پیش کیے گئے ہیں، لیکن کہانی کی مرکزیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اس افسانے میں ہر درویش اپنی رام کہانی سناتا ہے اور تینوں درویش اپنی کہانیاں سنانے کے بعد دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

پہلا درویش جو اُن کی موت کا ذمہ دار ہے اور اپنی مکاری اور حکمت عملی کی وجہ سے خود کو بچائے رکھتا ہے اُن کے مرنے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اب اس صحرائی علاقے کے تیل کی دولت کا میں تنہا
مالک ہوں۔ ایٹمی جنگ میں جتنے بھی لوگ بچ گئے ہوں
گے۔ سب میری رعایا ہیں......اور میں اس نئے عہد کا
حکمران.........عظیم حکمران۔'' (۳۲)

زندہ بچ جانے والا درویش لق و دق صحرا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ اور پیاس کی شدت میں ادھر اُدھر خوار ہونے کے بعد ایک آبی چشمے پر پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔ یہ مقامِ عبرت ہے کیونکہ بقول افسانہ نگار:

''اُس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔''(۳۳)

افسانے کا مرکزی فکری موڑ اس جملے میں بیان ہوا ہے:

''گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی مگر نہ کوئی اُسے
سنانے والا تھا اور نہ سننے والا!''(۳۴)

اس افسانے میں ایک بار پھر اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ عرب ممالک کے تیل پر نظر رکھنے والے نادان دشمن اس حوالے سے خسارے میں رہیں گے کہ وہ ایٹم کی قوت سے تمام دنیا کو فنا کرنے کے بعد بالآخر خود بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اور روئے زمین پر اُن کی حالت زار پر رونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس کہانی کا انجام دیکھنے کے بعد قاری کی نظر پھر اُس شعر پر جا اٹکتی ہے جس سے افسانے کا آغاز ہوا تھا:

ے ہوا شکار جب اُس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا (۳۵)

ڈاکٹر ظفر قدوائی محولہ بالا شعر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حقیقت میں یہی شعر ان چاروں مناظر کی روح اور
اس افسانے کا مرکزی خیال ہے...... جسے مصنف نے

علامتوں، تلازموں، استعاروں اور تشبیہوں کے ملبوس
میں سجا کر پیش کیا ہے۔'' (۳۶)

حیدر قریشی نے یہی موضوع ''حوا کی تلاش'' میں برتا ہے، لیکن اُس کا انجام رجائیت پر کیا ہے۔'' گلاب شہزادے کی کہانی'' میں رجائیت کے برعکس مایوسی اور محرومی کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ قاری سکتے کی کیفیت میں آ جاتا ہے۔

سلیم انصاری کہتے ہیں:

''حیدر قریشی ایک فعال اور Dynamic تخلیق کار ہیں۔
یہی سبب ہے کہ اُن کی تخلیقات میں اُسلوب اور پیرائیہ
اظہار مسلسل ارتقاء پذیر رہتا ہے جو اُن کی تخلیقی
توانائیوں کی ضمانت ہے۔'' (۳۷)

حیدر قریشی نے موضوع کی نوعیت اور ضرورت کے تحت اپنا اُسلوب بدلا ہے جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر افسانے پڑھنے کے باوجود یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ بحیثیت افسانہ نگار اُن کی کامیابی کی علامت ہے۔ اُن کا فن ایک مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے۔ اُن کے تجزیات اور مشاہدات تہذیبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ افسانے کا حصہ بنتے ہیں۔

حیدر قریشی نے ایٹمی جنگ کے حوالے سے تیسری اور آخری کہانی کا نام'' **کاکروچ**'' رکھا ہے۔ اس افسانے میں کہانی کار نے یہ مسئلہ زیرِ بحث لایا کہ اگر ایٹمی جنگ کے بعد کچھ لوگ زندہ بچ گئے تو دنیا کا نقشہ کیسا ہوگا؟ کہانی کے آغاز میں ایک دوست دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے بتاتا ہے:

''اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے
ہوتا ہے۔ میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر
بچ جاتے ہیں۔'' (۳۸)

یہی زندہ بچ جانے والا جوڑا کہانی آگے بڑھاتا ہے۔ خاندان میں پیدا ہونے والے بچوں کو اُس جدید عہد کے بارے میں بتایا جاتا ہے، جس میں لوگ ریڈیو، ٹی وی، ٹیلی فون، فیکس اور کمپیوٹر استعمال کر رہے تھے۔ بچے ان باتوں کو اس انداز سے سنتے ہیں گویا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ افسانہ اُس وقت ڈرامائی موڑ اختیار کر لیتا ہے جب ایک دوست (نصیر حبیب) یہ سوال پوچھتا ہے:

''ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔
اس لیے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر بچا رہے ہیں۔'' (۳۹)

کہانی کار احباب سے صلاح مشورے کے بعد کاکروچ کے بارے میں سوچتا ہے کہ صرف یہی ایک ایسا جان دار

ہے جس پر تابکاری اثرات مرتب نہیں ہوتے کیونکہ اُس کے جسم میں خون کی ایک الگ تھیلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے نیوکلیائی زہر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ کہانی کار یہ بات کہہ چکنے کے بعد نتیجہ اخذ کرتا ہے :

''دوستوں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں
سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں! '' (۴۰)

اس کہانی میں قاری کی دل چسپی اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب نصیر حبیب زندگی کے تغیر و تبدل پر اپنے معلوماتی ترکش کا ایک اور تیر چلانے لگتا ہے، رفتہ رفتہ پھر وجود کی خالص سائنسی بحث انسانی رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں افسانہ نگار کا فن ایک جست بھر کر تفکر و تعقل کی راہ سے ہوتا ہوا تخلیقی وحدت میں مجسم ہو جاتا ہے۔
حیدر قریشی کے افسانوں میں خالص سائنسی نظریات کی شمولیت جدید طرزِ اُسلوب کی دین ہے:
ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

'' ادب میں سائنسی نظر اور روش علمی نے نئے جہات
فراہم کیے ہیں اور زندگی کو فکرِ ایجادات اور تنظیم انسانی کا
راستہ دکھایا ہے۔'' (۴۱)

حیدر قریشی نے ثابت کیا ہے کہ عصری آگہی کے بڑے بڑے مسائل و عوارض کو لفظی کفایت اور اختصار کی صورت افسانے کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

☆ افسانوں کے متفرق موضوعات

حیدر قریشی کے جن موضوعات پر بات ہو چکی ہے، یہ اُن کے نمائندہ موضوعات ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی اُن کے افسانوں میں چھوٹے بڑے موضوع اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ مثلاً اُن کا افسانہ ''**بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے**'' اصل فلسفۂ تقدیر کے اَسرار پر مشتمل ہے۔ ایک اور افسانہ ''**پتھر ہوتے ہیں وجود کا احساس**'' رومانوی فضا کو ہموار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ رومانوی تجربہ ادھر اُدھر کی سیر کرتے ہوئے صوفیانے تجربے میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ افسانہ ''**غریب بادشاہ**'' میں محبت کی پرواز آدھے راستے میں ختم کر دی گئی ہے۔ حیدر قریشی کا ہاں خالص رومانیت کی تلاش مشکل ہے۔ ''**اندھی روشنی**'' میں رومانوی جذبہ سماجی اور قومی شعور میں ضم ہو جاتا ہے۔ ''**شناخت**'' میں تقسیم کا مسئلہ اُبھارا گیا ہے اور ایک خاص زاویے کو متعارف کرانے کی عمدہ کاوش ہے۔ حیدر قریشی کا فنکارانہ کمال یہ بھی ہے کہ وہ پرانے موضوع کو نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ دورِ جدید میں گلزار اور اسد محمد خان نے بھی تقسیم کے نئے جہات روشناس کرائے ہیں۔ ''**کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار**'' میں اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو جرمنی کی بود و باش اختیار کرنے کے لیے جرمن حکومت کو مختلف حیلے بہانوں سے اُلو بناتے ہیں۔

(ب) فنی اور اُسلوبیاتی مطالعہ

حیدر قریشی کے افسانے جہاں فکری اوصاف کی بدولت قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہاں فنی اور اُسلوبیاتی حوالے بھی لائق توجہ ہیں۔ اِن تمام اُمور کا فہم حاصل کرنے کے لیے اہم موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا۔

(۱) پلاٹ

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تصنیف ''تنقیدی اصطلاحات'' میں پلاٹ کی جامع تعریف اِن الفاظ میں بیان کی ہے:

''ڈرامے، نظم یا فکشن میں واقعات کا ایسا لائحہ عمل اور ترتیب و تنظیم جس
سے سامع یا قاری میں دل چسپی یا تجسس برقرار رہے۔'' (۴۲)

حیدر قریشی کے تقریباً تمام افسانوں کے پلاٹ فنی اعتبار سے پختہ ہیں البتہ موضوع کے برتاؤ (Treatment) کی وجہ سے اُن کے ہاں سادہ اور پیچیدہ دونوں قسم کے پلاٹ نظر آتے ہیں۔ سادہ پلاٹ کے حامل افسانوں میں ''آپ بیتی''، ''غریب بادشاہ''، ''مامتا''، ''اندھی روشنی''، ''کاکروچ''، ''شناخت''، ''مسکراہٹ کا عکس'' اور ''بھولے کی پریشانی'' نمائندہ مثالیں ہیں، جبکہ پیچیدہ پلاٹ کے افسانے ''میں انتظار کرتا ہوں''، ''دُھند کا سفر''، ''ایک کافر کہانی''، ''حوا کی تلاش''، ''پتھر ہوتے وجود کا دُکھ''، ''روشن نقطہ'' اور ''بھید'' بطورِ مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔
اِن افسانوں میں تصادم کی نوعیت عمودی اور اُفقی سطحوں پر نمودار ہوتی ہے۔
حیدر قریشی نے پلاٹ کی بنت میں مواد اور تکنیک دونوں کے توازن کا خاص خیال رکھا ہے۔ اُن کے پلاٹ کی بندش اتنی چست ہوتی ہے کہ قاری دورانِ مطالعہ اپنی دل چسپی تمام مقامات پر برقرار رکھتا ہے۔ پلاٹ کی فنی وحدت میں افسانہ نگار کی ذہانت اور ریاضت صاف محسوس ہوتی ہے۔ وہ پلاٹ میں شامل تمام کردار اور واقعات کی کیفیات اور اُسلوبی تلازمات کو ممکنہ حد تک ایک لڑی میں پرو کر رکھتے ہیں، اگر کسی مقام پر جھول کی کیفیت پیدا ہونے لگے تو فوراً اُس کا سدباب بھی کرتے ہیں۔

(۲) وحدتِ تاثر

وحدتِ تاثر کی کیفیت نظم و نثر کی کئی اصناف سے مخصوص ہے لیکن افسانے اور ڈرامے کی ذیل میں اسے کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں میں وحدتِ تاثر کا عمل قاری کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اُن کی پیش کردہ کہانی میں موجود مختلف کردار، منظر کشی، جزئیات، تذبذب، کش مکش اور پلاٹ کی پیش کش اتنی مربوط، متحد اور منظّم ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اُن کی کہانیوں میں فنی و فکری لوازم کی وحدت خاص توجہ چاہتی ہے، کہانی کی منطقیانہ دروبست افسانے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مطلب کی

بات کم سے کم الفاظ میں بیان کرنے پر قادر ہیں۔

(۳) کردارنگاری

حیدر قریشی نے اپنے بیش تر افسانوں میں جیتے جاگتے کردار متعارف کرائے ہیں جو نمو پذیری کے اوصاف سے مزین ہیں۔''چوہدری اللہ دتہ''، ''انکل انیس'' اور'' بھولے'' جیسے کردار ہمارے اردگرد موجود ہیں جن سے ہمارا روزمرہ کی زندگی میں واسطہ بھی پڑتا ہے۔حیدر قریشی نے ایسے ہی کرداروں کواُن کے باطنی اوصاف کی روشنی میں متعارف کرایا ہے،البتہ کچھ افسانوں میں ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو کسی قدر خیالی اور تخیلی ہیں مثلاً ایٹمی جنگوں کے حوالے سے جو افسانے لکھے گئے اُن میں اس نوع کے کرداروں سے ملاقات ہوجاتی ہے لیکن اِن کی موجودگی کہانی کے فطری پن کو متاثر نہیں کرتی۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ تمام کردار زندگی کے اَن دیکھے زاویوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔حیدر قریشی کے کرداروں میں زندگی کا بھر پور تنوع اور تحرک نظر آتا ہے۔

(۴) شاعرانہ اندازِ بیان

حیدر قریشی نے اپنے کچھ افسانوں میں شاعرانہ وسائل کو بھی خوبی سے برتا ہے،اول تو اُن کے ہر افسانے کی پیشانی پر ایک شعر ضرور موجود ہوتا ہے جو اصل کہانی کا علامتی اشاریہ ہوتا ہے۔یہ مثالیں دیکھئے :

☆ ؎ خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے
(میں انتظار کرتا ہوں،کلیات:ص۱۶۳)

☆ ؎ ہوا شہکار جب اُس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا
(گلاب شہزادے کی کہانی،کلیات:ص۱۶۸)

☆ ؎ کسی کا جھوٹ جب اُس عہد کی سچائی کہلایا
ہمارا سچ تو خود ہی موردِ الزام ہونا تھا
(دُھند کا سفر،کلیات:ص۱۷۹)

☆ ؎ بدل جاتے ہیں اک لمحے میں ہی تاریخ کے دھارے
کبھی جو موج میں آکر قلندر بول اُٹھتے ہیں
(روشنی کی بشارت،کلیات:ص۱۹۰)

شعروں کے علاوہ افسانوں میں شاعرانہ زبان کا استعمال بھی ملتا ہے۔یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''ماں مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں گہری سُرخی پھیلی
ہوئی تھی ،لگتا تھا آسمان پر شفق پھوٹنے کی بجائے خون
پھوٹ بہا ہے'' (۴۳)

''میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا
چراغ میرے ہاتھوں میں ہے'' (۴۴)

شاعرانہ عناصر اصل میں اُسلوب کے لطیف اور جمالیاتی پہلوؤں کا اظہار ہیں۔اُردو ادب کے کئی اور کہانی کار شاعرانہ وسائل کو افسانے کا حصہ بناتے رہے ہیں۔خصوصاً اُردو ادب کا رومانوی دور افسانے میں شعری اسالیب کو فروغ دیتا رہا ہے، ان میں سجاد حیدر یلدرم ، نیاز فتح پوری ، مجنوں گورکھپوری ، سلطان حیدر جوش ، ل۔احمد اور چوہدری محمد علی ردولوی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

(۵) خیال افروزی

سیّد عابد علی عابد نے اپنی تصنیف ''اُسلوب'' میں جہاں سادگی،قطعیت اوراختصار کو معیاری اُسلوب کے عناصر قرار دیا ہے وہاں اُسلوب کی درجہ بندی کرتے ہوئے اسے جذباتی،تخیلی اور جمالیاتی حصوں میں بھی تقسیم کر دیا تا کہ اس موضوع کے پیچیدہ پہلوؤں کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔اسی تقسیم کے تحت اُنھوں نے خیال افروزی کو اُسلوب کی تخیلی صفت کے تابع رکھا ہے۔حیدر قریشی کے افسانوں میں خیال افروزی کے تلازمات اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ان کے افسانوں میں وہ مقامات جہاں موضوع پیچیدہ صورت اختیار کرتے ہیں وہاں اصل بات کی وضاحت کے لیے ایمائیت اور اشاریت کا سہارا لے کر معنی آفرینی کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں۔اُسلوب کا یہ منفرد انداز خیال افروزی کی بدولت جہانِ معنی کی سیر کراتا ہے۔

اُردو کے معروف نقاد دیویندر اسر لکھتے ہیں :

'' حیدر قریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے
جہاں سچائی کا المیہ اُن کی قسمت بن چکا ہے........انسان
اپنی کُل ثقافت،جامع تاریخ،اپنے تمام گناہ وثواب کی پونجی
لیے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔''(۴۵)

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں انفرادی،اجتماعی اور آفاقی سطح پر جو سوال اُٹھائے ہیں دیویندر اسر کا اشارہ اُنھی فکری سوالات کی جانب ہے یہ فکری زاویے خیال افروزی کا زائیدہ ہیں۔دیویندر اسر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حیدر قریشی کی کہانیاں انسان،خدا،روح،ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی

سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ایسی کہانیاں اُردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔'' (۴۶)

خیال افروزی پر مشتمل ان سوالوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں ایک بار پھر حیدر قریشی کے افسانوں کی متن خوانی کرنا ہوگی۔خصوصاً ''گلاب شہزادے کی کہانی''،''روشنی کی بشارت''،''روشن نقطہ''، ''گھٹن کا احساس''،''بھید'' اور''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' کا مطالعہ فکر ونظر کے کئی نئے گوشے منکشف کرتا ہے۔

(۶) تاریخی حکایات اور اقوال کا برمحل استعمال

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات کو برتا ہے اُن کی وضاحت وصراحت کی خاطر شاعری، حکایات، تمثیلات اور قرآنی آیات سے بھی رجوع کیا ہے۔اُن کا افسانہ''ایک کافر کہانی''میں ابراہیم بن ادھمؒ، رابعہ بصریؒ ،حضرت بایزید بسطامیؒ اور جنیدؒ وشبلیؒ کے حوالے سے مرکزی خیال کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

ایک اور افسانہ''حوّا کی تلاش''میں بائبل کا حوالہ نظر آتا ہے اور چند مقامات پر قرآنی آیات کی تاویل ملتی ہے۔

''روشن نقطہ''میں صوفیانہ اقوال کے تجربات بکھرے ہوئے ہیں۔''روشنی کی بشارت''میں فریڈرک نطشے کو بنیا بنا کر افسانہ لکھا گیا ہے۔یہ امثال ضرورت کے تحت وجود پذیر ہوئی ہیں اور ان کی شمولیت نے کہانی پن میں اضافہ کیا ہے۔

(۷) علامت کا استعمال

حیدر قریشی کے ہاں علامت کا محتاط اور سُلجھا ہوا استعمال ملتا ہے، دوسری علامتوں سے قطع نظر اُن کے ہاں''روشنی'' کی علامت غالب رجحان کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''روشنی کی علامت اپنے استعاراتی اور تلمیحی زاویوں کے
> ساتھ تمام افسانوں پر حاوی ہے۔'' (۴۷)

''روشنی'' کی علامت کئی افسانوں میں روپ بدل بدل کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔کہیں یہ روشنی انبیاء کرامؑ کے پیغام کو عام کرتی ہے اور کہیں جلوہء خداوندی کا نور اس علامت کے روپ میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔دیگر علامتوں میں''پانی''،اور''آگ'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے یا پھر''کا کروچ''کو بطورِ علامت متعارف کرانے کے منفرد پہلو قابلِ ذکر ہیں۔

حیدر قریشی کی علامتوں کا نمایاں وصف اُن کا فوری ابلاغ ہے۔اُن کی علامتوں میں تجرید اور ابہام کے بجائے وضاحت اور قطعیت ملتی ہے۔جس کی وجہ سے کہانی میں موجود فکر ونظر کے مطالعے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اِن کے افسانوں میں موجود تمام علامتیں کہانی کے ارتقائی سفر کو بطریق احسن رواں دواں رکھتی ہیں۔

(۸) سادگی

حیدر قریشی کا اُسلوبِ نگارش اصلاً سادگی پر اُستوار ہے، وہ دل کی بات کہنے کے لیے لمبی چوڑی داستان طرازی کے قائل نہیں ہیں۔اُن کے ہاں زبان و بیان کے تمام قرینے اسی سادگی سے پھوٹتے ہیں۔وہ مشکل سے مشکل موضوع کو آسان پیرائے میں بیان کرنے پر قادر ہیں۔اُن کے افسانوں میں مطالعہ پذیری کے اوصاف اسی سادگی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔اُن کا ہاں سادگی کا استعمال بطور اُسلوبیاتی قوت متاثر کن ہے۔

(۹) اثر پذیری

افسانے کی صنف اپنی نزاکت اور تاثر کی وجہ سے عالمی ادب میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔اس میں ایک آنچ کی کسر افسانے کو عرش سے فرش پر پہنچا دیتی ہے۔افسانے میں اگر دلچسپی اور تاثیر کے عناصر شامل نہ ہوں تو قاری محض چند سطریں پڑھ کر ہی اُکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔حیدر قریشی کے افسانے اپنی دلچسپی کی وجہ سے قبولِ عام کا درجہ رکھتے ہیں وہ کہانی کی فضا کچھ اس انداز سے تعمیر کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی کا سارا سامان اُس میں موجود رہتا ہے۔افسانوں کی یہی اثر پذیری اُنھیں اُردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں میں شامل کرتی ہے۔اُن کی ہاں موضوع کی ندرت بھی اس اثر پذیری میں اضافہ کرتی ہے، اگر وہ کسی عام موضوع پر بھی افسانہ لکھیں پھر بھی اُس میں کوئی ایسا نادر پہلو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو عموماً نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ان کے افسانوں میں ڈرامائیت اور اُچھوتا پن کہانی کو پُر اثر بناتے ہیں۔

(۱۰) فضا بندی

حیدر قریشی اپنے افسانوں کی فضا بنانے میں بہت محنت کرتے ہیں،کہیں یہ فضا رومان اور تخیل کے بدلتے موسموں پر قائم نظر آتی ہے اور کہیں جنگ کی تباہ کاریاں اور طلسمی مناظر قاری کو ورطہء حیرت میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔کچھ افسانوں میں جدید اور قدیم تہذیب وثقافت کا سحر انگیز منظر موضوع کی نئی معنوی پرتیں کھول رہا ہوتا ہے۔خاص طور پر حیدر قریشی کے جنگ جاے(ایٹمی جنگ کے حوالے سے لکھے گئے تین افسانے) اس فضا بندی کی اہم مثالیں ہیں۔

حیدر قریشی کے افسانوں کو اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اُن کے فنی وفکری محاسن پڑھنے والوں پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں سیاسی وسماجی شعور کی سطح نہایت گہری اور عمیق ہوتی ہے بلکہ اسی عصریت نے اُن کے افسانوں کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔فنی اور تکنیکی تقاضوں پر اُن کی نظر اس بات کی شاہد ہے کہ وہ ادب کی اعلیٰ قدروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخلیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔سماجی حقیقت نگاری اُن کا اصل میدان ہے۔اظہاریت میں تخلیقی رکھ رکھاؤ اور برجستگی اُن کے اُسلوبی وژن کا اصل جوہر ہے۔

(۱.۲) خاکہ نگاری

(۱.۲)حیدرقریشی کی خاکہ نگاری

خاکہ نگاری اُردو ادب کی اہم اور مقبول صنف ہے جو اپنی تاریخی اور سوانحی اہمیت کی بدولت عوام و خاص کی توجہ حاصل کر چکی ہے ۔ یہ صنف اپنے اندر تخلیق اور تخیل کے وسیع امکانات رکھتی ہے ۔ایک اچھا اور معیاری خاکہ کسی شخص کا محض ظاہری اور باطنی تجزیہ ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے عہد کا ادبی ، سماجی ، سیاسی ،نفسیاتی اور ثقافتی منظر نامہ بھی مرتب کرتا ہے ۔ اس صنف کے اصل خدوخال واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم پر ایک نظر ڈال لی جائے ۔

☆ خاکہ نگاری کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

اُردو زبان میں ''خاکہ'' کئی معنوں میں مستعمل ہے ۔معروف لغت ''فرہنگ آصفیہ'' کے مطابق اس لفظ کے معنی یہ ہیں :

''گروہ نقاشاں ، خاک کے ذریعے سے نقشہ وغیرہ کا
نشان ڈالنا، ڈھانچہ ،نقشہ، چربہ ۔'' (۴۸)

'' نُور اللغات'' میں لکھا ہے:

''ڈھانچہ ،تصویر کا مسودہ'' (۴۹)

''حسن اللغات'' (فارسی ۔ اُردو) اور ''فرہنگ فارسی'' میں بھی وہی معنی درج ہیں جن کا ذکر اُوپر آ چکا ہے ۔البتہ'' علمی اُردو لغت'' میں اس معنی میں قدرے وسعت نظر آتی ہے :

''وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے ۔کسی
چیز کا ابتدائی نقشہ، مرقع ، وہ مضمون جس میں کسی شخص کے
جستہ جستہ حالات لکھے جائیں، وہ مسودہ یا منصوبہ جو ذہن
میں بنایا جائے ۔'' (۵۰)

محولہ بالا تعریف میں شخصیت نگاری کا حوالہ بھی شامل ہو گیا ہے تاہم اس میں کچھ اجزا کی کمی محسوس ہوتی ہے جس کا ازالہ'' اُردو لغت (تاریخی اُصولوں پر) میں ہو جاتا ہے:

''خدوخال وغیرہ کی نقل جو اصل سے مشابہ ہو،تصویر کا ڈھانچہ، کسی عمارت وغیرہ کا

کچا نقشہ، تحریر کا ذہنی پس منظر، کسی حقیقت کی مختصر کیفیت کا نقشہ، سوانح حیات پر مبنی تحریر،
تعارف، حالات زندگی کا مختصر نقشہ، مختصر ڈرامہ یا نقشہ، ناٹک، ایک قسم کی کشیدہ جالی یا
ململ جس کو نقشے یا تصویر پر رکھ کر بنایا جائے ۔'' (۵۱)

اُردو زبان کے دستیاب لُغات میں لفظ'' خاکہ'' کی اگر اہم تعریفوں کو دیکھا جائے تو مذکورہ بالا تعریف خاصی جامع اور اطمینان بخش نظر آتی ہے، یہاں تمام ممکنہ معنی یکجا کر دیے گئے ہیں ۔ یہ تعریف خاکہ کے تمام تشریحی لوازم کا احاطہ کرتی ہے ۔

اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ تحریر ہے جس میں ہلکے پھلکے انداز اور اُسلوب میں کسی شخص کے ظاہری اور باطنی اوصاف کو اجاگر کیا جائے ۔ یہ اصلاً ایک سوانحی تحریر ہوتی ہے ، لیکن اس کا انداز سوانحی مضمون ، مرقع ، پورٹریٹ اور سوانح عمری سے یکسر جداگانہ ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی مرتب کردہ ،تنقیدی اصطلاحات میں موضوعِ زیرِ بحث کے لوازم پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''انگریزی ''Sketch'' کے لیے مستعمل اصطلاح خاکہ
اُس مختصر تحریر کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی فرد کے
بارے میں شخصی تعلقات ،نجی کوائف اور ذاتی احوال پر مبنی
ہو ۔اسے شخصیت نگاری کی مختصر ترین صورت بھی قرار دیا
جا سکتا ہے ۔'' (۵۲)

اُردو زبان و ادب کا پہلا باضابطہ خاکہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا ہے جس کا عنوان'' ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ اُن کی زبانی'' ہے ۔ یہ خاکہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا اور تا حال اس صنف میں خوشگوار اضافوں کا سلسلہ جاری ہے ۔

☆ حیدر قریشی کے تحریر کردہ خاکے مع عنوانات

حیدر قریشی کے خاکوں کا مجموعہ ''میری محبتیں'' ترتیب و تہذیب کے اعتبار سے دو حصّوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصّے کا ذیلی عنوان ''اول خویش'' رکھا ہے اس میں صرف قریبی اہلِ خانہ کے خاکے شامل ہیں، دوسرے حصّے کا نام ''بعد درویش'' ہے جو قریبی احباب اور ادبی مشاہیر کے ذکر پر مبنی ہے ۔ ذیل میں تمام خاکوں کے نام اور ذیلی عنوانات درج کیے جاتے ہیں:

(i) **اوّل خویش :**

۱۔ برگد کا پیڑ (ابا جی)

۲۔ مائے نی میں کنوں آکھاں (امی جی)

۳۔ ڈاچی والیا موڑ مہار وے (دادا جی)

۴۔ مظلوم متشدد (نانا جی)

۵۔ مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ (تایا جی)

۶۔ رانجھے کے ماموں (ماموں ناصر)

۷۔ محبت کی نمناک خوشبو (آپی)

۸۔ پسلی کی ٹیڑھ (مبارکہ)

۹۔ اُجلے دل والا (چھوٹا ماموں)

۱۰۔ زندگی کے تسلسل (پانچوں بچے)

(ب) **بعد درویش :**

۱۱۔ اُردو ادب کے نوبل پرائز (میرزا ادیب)

۱۲۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی (فیض احمد فیض)

۱۳۔ عہد ساز شخصیت (ڈاکٹر وزیر آغا)

۱۴۔ ایک ادھورا خاکہ (غلام جیلانی اصغر)

۱۵۔ بلند قامت ادیب (اکبر حمیدی)

۱۶۔ صاف گو ادیبہ (عذرا اصغر)

۱۷۔ روشنی کا کمبل (سعید شباب)

۱۸۔ عاجزی کا اعجاز (محمد اعجاز اکبر)

۱۹۔ میرافیئا غورث (طاہر احمد)

۲۰۔ پرانے ادبی دوست (خانپور کے احباب)

حیدر قریشی نے اِن خاکوں میں زندگی کے رنگ بھر دیے ہیں۔اُنھوں نے اپنے اہلِ خانہ کے حوالے سے جو خاکے تحریر کیے وہ روایتی یا تاثراتی نوعیت کے برعکس اعلیٰ ادبی اقدار کا مرقع بن گئے ہیں۔ وہ محض تعارفی اور سوانحی معلومات پر انحصار کرنے کے بجائے گہرے ادبی شعور کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔حیدر قریشی کے خاکوں پر بات کرتے ہوئے اُن سب خاکوں کا تجزیہ کیا جائے گا جو اہلِ خانہ اور دیگر احباب پر لکھے گئے ہیں تا کہ اُن کی تکنیک اور اُسلوب کا پورا پورا احاطہ کیا جا سکے۔خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ خاندان کے افراد پر لکھے جانے والوں کے خاکوں کا اُسلوب اور اندازِ بیان اُن تمام خاکوں سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے جو ادیبوں اور دوستوں پر لکھے گئے ہیں۔

اُسلوب کا یہی تنوع نفسِ مضمون کو سنوارتا اور نکھارتا ہے۔

☆ حیدر قریشی کے خاکوں کا تجزیاتی مطالعہ

حیدر قریشی کی تخلیقی نثر کا حوالہ خاکہ نگاری کے بغیر نامکمل ہے۔خاکہ نگاری کی صنف ان کے مزاج میں رچی بسی نظر آتی ہے۔اُنھوں نے اب تک بیس (۲۰) خاکے تحریر کیے ہیں جو **"میری محبتیں"** کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔یہ خاکے تکنیکی اور اُسلوبیاتی لحاظ سے مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ واقعات کی ترتیب، دل چسپی، شگفتگی اور برجستگی کے باعث بھی جاذبِ توجہ ہیں۔اِن تمام خاکوں میں شخصیت کا عمیق مطالعہ کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔ نیز خاکے کے جمالیاتی اوصاف کو نمایاں رکھا گیا ہے۔

حیدر قریشی نے جس کسی کا بھی خاکہ تحریر کیا اُس کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کی ایسی سچی تصویر کشی کی جو ہر اعتبار سے جامع و مانع ہے۔ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسی ناہمواریاں بھی پائی جاتی ہیں جو ہنسی اور انبساط پیدا کرتی ہیں، اُنھوں نے شخصیت کے اُن مضحک پہلوؤں کو خاص ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ خاکے کا حصہ بنایا ہے۔خاکہ نگار بذاتِ خود لطافت و شگفتگی اور شوخی کو زندگی کا ناگزیر حصہ تسلیم کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اِن خاکوں میں بے تکلفی اور رونق نظر آتی ہے۔کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ قاری دورانِ مطالعہ ہر کردار کے ساتھ اُنس و محبت اور دوستی کا رشتہ استوار کر لیتا ہے۔

حیدر قریشی کی خاکہ نگاری پر بات کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب **"میری محبتیں"** پر ایک تحقیقی نظر ڈال لی جائے۔اس کتاب کے اب تک دو ایڈیشن آ چکے ہیں۔پہلا ایڈیشن نایاب پبلی کیشنز، خانپور نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا، دوسرا ایڈیشن معیار پبلی کیشنز، دہلی نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا تھا۔اب یہ مجموعہ بغیر کسی تبدیلی کے حیدر قریشی کے کلیات (عمرِ لاحاصل کا حاصل) میں شامل کر دیا گیا ہے۔اس کلیات میں پانچ شعری اور چھے نثری مجموعے شامل ہیں جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۲۰۰۹ء زیورِ طباعت سے آراستہ کیا تھا۔اس تعارف کے بعد اب اُن کے خاکوں پر موضوعاتی حوالے سے تفصیلی بحث کی جائے گی۔

(ا) ماضی پرستی

حیدر قریشی کے خاکوں میں ماضی پرستی کا رجحان غالب ہے، خصوصاً کتاب کے پہلے حصہ میں ماضی کی یادیں سلسلہ در سلسلہ پھیلی نظر آتی ہیں۔وہ اپنے مدوحین کے خاکوں میں اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کی یادیں تازہ کرتے ہیں "میری محبتیں" کا پہلا خاکہ "برگد کا پیڑ" (جو والد بزرگ وار سے متعلق ہے) اس میں بھی وہ اپنی شوگر مل کی ملازمت کو یاد کرتے ہیں جہاں اُنھوں نے زندگی کے اُنیس سال برباد کر دیے تھے۔والدہ کے خاکے میں حیدر قریشی اس لوری کو یاد کر رہے ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا:

''امی جی نے یہ لوری اپنے سارے بیٹوں میں سے صرف
میرے لیے گائی تھی۔ ماں کی محبت اور دعاؤں سے بھری
اس لوری نے مجھے پروان چڑھایا تھا۔'' (۵۳)

ماموں پر لکھے ہوئے خاکے میں صرف اور صرف ماضی کی یادیں ہیں۔ اپنے ماموں کی شخصیت ماضی کے دھندلکوں سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیدر قریشی نے گزری یادوں کی باز آفرینی کے لیے اپنے خاکوں سے بھرپور مدد لی ہے۔

(۲) شخصی تجزیات

خاکہ نگاری میں بالعموم کسی شخصیت کے سطحی اوصاف کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا جاتا ہے کہ اصل شخصیت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حیدر قریشی کے خاکوں میں یہ کمزوری نظر نہیں آتی۔ اُن کے خاکوں میں شخصیت کے عمیق تجزیات ملتے ہیں۔ وہ تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں اصل شخصیت کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے والد صاحب کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں:

(ا) ''اباجی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت
رکھتے تھے، مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے
تھے۔'' (۵۴)

(ب) ''اباجی کی زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اُن
کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب
بیٹھا نظر آتا ہے۔'' (۵۵)

(ج) ''اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے
نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ اباجی کے اندر موجود رہا یہ
درویش خواب بین، دعا گو اور صاحبِ کشف وکرامات
تھا۔'' (۵۶)

مندرجہ بالا جملے بظاہر سادہ دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر ان کی شرح کی جائے تو درجنوں صفحات کی ضرورت پڑے گی۔ دراوڑ لوگ ہندوستان کی سب سے پرانی اور قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قدیم باشندے اپنے علاقے کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ادھر اُدھر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ حیدر قریشی نے اپنے والد گرامی کو اس لیے دراوڑ کہا کہ وہ ہر شے سے بے نیاز ہو کر صرف اپنی ملازمت پر گزارہ کرتے تھے، رحیم یار خان کے مسکن پر قناعت کر لی تھی اور اپنی قدیم بود وباش پر قائم رہے۔

اپنے والد کو دراوڑ کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حیدر قریشی کے گھر کا تمام انتظام والدہ کے ہاتھ میں تھا اور تمام اہم امور کی نگرانی بھی اُنہی کے سپرد تھی۔ دراوڑی تہذیب میں بھی سربراہی کا تمام تر اختیار عورت کے پاس تھا۔ رما شنکر ترپاٹھی نے ڈاکٹر ایل۔ ڈی بارونٹ کے حوالے سے لکھا ہے:

''دراوڑی سماج ایک حد تک ایسا سماجی نظام تھا جس میں عورت سرِ قبیلہ ہوتی تھی۔'' (۵۷)

حیدر قریشی نے اپنی والدہ محترمہ پر جو خاکہ تحریر کیا اسے پڑھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ 'سرِ قبیلہ' والی بات میں خاصی صداقت موجود ہے۔ حیدر قریشی نے بظاہر اس عمومی صفت کو گہرے تہذیبی شعور کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شخصی تجزیے کے حوالے سے ایک اور اہم مثال اکبر حمیدی کے خاکے میں دیکھی جا سکتی ہے:

''اکبر حمیدی طبعاً ایک سیدھے سادے، سچے کھرے، اور صاف گو دیہاتی
ہیں، اُنہیں ہیرا پھیری اور چالاکی نہیں آتی۔ کھلی دوستی، کھلی دشمنی لیکن شہر
کے بعض دوستوں اور مہربانوں کی مکاریوں اور ہیرا پھیریوں کا شکار ہوتے ہوتے
آخر اُنہیں بھی تھوڑی بہت ہیرا پھیری اور چالاکی کرنا آ گئی ہے۔'' (۵۸)

حیدر قریشی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے دوران معروضی اور موضوعی دونوں پہلوؤں کو بروئے کار لاتے ہیں ان کے شخصی تجزیے متوازن ہوتے ہیں۔

(۳) نفسیاتی نکتے

حیدر قریشی اپنے کرداروں کے باطن میں جھانک کر بات کرتے ہیں ان کا خاکہ ''اُجلے دل والا'' (چھوٹا بھائی) جس میں وہ اپنے چھوٹے بھائی طاہر کو پیش کر رہے ہیں اس خاکے کے اختتام پر فکری اور نفسی مطالعات کا عمیق مشاہدہ بھی موجود ہے، انداز ملاحظہ ہو:

''عام طور پر تلخ حالات کا مقابلہ کرتے کرتے انسان کے
لہجے میں کڑواہٹ آتی ہے۔ مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو
جاتا ہے۔ طاہر کا کمال یہ ہے کہ اس نے تلخ ترین حالات
سے گزر کر بھی اپنے باطن کی مٹھاس قائم رکھی ہے اور اپنے
لہجے میں مزید نرماہٹ پیدا کر لی ہے۔'' (۵۹)

ڈاکٹر انور سدید انہی خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حیدر قریشی نے اپنے خون کے رشتوں کو ذرا فاصلے سے
دیکھا اور اُن کی شخصیت کی وہ پرتیں ہمارے سامنے پیش

کیں جن سے اُن کرداروں کی فطری ہمدردی، محبت
اوراُخوت کی تعمیر ہوتی ہے۔'' (۶۰)

(۴) خاکہ نگار کی اپنی شخصیت کا عکس

حیدر قریشی کے خاکوں میں اُن کی اپنی شخصیت کا عکس کسی نہ کسی حوالے سے ضرور اُبھرتا ہے اور قاری کو خوشگوار حیرت سے دوچار کرتا ہے، طاہر مجید لکھتے ہیں:

''حیدر قریشی نے ہر خاکے میں اپنی ذات کے حوالے
سے باتیں کی ہیں اس صورت میں قاری جہاں اُن
خاکوں کے ذریعے ان شخصیات سے متعارف ہوتا ہے
وہاں بالواسطہ خاکہ نگار کی شخصیت جا بجا جھانکتی نظر آتی
ہے۔ بلکہ ایک عام قاری بھی اس کے مختلف حیثیتوں کا
اندازہ لگانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔'' (۶۱)

اب ''بلند قامت ادیب'' (اکبر حمیدی) کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اکبر حمیدی سے میری ملاقات اور تعلق کی نوعیت تھوڑی پیچیدہ ہے
یہ پیچیدگی میری اپنی پیدا کردہ ہے۔جس میں اکبر حمیدی کے بنائے
ہوئے یاد کھاتے ہوئے سیدھے راستے پر چلتا ہوں پھر اس رستے کو،
سیدھے سادھے کو اُلجھا کر بھول بھلیاں سی بنالیتا ہوں، یوں میرے
لیے اچھی بھلی بامعنی منزلیں بھی بے معنی ہوجاتی ہیں۔'' (۶۲)

اس طرح کی درجنوں مثالیں ''میری محبتیں'' میں موجود ہیں۔اگر ان تمام مثالوں کو یکجا کر دیا جائے تو حیدر قریشی کی شخصیت پر ایک جامع خاکہ بآسانی مرتب کیا جاسکتا ہے۔

(۵) اَن دیکھی شخصیت کا خاکہ

خاکہ نگاری کی روایت میں اَن دیکھی شخصیات کا خاکہ لکھنے کا رواج بھی رہا ہے۔سقراط، سکندر اعظم اور گوتم بدھ کے خاکے انگریزی کے علاوہ دوسری بڑی زبانوں میں موجود ہیں۔محمد طفیل نے ''نقوش'' کے شخصیات نمبر'' میں اَن دیکھی شخصیات کے چند خاکے شامل کیے ہیں۔اُردو زبان کے معروف محقق رشید حسن خان نے ''فرہنگ آصفیہ'' کے مولف مولوی سیدامجد دہلوی کا اَن دیکھا خاکہ لکھا ہے۔اس کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

'' اُردو کے مشہور لغت فرہنگ آصفیہ کے مولف مولوی
سید احمد دہلوی کو میں نے دیکھا تو نہیں، اور دیکھتا بھی

کیسے، وہ پیدا ہوئے تھے ۱۸۴۶ء میں یعنی اب سے ایک
سوا نتالیس برس پہلے، اور ۱۹۱۸ء میں اس دنیا سے چلے
گئے۔'' (۶۳)

حیدر قریشی نے اپنے دادا کا خاکہ (ڈاچی والیا موڑ مہاروئے) تحریر کیا جن سے وہ کبھی مل نہیں پائے تھے وہ لکھتے ہیں:

''میرے دادا جی قیام پاکستان سے کئی برس پہلے فوت ہو
گئے تھے۔ میں نے دادا جی کو نہیں دیکھا مگر اُن کے
بارے میں اپنے دل میں ہمیشہ ایک انوکھی سی محبت محسوس
کی ہے۔'' (۶۴)

یہ اُس محبت کا کرشمہ تھا کہ اُنھوں نے اپنے والد گرامی سے معلومات جمع کرنے کے بعد اپنے دادا کے بارے میں ایک شخصی تصور قائم کیا اور بھرپور خاکہ لکھنے میں کامیابی حاصل کی۔دادا کا یہ کردار ایک پیرِ کامل کی صورت میں اُبھرتا ہے اور قاری کے دل پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔

(۶) مافوق الفطرت عناصر

حیدر قریشی کی تخلیقی نثر میں مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی کئی سوال اُٹھاتی ہے۔آیا یہ سب کچھ اُن کے طبعی رجحانات کے بدولت وقوع پذیر ہوا؟ یا وہ زندگی کے عمومی واقعات میں غیر معمولی عناصر تلاش کرنے پر قادر ہیں؟ اُن کے پیش کردہ کچھ واقعات کا تعلق اہل خانہ سے جا ملتا ہے، مثلاً اپنے دادا جی ایک واقعہ وہ اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''دادا جی معمولی سا بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے گھر میں
رونا پیٹنا مچ گیا۔سارے عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔دادا
جی کو غسل دے دیا گیا تو اُٹھ کر بیٹھ گئے وفات کی خبر سن کر
آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔کچھ چیختے چلا
تے گھر سے نکل بھاگے، ایک دو عزیز دہشت سے بے
ہوش ہو گئے۔ابا جی کو ''شادی مرگ'' کا مطلب پوری
طرح سمجھ میں آگیا۔'' (۶۵)

اس طرح کا ایک غیر معمولی واقعہ ''رانجھے کے ماموں'' (ماموں ناصر) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ماموں ناصر کا ایک مادہ سانپ سے ایسا پالا پڑا کہ وہ ہر سال آکر ان کے پاؤں سونگھ کر چلی جاتی جس کی وجہ سے ان کا پاؤں صبح تک ایسا

ہوجاتا ہے جیسے کس نے پاؤں کی کھال اُتار دی ہو۔ کچھ عرصے کے بعد ماموں ناصر کے شاگردوں نے اس ناگن کا خاتمہ کر دیا اور اُن کی مصیبت ختم ہوگئی۔ جہاں تک بزرگوں کے خاکوں میں مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی کا مسئلہ ہے تو اس پر تجزیاتی رائے دینا ذرا مشکل ہے کیونکہ روحانی دنیا کے معاملات پر رائے زنی خالی از خطر نیست، البتہ منشا یاد نے یہ کہہ کر ہمارے لیے بھی آسانی پیدا کر دی ہے:

''حیدر قریشی اپنے بزرگوں کی کسی بات کو جھٹلاتے یا رد تو
نہیں کرتے مگر صورتِ حال پہ مختصر سا تبصرہ کر دیتے ہیں
جس سے ان کی سوچ اور موقف کا پوری طرح اندازہ
ہوجاتا ہے۔'' (۶۶)

(۷) شگفتہ مزاجی

حیدر قریشی نے جو خاکے اپنے اہلِ خانہ کے حوالے سے تحریر کیے ان میں طنز ومزاح کا خاصا اہتمام نظر آتا ہے جبکہ ادیبوں پر لکھے گئے خاکوں میں یہ عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔قریبی رشتے داروں کے خاکوں میں اُنھوں نے طنز ومزاح کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیا۔اُن کا ایک خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'' (اپنی زوجہ مبارکہ پر لکھا ہوا خاکہ) کا آغاز ان شگفتہ جملوں سے ہوتا ہے:

''بیوی..... بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو
داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے
مترادف ہے۔'' (۶۷)

دادا جی کی فیاضی اور سخاوت کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ان کے دروازے سے کوئی سائل خالی ہاتھ واپس نہ جاتا تھا بلکہ ایک دفعہ جب کوئی سائل آیا تو دادا جی کے پاس اور تو کچھ دینے کے لئے موجود نہ تھا لہٰذا اپنی قمیض اُتار کر بھکاری کے حوالے کر دی،حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''خدا کا شکر ہے کہ اس کے فوراً بعد کوئی اور سائل نہیں آ گیا کیونکہ اس وقت
دادا جی کے جسم پر صرف ایک چادر تھی جو انہوں نے نیچے باندھی ہوئی تھی اور
یہ تو طے ہے کہ انہوں نے سائل کو بہر حال خالی ہاتھ نہیں جانے دینا تھا'' (۶۸)

حیدر قریشی کا ایک اور خاکہ ''مظلوم تشدد'' جو اُنھوں نے اپنے نانا پر لکھا ہے اس میں بھی شگفتہ اُسلوب اور طنز ومزاح کے عناصر بھرے پڑے ہیں۔ترنم ریاض لکھتی ہیں:

''میری محبتیں'' تو کمال کی کتاب ہے سیدھی، سنجیدہ باتیں
لکھتے ہوئے آپ جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل

کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قہوہ پیتے پیتے
الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آ کر ذہن و دہن کو خوشبو سے
معطر کر جائے۔'' (۶۹)

خاور اعجاز رقم طراز ہیں:

''حیدر قریشی کی یہ تحریریں محبت کی چاشنی میں ڈوبی ہوتی
ہیں۔کہیں کہیں ہلکا سا طنز یا مزاح کا پہلو لے ہوئے کوئی
چبھتی ہوئی بات بھی محبت ہی کا ایک اظہار ہے۔'' (۷۰)

حیدر قریشی کے طنز ومزاح میں گراوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔وہ شگفتگی اور بذلہ سنجی کی اخلاقی حدود و قیود کے قائل ہیں اور غیر رسمی اُسلوب میں بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

(۸) حیدر قریشی کی تحریروں میں زوجہ مبارکہ کا ذکر

حیدر قریشی کی تحریریں ہمہ جہت حیثیت رکھتی ہیں ان میں جہاں تحقیق وتنقید کے محاکے قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں وہاں تخلیقی رنگ وآہنگ بھی اپنا جادو جگاتا نظر آتا ہے۔اُن کی تخلیقی سرگرمیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے جس پر پاک و ہند کے علاوہ دیگر یورپی ممالک کے ادبا نے دل کھول کر داد دی ہے۔قریشی صاحب نے اپنی تخلیقی نثر میں جہاں متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی وہاں اہل خانہ کو بھی خاص اہمیت دی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی ادبی کہکشاں میں ہر رنگ کا ستارہ جھلملا رہا ہے۔زیر نظر حصے میں صرف اُن تحریروں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جن کا تعلق اُن کی اہلیہ (مبارکہ) کے ساتھ ہے۔اس حوالے سے اُن کی نمائندہ تحریر وہ خاکہ ہے جو اُنھوں نے ایک خاص کیفیت میں ڈوب کر لکھا ہے۔اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت اور ذخیرے پر نظر کی جائے تو علم ہوتا کہ لکھنے والوں نے تقریباً ہر قسم کی شخصیت پر قلم برداشتہ لکھا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی ادیب نے اپنی بیوی پر خاکہ لکھ کر محبت کا ثبوت فراہم کیا ہو۔حیدر قریشی کا تخلیقی قلم جہاں تمام اہل خانہ کے ذکر پر روانی اور جولانی کا مظاہرہ کرتا ہے وہاں اہلیہ کا ذکرِ خیر بھی فراخ دلی سے صفحہء قرطاس کی زینت بنتا ہے۔اس موضوع میں اُن کی خاص دل چسپی نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نظم ونثر کی اہم اصناف میں وہ اپنے دل پسند موضوع کو حد درجہ سلیقے اور قرینے سے نبھاتے ہیں۔اس دل چسپ اور شگفتہ خاکے کا آغاز ایک حسبِ روایت طبع زاد شعر سے ہوتا ہے:

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

حیدر قریشی نے خاکے کا عنوان بھی بہت منفرد رکھا ہے۔۔۔۔''پسلی کی ٹیڑھ'' (مبارکہ)۔خاکے کی ابتدائی سطور قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔انداز ملاحظہ ہو:

'' بیوی۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کوداؤ پر لگانے
اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔بہر حال میں
اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ سچ لکھوں گا۔۔سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں
گا۔(کلیات:ص۳۱۱)

''پسلی کی ٹیڑھ''میں خاکہ نگاری کے ممکنہ اہم نکات اور وسائل یکجا صورت میں ملتے ہیں۔بچپن کا تذکرہ نہایت میٹھے انداز میں سامنے آتا ہے اور قاری کو پتا چلتا ہے کہ حیدر قریشی نے بچپن کی معصومیت میں ماموں کی بیٹی سے شادی کرنے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا وہ بالآخر پوری ہوگئی تھی۔وہ خود بھی کہتے ہیں:

'' بچپن میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی مذاق کی ایک بات اتنی سنجیدگی
اختیار کرگئی کہ اب سارا مذاق وجدانی معلوم ہوتا ہے۔'' (کلیات:ص۳۱۱)

یہ خاکہ اپنایت اور محبت کی ملی جلی کیفیات کا عکاس ہے،اور اگر اسے ''میری محبتیں'' کا کلیدی اور نمائندہ خاکہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔اُردو ادب میں ایسے خاکے کم ملتے ہیں جس میں اپنی اہلیہ کو اتنے ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ ہمارے ہاں بیویوں کا تمسخر اُڑانا عام سی بات اور اگر کبھی تعریف بھی کرنا پڑ جائے تو اُس میں سے بھی ایسے پہلو لازماً تلاش کر لیتے ہیں جس میں طنز پوشیدہ ہوتا ہے۔حیدر قرشی کے ہاں یہ رویہ کسی سطح پر نہیں پایا جاتا۔اس کے برعکس توازن اور شائستگی نظر آتی ہے۔یہ توازن اوصاف نگاری کے دوارن بھی برقرار رہتا ہے۔چند مثالیں دیکھئے:

'' مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔
ماں والی دھونس نہیں جماتی البتہ دوستانہ دھونس ضرور جماتی ہے۔''(کلیات:ص۳۱۳)

حیدر قرشی کو جہاں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا ہوتا ہے وہ بھی برملا کر دیتے ہیں۔

'' میں اپنی فکری آزادہ روی کے باعث مبارکہ کے لیے بہت تکلیف کا سامان
کر بیٹھا'' (کلیات:ص۳۱۳)

اس ادبی خاکے میں ہر طرح کے رنگ موجود ہیں۔کہیں ممدوح کی شخصیت نمایاں کرنے کی خاطر گہرے شوخ رنگ برتے گئے ہیں اور کہیں کہیں ہلکے رنگ شخصیت کی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔خاکہ نگار نے بے جا لفاظی اور طوالت سے اپنا دامن بچایا ہے۔مختصر اشارے کنائے اس تحریر کا خاص حسن ہے جس کی وجہ سے شخصیت کا ناک نقشہ اور عادات واطوار کا بیانیہ فطری اُسلوب متاثر کرتا ہے۔حیدر قریشی جانتے ہیں کہ خاکہ نگاری ایک ایسی ظالم صنف ہے جس میں ایجاز واختصار کا جادو اپنا اثر ضرور دیکھاتا ہے۔
حیدر قرشی نے زوجہ مبارکہ کا ذکر جہاں بھی کیا کمال محبت اور لگاؤ سے کیا ہے،''کھٹی میٹھی یادیں'' کا آخری حصہ

جہاں تمام اہم احباب کا تذکرہ روانی سے آگے بڑھتا ہے وہاں ایک بار پھر بہانے بہانے سے اہلیہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ان باتوں میں مبارکہ کی بیماری کا احوال سامنے آتا ہے اور دوطرفہ محبت اور احترام کی کیفیات بھی لہریں مارتی نظر آتی ہیں۔حیدر قریشی نے جب اپنا کلیات ''عمر لاحاصل کا حاصل'' مرتب کیا تو اس کا انتساب لکھتے ہوئے ایک بار پھر ''اظہارِ تشکر'' کا آغاز اپنی اہلیہ سے کیا ہے:

''اپنی اہلیہ مبارکہ کا شکریہ جس نے مجھے میری ساری خامیوں سمیت نہ صرف قبول کر رکھا ہے
بلکہ مجھے ادبی کاموں میں ہر طرح کی سہولت بھی فراہم کرتی رہتی ہے۔''

یہ محبت کی کہانی مزید آگے بڑھتی ہے اور ''محبت کے پھول'' میں ایک پھول ادائے خاص سے مبارکہ کو نذر کرتے ہیں:

اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے((کلیات:ص۱۳۹)

ایک عام قاری کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حیدر قریشی کا رویہ اپنی اہلیہ کی جانب حد درجہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہے۔اس حوالے سے ان کی ہر تحریر دردمندی اور احسان مندی کی کیفیت میں ڈوبی نظر آتی ہے۔حق سچ کی بات تو یہ ہے کہ بیوی کے حوالے سے یہ عمومی رویہ نہیں ہے۔یہ ایسا خاص الخاص رویہ ہے جو ہر کسی کو ارزانی نہیں ہوسکتا،اور کہیں نظر آ جائے تو حیرت ضرور ہوتی ہے۔اس نوع کی کیفیات کا صرف وہی شخص مکلّف ہوسکتا ہے جو ذہنی آسودگی سے مالا مال ہو اپنی شریکِ حیات کو زندگی کی مسرتوں اور ازلی خوشیوں کا محرکِ اول مانتا ہو۔حیدر قریشی کے فکری نظام میں اہلیہ کی علامت خوش بختی اور بے لوث محبت کا بلیغ اشاریہ ہے،اُنھوں نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور یہ عورت بیوی بھی ہوسکتی ہے۔حیدر قریشی کے اس خوب صورت ماہیے کے ساتھ بات تمام کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔

اظہار ضروری ہے
پیار اگر ہو تو
اقرار ضروری ہے(کلیات)

☆ فنی اور اُسلوبیاتی مطالعہ

حیدر قریشی کے خاکے پڑھ کر کہیں بھی یہ تاثر نہیں اُبھرتا کہ انھوں نے کسی شخصیت کی پیش کش میں مدلل مداحی سے کام لیا ہے۔وہ شخصیت کے ظاہر و باطن کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔شخصیت کے ممکنہ اہم اوصاف کو منکشف کرنا ہی ان کا اصل کمال ہے۔یہ اُن کا اُسلوبِ بیان ہے کہ شخصیت کی تازگی اور حرارت

پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔
منشا یاد اس ضمن میں بتاتے ہیں:

’’حیدر قریشی نے سچ کا دامن کہیں نہیں چھوڑا یہی وجہ
ہے کہ ان کی تحریر میں متاثر کرنے کی قوت ہے ان کا
خوبصورت انداز تحریر اسے اور بھی دل نشین بنا دیتا
ہے۔(۷۱) ‘‘

حیدر قریشی نے جو خاکے اہل خانہ کی نسبت سے تحریر کیے اس میں کہیں غیر ضروری محبت اور لگاؤ کا عنصر نظر نہیں آتا بلکہ ادب کے معروض پیمانوں کو ہر وقت سامنے رکھ کر خاکے لکھے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید نے درست لکھا ہے :

’’حیدر قریشی نے اپنے خون کے رشتوں کو ذرا فاصلے
سے دیکھا اور ان کی شخصیت کی وہ پرتیں ہمارے سامنے
پیش کیں جن سے اُن کرداروں کی فطری ہمدردی ،محبت
اور اُخوت کی تعمیر ہوتی ہے۔‘‘(۷۲)

خاکہ نگاری توازن کا فن ہے اگر یہ توازن برقرار نہ رہے تو صاحب خاکہ کی شخصیت اُبھرنے کے بجائے مسخ ہو جاتی ہے۔حیدر قریشی شخصیت کی پرکھ کے لیے معروضی اور موضوعی دونوں زاویوں کو اہمیت دیتے ہیں وہ بذات خود باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں اور اپنی عملی زندگی میں خلوص ،محبت اپنائیت اور دوستی کو خاص اہمیت دیتے ہیں، یہی تمام اوصاف ان کے خاکوں میں جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔حیدر قریشی کے اُسلوبیاتی محاسن پر بات کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر اُسلوب کی تعریف پر ڈال لی جائے ،ریاض احمد کے نزدیک:

’’اُسلوب تحریر کی اس صفت کا نام ہے جو ابلاغِ محض کی
بجائے اظہار سے مختص ہے۔ ابلاغ حقائق کی پیش کش
کا نام ہے۔اظہار اس کے مقابلے میں حقائق کے شخصی ،
ذاتی یا انفرادی تاثر کو پیش کرنے کا نام ہے۔ ابلاغ
موضوع کی منطق تک محدود رہتا ہے اور اظہار پوری
شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔‘‘(۷۳)

اُسلوب کی بحث میں مندرجہ فوق تمام نکات کی اہمیت اپنی جگہ اہم ہے لیکن نئی اور تازہ فکر کے ساتھ فکر و نظر کی گہرائی بھی منفرد اُسلوب کے بنیادی اوصاف ہیں۔ان تمام تناظرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حیدر قریشی کے اُسلوبیاتی محاسن پر بات کی جائے گی۔

(ا) شاعرانہ تخیل اور انداز بیان

حیدر قریشی کے خاکے پڑھ کر اُن کے ذاتی علم و مشاہدے کے رنگ و آہنگ کی آخری حدود کا احساس ہوتا ہے۔ان کا اُسلوب نگارش موضوع اور شخصیت کے مطابق نئے نئے رنگوں میں ڈھل کر اظہار و ابلاغ کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ کئی مقامات پر اُن کے باطن میں موجود شاعر نثری تحریروں میں بھی جھلک دکھا جاتا ہے۔حیدر قریشی کا شاعرانہ انداز بیان ان کے نرم لہجے کی نغمگی اور محبت کو ظاہر کرتا ہے یہ مثال ملاحظہ ہو۔

’’امی جی کی گائی ہوئی لوری کا ایک ایک لفظ الٹ ہوگیا
ہے۔ان کی اکھیوں کے تارے کی اپنی قسمت کا ستارہ ہی
کہیں گم ہوگیا ہے۔امی کے باغ کا البیلا پھول وقت
کے صحرا میں خود دھول ہو رہا ہے جس کے مکھڑے کے
آگے چاندنی میلی لگتی تھی اس کا رنگ روپ بگڑ چکا ہے۔
حالات ، تپتا ، دہکتا سورج سوا تیزے کے فاصلے پر آن
کھڑا ہے۔‘‘(۷۴)

یہ اقتباس ’’مائے نی میں کینوں آکھاں‘‘(امی جی) سے لیا گیا ہے۔حیدر قریشی نے اس خاکے میں کئی اور مقامات پر بھی والدہ کی محبت کا ذکر کرنے کے دوران شاعرانہ طرز نگارش اختیار کیا ہے۔اس کے علاوہ دوستوں اور اہل خانہ کے دیگر خاکوں میں بھی یہ اُسلوب بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) حقیقت نگاری

ڈاکٹر سلیم اختر کی پیش کردہ تعریف کے مطابق:

’’ادب میں فطرت ،افراد ، ماحول اور وقوعات کی تمام تر
جزئیات سمیت درست ترین تصور کشی کو حقیقت نگاری
قرار دیا جا سکتا ہے۔‘‘ (۷۵)

خاکہ نگاری میں شخصیت کی تصویر کشی کے دوران تخیل کی آمیزش ہو جاتی ہے لیکن حیدر قریشی نے اپنے ممدوحین کے حوالے سے ایسی کوئی بات نہیں لکھی جسے خلافِ واقعہ کہا جا سکتا ہو۔وہ شخصی زاویہء نظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حقائق کا کھلم کھلا اظہار بھی کر دیتے ہیں فیض احمد فیضؔ کے بارے میں یہ جملے ملاحظہ ہوں:

’’فیضؔ کم گو انسان تھے، کہتے ہیں کہ کم گو لوگ یا بہت
چالاک ہوتے ہیں یا بہت بے وقوف ،فیضؔ یقیناً ہوشیار
آدمی تھے فیضؔ بہت اچھے انسان تھے لیکن فرشتہ نہیں

تھے۔''(۷۶)

جاوید خان (جرمنی) لکھتے ہیں:

''جو بے ساختگی اور سچائی میں نے آپ کی تحریر میں پائی
ہے بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔''(۷۷)

حیدر قریشی نے اپنے اُسلوب میں حقیقت نگاری کا عنصر شامل کر کے اپنی تحریروں کو موثر بنایا ہے ان کا فطری اُسلوب نگارش شیریں انداز سے حقائق منکشف کرتا ہے۔

(۳) خیال افروزی

خیال افروزی کا شمار اُسلوب کی تخیلی صفات میں ہوتا ہے ''میری محبتیں'' میں تفکر اور خیال افروزی کی صفات تحریر کے حسن میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔کئی جملے تو ایسے مل جاتے ہیں جو اپنے سیاق وسباق سے ہٹ کر بھی دعوت فکر دیتے ہیں۔

۱۔ ''میرا خیال ہے انسان کی مظلومیت بجائے خود ایک طرح کا مقام ولایت ہے۔''(۷۸)

۲۔ ''ایک عذاب غربت کی وہ سطح ہے جو انسان کو دنیا کے جھوٹے خداؤں کے سامنے محتاجی کی ذلت کی حد تک گرادے۔دوسرا عذاب تکبر کی لعنت ہے۔ایسا تکبر جو ناحق دوسروں کو ذلیل کرائے۔''(۷۹)

ان مثالوں میں فکری اکائیوں کو الفاظ و معانی کی کلاسیکی دروبست کی بدولت پر اثر بنایا گیا ہے۔حیدر قریشی کے خاکوں میں خیال افروزی کا توازن متاثر کن ہے۔

(۴) اشعار کا استعمال

حیدر قریشی نے جس طرح اپنے تمام افسانوں کا آغاز طبع زاد اشعار کے ساتھ کیا ہے بالکل اسی انداز سے خاکوں کا آغاز بھی اپنے شعروں سے کر کے قاری کو دعوت فکر دی ہے کہ وہ متعلقہ شعر کی روشنی میں شخصیت کے باطن میں اترنے کا خود تجربہ کرے؛ مثلاً فیض احمد فیضؔ کے ساتھ ان کی محض چند گنی چنی ملاقاتیں تھیں اور کچھ خطوط کا تبادلہ ہوا تھا ،فیضؔ کے خاکے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

ؔ چند لمحے وہ ان سے ملاقات کے
میری سانوں میں برسوں مہکتے رہے (کلیات: ص۳۳۱)

میرزا ادیب پر یہ شعر خاموش محبت کو ظاہر کرتا ہے:

ؔ خاموشیوں کے لب پہ کوئی گیت تھا رواں
گہری اداسیوں کے کنول جھومتے رہے (کلیات: ص۳۲۸)

اپنی والدہ محترمہ پر جو خاکہ لکھا اُس پر یہ معنی خیز شعر سجایا ہے:

ؔ ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تیری ممتا کا ایک سایہ بچاتا ہے مجھے (کلیات: ص۲۸۱)

ان اشعار میں ان کہی باتوں کو سلیقے سے پیش کر دیا گیا ہے۔حیدر قریشی کے یہ شعری وسائل شخصیت کے اُن گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں جن کا اظہار شاید نثر میں ممکن نہیں تھا۔

(۵) طنز کا استعمال

حیدر قریشی کے خاکوں میں بعض مقامات پر طنز کی کاٹ خاصی گہری ہو جاتی ہے اُن کے یہ طنزیہ انداز زیادہ تر وہاں دیکھنے میں آتے ہیں جہاں ادبی گروہ بندی یا منافقت کو سامنے لانا مقصود ہو۔اُن کے طنز میں تلخی موجود ہوتی ہے جو اس امر کو واضح کرتی ہے کہ اُنھوں نے نہایت دکھ کی حالت میں ایسا طنز لکھا ہے۔

اکبر حمیدی کے خاکے ''بلند قامت ادیب'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مولوی عبدالحق سے محمد طفیل تک خاکہ نگاری کا ایک دور رہا ہے۔پھر یہ صنف ادیب نُما صحافیوں کے ہتھے چڑھ گئی،اُنھوں نے شخصیت کی خاک اڑانے کو ہی خاکہ نگاری سمجھ لیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے'' (کلیات: ص۳۴۵)

حیدر قریشی کی کتاب (میری محبتیں) سے طنز کی بیسیوں مثالیں نقل کی جا سکتی ہیں لیکن بخوفِ طوالت اُن سے گریز کیا گیا ہے۔خاکہ نگاری کا میدان اُسلوبیاتی حوالے سے وسعت کا حامل ہوتا ہے اور اس میں طنز ومزاح کا تال میل اچھا لگتا ہے لیکن انشائیے کی طرح اس صنف میں بھی طنزیہ اسالیب کا غیر ضروری استعمال ممنوع ہے،اگر بات شائستگی کے دائرے میں رہ کر کی جائے تو اُس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

....

(۱.۳) حیدرقریشی کی یادنگاری

حیدرقریشی نے اپنی تلخ وشیریں یادیں بیان کرنے کے لیے **''کھٹی میٹھی یادیں''** کے عنوان سے ایک الگ کتاب تصنیف کی اوراسے یادنگاری کا نام دیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ اپنی مرتب صورت میں اُس کلیات میں سامنے آئی جو **''عمرلاحاصل کا حاصل''** کے نام سے ۲۰۰۹ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعداس کتاب کو عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد نے الگ کتابی شکل میں چھاپ دیا تھا۔ یہ تازہ ایڈیشن ۲۰۱۳ء میں سامنے آیا۔ اِن یادوں کے پس منظر پرروشنی ڈالتے ہوئے حیدرقریشی کہتے ہیں:

> ''کھٹی میٹھی یادیں'' لکھنے کا سلسلہ میں نے ۱۹۹۶ء کے آواخر میں شروع کیا تھا۔
> پہلے یورپ میں ہی کہیں ادھر اُدھر چھپوانا چاہا،لیکن جلد احساس ہوگیا کہ اِنھیں
> پاکستان یاانڈیا کے کس ادبی رسالے می چھپوانا زیادہ مناسب رہے گا۔
> ۱۹۹۸ء میں انڈیا کے رسالہ ''گلبن'' (احمد آباد) میں اس کی پہلی قسط شائع
> ہوئی۔اس کے بارہ باب ''گلبن'' میں شائع ہوتے رہے۔چارباب
> ''عکاس'' انٹرنیشنل اسلام آباد میں اورباقی ''جدیدادب'' میں چھپتے رہے۔'' (۸۰)

اس سے قبل کہ **''کھٹی میٹھی یادیں''** کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''یادنگاری'' کے اصطلاحی مفہوم پر بات کرلی جائے تاکہ پیش آمدہ مباحت کی تفہیم میں آسانی رہے۔

(الف) یادنگاری کیاہے ؟

یادنگاری سوانحی ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں گزرے زمانے کے تجربات، مشاہدات اور واقعات کوازسرنوتازہ کیا جاہے۔ یہ خالصتاً شخصی اورنجی واقعات پر مشتمل بیانیہ ہوتا ہے جس کا مقصد اپنے دوستوں، عزیزوں اورقریبی رشتے داروں کی یادوں کو غیررسمی مگر ادبی سطح پر محفوظ کرنا ہے۔ یادنگاری عموماً زمانی اور منطقی ترتیب کے ساتھ لکھی جاتی ہے، لیکن یادوں کی یہ البم شعوری اور لاشعوری رو کے زیراثر بے ربط اور منتشر بھی ہوسکتی ہے۔ اُردوادب میں ''یادنگاری'' کی کس عارضی یا مستقل روایت کا سراغ نہیں ملتا البتہ انگریزی (دوسری زبانوں میں بھی اس کی موجودگی کا امکان غالب ہے) میں یادنگاری کے لیے ''Reminiscence'' کی جو اصطلاح استعمال

کی جاتی ہے اس کی روایت پرانی ہے۔ ایچ۔ جے ایسنک (H.J. Eysenic) اورسی ڈی فرتھ (C.D. Firth) نے تفصیلی معلومات فراہم کی ہے نیز علمِ نفسیات میں یادنگاری کی اہمیت واضح کی ہے۔
اس انگریزی کتاب کا نام "Reminiscence,motiviation and personality" ہے جسے لندن پلینم پریس نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا تھا۔

''یادنگاری'' اصل میں سوانحی ادب کی ذیلی شاخ ہے اور دیگر ادبی اصناف کی طرح اپنا الگ وجوداور شناخت رکھتی ہے۔اس کے کچھ اجزا خودنوشت سوانح اورخاکہ نگاری سے مناسبت رکھتے ہیں لیکن اپنے بنیادی اوصاف کے باعث اس کا ذکر جداگانہ صنف کےطور پر کیا جانا چاہیے۔
یادنگاری کا اُسلوبِ بیان عموماً بے تکلفی پر مبنی ہوتا ہے اورسوانحی ادب کی مانند یہ صنف بھی تاریخی، سماجی، ثقافتی، نفسیاتی، اخلاقی اور جمالیاتی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ یقیناً خوش آئند امر ہے کہ ادب کے علاوہ علم نفسیات میں بھی یادنگاری کو جوخصوص حاصل ہے اس کی وجہ سے جدید ماہرین نفسیات تحلیلِ نفسی کے ضمن میں یادنگاری کو بطور معاون تکنیک استعمال کرتے ہیں۔
یادنگاری کا دائرہ عمل خاصا وسیع ہے اوراس کا راست مطالعہ کرنے کی خاطر اگر اس صنف کو بہ اعتبارِ موضوع مذہبی، ادبی، تاریخی، سیاسی اورافسانوی شاخوں میں تقسیم کردیا جائے تو کئی مسائل اور مغالطّوں سے بچا جاسکتا ہے۔ادب کی تقریباً ہرصنف اپنے موضوع اور برتاؤ (Treatment) کے حوالے سے ان حصوں میں بآسانی تقسیم ہوجاتی ہے۔
ان تمام اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سوانحی ادب میں جس طرح روزنامچہ نگاری، مکتوب نگاری ،سفرنامہ نگاری، رپورتاژ نگاری، خاکہ نگاری اورسوانح نگاری کا تذکرہ کیا جاتا ہے اس طرح یادنگاری بھی اِنھی ادبی زاویوں کا ایک تسلسل یاتوسیع ہے۔اردوادب میں اگرچہ اس صنف کے فنی یا تکنیکی اُصولوں کی حدبندی پر کوئی واضح اشارے نہیں ملتے۔اُردو کی معروف ادبی اصطلاحاتی کتب بھی خاموش ہیں لیکن اس کے باوجود یہ صنف اپنا مستقل وجودرکھتی ہے۔

اُردوزبان کے برعکس انگریزی ادبیات میں اس صنف کوقبول عام کا درجہ حاصل ہے۔اور ''Reminscence'' کی اصطلاح بذات خود یہ دلالت کرتی ہے کہ یادنگاری کی صنف اپنے وجود کا کامل جواز رکھتی ہے۔انگریزی زبان میں اس عنوان کے تحت بیسیوں کتب منظرعام پرآچکی ہیں۔ ہندوستان میں کئی ادیبوں نے انگریزی زبان میں یادنگاری کے وقیع نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔
ایم.او۔میتھائی (M.OMathai) کی انگریزی کتاب "Reminiscence of the Nehru Age" بطورمثال پیش کیا جاسکتی ہے۔ایم او میتھائی ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہرلال نہرو کا اسسٹنٹ تھا۔اس نے

یہ خدمات ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۹ء تک سرانجام دیں، مذکورہ کتاب میتھائی نے ۱۹۷۸ء میں تصنیف کی جو کئی ایک وجوہات کی بنا پر متنازع فیہ حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے کچھ ایسے رازوں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جو توجہ طلب ہیں۔ یہ کتاب تقریباً غیر رسمی اُسلوب میں ہی لکھی گئی ہے اور اُن تمام یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے جو مصنف کے دل ودماغ پر نقش ہوگئی تھیں۔ کتاب کا اصل موضوع جواہر لال نہرو کی زندگی کا عکس دکھانا ہے لیکن اُسی عہد کی کئی اور معروف شخصیات بھی کتاب کی زنیت بن گئی ہیں۔مصنف خود بھی اس بات کا گہرا شعور رکھتا ہے کہ وہ کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہا بلکہ محض اپنی یادوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں وہ اس کتاب کی نوعیت اور تکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔:

"This book is not history or biography, but chatty stuff containing my reminiscences. No doubt it contains histroical and biographical data pertaining to a segnificant period of India's history".(81)

یہ مثال اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یادنگاری کے لیے جو انگریزی اصطلاح ''Reminiscence'' برتی جارہی ہے جو سوانح سے الگ پہچان رکھتی ہے۔ نیز اس دیباچے کے دو الفاظ ''Chatty Stuff'' یہ بھی دلالت کرتے ہیں کہ یادنگاری کا اُسلوب دوستانہ اور بے تکلفانہ ہوتا ہے۔ دیباچے کا یہ انگریزی حوالہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن یادنگاری کے بنیادی تصورات واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اُردو ادب میں یادنگاری کی پہلی باضابطہ مثال حیدر قریشی کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' ہے۔اس کتاب کے کچھ ابتدائی ابواب جب ہندوستان کے ادبی جریدے ''گلبن'' میں شائع ہوئے تو منزہ یاسمین (حیدر قریشی پر ایم۔اے اُردو کا مقالہ لکھنے والی محقق طالبہ) نے شاید عجلت میں ان تحریروں کو خودنوشت'' کا نام دے دیا تھا، اُن کا کہنا ہے:

> ''کھٹی میٹھی یادیں'' حیدر قریشی کی خودنوشت ہے اس
> میں حیدر قریشی نے اپنی زندگی کے یادگار لمحات کو قلم بند
> کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۸۲)

وہ مزید لکھتی ہیں:

> ''کھٹی میٹھی یادیں'' سے پہلے حیدر قریشی اپنے تخلیق کردہ خاکوں کی کتاب ''میری محبتیں''
> میں بھی اپنی یادوں کو بیان کر چکے ہیں لیکن ''میری محبتیں'' میں موجود یادوں کو نامکمل سمجھتے
> ہوئے حیدر قریشی نے اپنی خودنوشت ''کھٹی میٹھی'' ''یادیں'' کے عنوان سے لکھنے کا ارادہ کیا۔''(۸۳)

منزہ یاسمین کا یہ مفروضہ حقائق کے منافی ہے۔حیدر قریشی کی یادوں کا تعلق سوانحی ادب کی جس صنف سے لگا کھاتا ہے وہ خودنوشت سوانح ہرگز نہیں ہے بلکہ یادنگاری ہے۔خودنوشت کی ترتیب وپیش کش کا اپنا مخصوص طریقِ کار ہے

جو فنی اور تکنیکی حد بندیوں کے ساتھ اُبھرتا اور آگے بڑھتا ہے۔اس کے مقابلے میں یادنگاری شخصی تصورات پر مبنی آزاد منش صنف ہوتی ہے اور جو بات جہاں یاد آگئی اسے وہیں پیش کر دیا جاتا ہے۔جس طرح یادوں کا ذہین میں در آنے کا کوئی کلیہ قاعدہ مقرر نہیں ہوتا تقریباً اسی طرح یادنگاری بھی آزادانہ روش کے تحت وجود پذیر ہوتی ہے، البتہ اگر کوئی مصنف اِن یادوں کو ترتیب میں پیش کرنا چاہے تو اُس کی بھی کوئی خاص پابندی نہیں ہے۔حیدر قریشی کے ہاں ترتیب کا اہتمام ملتا ہے اور اُنھوں نے بذاتِ خود اپنی ان تحریروں کو یادنگاری کا نام دیا ہے اور کہیں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے یہ گمان گزرے کہ وہ کوئی خودنوشت سوانح لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ مقالہ لکھنے کے دوران میں نے حیدر قریشی سے بذریعہ ای میل استفسار کیا کہ وہ یادنگاری پر اپنی رائے کا اظہار کریں اُنھوں نے جواب میں لکھا:

> ''یادنگاری کا معاملہ یوں ہے کہ میں نے اسے الگ صنف کے طور پر لکھنا
> شروع نہیں کیا تھا۔میرے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ایک تو ایسے عزیزوں
> اور احباب کا تذکرہ کرنا جن کا خاکہ تو نہیں لکھ سکتا تھا لیکن میری زندگی میں
> ان کی اتنی اہمیت تھی کہ میری تحریروں میں ان کا تھوڑا بہت ذکر آنا چاہیئے تھا''(۸۴)

اور جہاں تک ان تحریروں کی صنف کا مسئلہ ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے حیدر قریشی اسی ای میل میں کہتے ہیں:

> ''مجھے یقین ہے ''یادنگاری'' کسی نہ کسی صورت میں پہلے
> سے ہو رہی ہے ، میرے ہاں نسبتاً مربوط ہو کر آ گئی
> ہے''(۸۵)

حیدر قریشی کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یادنگاری کا اپنا ایک واضح تصور ہے جسے وہ خودنوشت کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کر رہے تاہم اُنھیں یہ احساس بھی ہے کہ یادنگاری کی روایت اُردو میں پہلے سے موجود نہیں اور وہ پہلی مرتبہ اس صنف کو باضابطہ شکل میں سامنے لا رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> '' اگر خدانخواستہ یہ کس نئی صنف کی ابتدائی صورت ہے تب بھی مجھے نعوذ باللہ اس
> کا بانی یا موجد ہونے کا نہ کوئی دعویٰ ہے اور نہ کوئی شوق '' (۸۶)

لیکن زمینی حقائق یہی بتا رہے ہیں کہ یادنگاری کی صنف میں اُن کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' معلومہ حقائق کی حد تک پہلی باضابطہ کتاب ہے۔

(ب) ''کھٹی میٹھی یادیں''.... تعارفیہ

میرے پیشِ نظر اس کتاب کا وہ نسخہ ہے جو الگ کتابی صورت میں ۲۰۱۳ء میں ''عکاس'' انٹرنیشنل، اسلام آباد نے

شائع کیا ہے۔صفحات کی کل تعداد۲۶۴ ہے۔کتاب کا انتساب ’’آپی کے نام‘‘(حیدر قریشی کی بڑی ہمشیرہ) ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر تین شعر اور ایک ماہیا درج ہے۔نمائندہ شعر کچھ یوں ہے:

بہت سی بے نیازی اور اک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے (۸۷)

حیدر قریشی نے اس کتاب کو اکیس (۲۱) ابواب میں تقسیم کر کے مختلف عنوانات دیے ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی تفہیم، ترتیب اور حسن پر خوشگوار اثر پڑا ہے۔کتاب کے سرورق پر تصاویر اور اندرونی صفحات پر درج تاثرات کی موجودگی صوری اور معنوی خوبیوں کو اُجاگر کرتی ہے۔کتاب کے آخر میں ارشد خالد نے ’’حیدر قریشی شخص و عکس‘‘ کے تحت اُن تمام تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کتابوں اور مقالات کی تفصیل فراہم کی ہے جو حیدر قریشی نے تحریر کیے یا اُن پر لکھے گئے ہیں۔یہ اشاریہ اتنا جامع ہے کہ قاری کم وقت میں تمام ضروری معلومات حاصل کر لیتا ہے۔

(ج) کتاب کے ذیلی عنوانات

۱۔ بزمِ جاں
۲۔ ددھیال کے رشتہ دار
۳۔ کزنز
۴۔ پڑھنے سے پڑھانے تک
۵۔ بندۂ مزدور کی اوقات
۶۔ گراموفون سے سی ڈی تک
۷۔ اخلاقی قدریں اور ویاگرا
۸۔ دعائیں اور قسمت
۹۔ شوخیاں، بچپنا
۱۰۔ علتیں، علالتیں
۱۱۔ اَن دیکھے، پر جانے دوست
۱۲۔ ابتدائی ادبی زمانہ
۱۳۔ میری عمر کا ایک سال
۱۴۔ رپورتاژ: ماریشس میں عالمی اُردو کانفرنس
۱۵۔ ادبی کائنات میں رنگ

۱۶۔ رہے نام اللہ کا
۱۷۔ روح اور جسم
۱۸۔ چند پرانی اور نئی یادیں
۱۹۔ لبیک اللّٰھم لبیک
۲۰۔ زندگی در زندگی
۲۱۔ زندگی کا یادگار سفر

حیدر قریشی نے ’’عرضِ حال‘‘ کے نام سے جو دیباچہ لکھا اس میں اپنی تمام یادوں کا پس منظر مہیا کر دیا ہے۔

(د) ’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘: تجزیاتی مطالعہ

اس کتاب کے پہلے حصے ’’بزم جان‘‘ میں حیدر قریشی نے جرمنی آنے کا ابتدائی حال ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کیا ہے۔اُن کا اہل خانہ تقریباً اڑھائی سال پہلے جرمنی جا چکا تھا اور حیدر قریشی کو بعد میں وہاں جانے کا موقع ملا تھا۔ جرمنی کا آزاد ماحول اور انسان دوست قوانین نے فکر و نظر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔عورت کی آزادی پر بھی اُن کے تاثرات قدرے مزاحیہ اُسلوب میں اپنا جادو جگاتے نظر آتے ہیں۔یہ جملے ملاحظہ ہوں:

’’اپنے ہاں تو غالبؔ اس چار گرہ کپڑے کا افسوس کرتے
رہے جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا لکھا ہوتا
ہے۔ اِدھر مغرب میں اس تین گرہ کپڑے کی قسمت
پر رشک آتا ہے جو گرمیوں میں حسینانِ مغرب نے زیب
تن کر رکھا ہوتا ہے۔‘‘ (۸۸)

یورپ آنے کے بعد تمام قریبی دوستوں اور عزیزوں کی یادوں نے یلغار کر دی تھی جن کے ساتھ پاکستان میں اچھا برا وقت گزرا تھا۔ایسے تمام لوگوں کا تذکرہ حیدر قریشی نے از حد محبت سے کیا ہے۔کچھ مقامات پر احساس ہوتا ہے کہ جیسے خاکوں کے کردار اور واقعات کی تکرار کی جا رہی ہے یا اُنھی یادوں سے وابستہ دوسرے واقعات کو پھیلا کر پیش کیا جا رہا ہے۔پاکستان میں جس طرح اُنھیں روحانی واقعات کا سامنا کرنا پڑا تھا جرمنی آنے کے بعد بھی یہ تسلسل جاری رہا۔

حیدر قریشی کی قوتِ حافظہ بہت شاندار ہے۔وہ ابتدائی بچپن کے واقعات مع جزئیات سنانے پر قادر ہیں۔ ہر واقعہ اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ صفحے پر منتقل ہو کر قاری کے دل میں گھر کرتا چلا جاتا ہے۔اس کتاب کا وہ حصہ جس کا عنوان ’’کزنز‘‘ ہے اس میں حیدر قریشی نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا جو انھوں نے محض تین برس کی عمر میں مشاہدہ کیا تھا۔ یہ واقعہ اُن کے پسندیدہ ماموں پروفیسر ناصر کے حوالے سے ہے۔جب حیدر قریشی نے اپنی جوانی کے

عالم میں وہ واقعہ اپنے ماموں کو سنایا تو وہ خود حیران رہ گئے، اور اُنھوں نے بتایا کہ حیدر قریشی کی عمر اُس وقت تین سال کی تھی۔ حیدر قریشی کی یادوں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ بالکل ذاتی اور نجی تجربات اور مشاہدات کو ایسے شگفتہ اور پراثر اُسلوب میں بیان کرتے ہیں کہ قاری بذات خود غیر محسوس طور پر ان کے حسی تجربات کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اُن کی ذاتی خوشیاں اور کرب پڑھنے والے کا ذاتی کرب اور خوشی بن جاتے ہیں۔ یادوں کے بیان میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جب انفرادی تجربات اجتماعی روپ کے حوالے سے اُبھرتے اور ڈوبتے محسوس ہوتے ہیں۔ تمام یادیں زنجیر کی کڑیوں کی مانند ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور معصومیت کی داستان سناتی ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ قاری کو بتاتا ہے کہ کس طرح حیدر قریشی زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا اُسلوب سیکھتے رہے ہیں۔

کتاب میں ذاتی حالات کا تذکرہ دل کھول کر کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں جب اُن کی عمر صرف ۱۶ سال تھی اور میٹرک کا امتحان نیا نیا پاس کیا تھا جب اپنے گھر کے حالات دیکھے تو ملازمت کا ارادہ کر لیا، اور اپنے علاقے کی حیٔ سنز شوگر ملز میں ملازم بھرتی ہو گئے۔ اس نوکری نے کچھ وقتی خوشی ضرور مہیا کی لیکن پھر ایک مستقل روگ کی صورت عمر بھر ان کا پیچھا کرتی رہی۔ اسی نوکری کے دوران ان کے ذہن میں کچھ اس قسم کے خیالات پیدا ہو رہے تھے :

> ” عملی زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے بعد میرے
> اندر ناانصافی کیخلاف بغاوت کے خیالات پرورش پانے لگے
> تھے لیکن مجھے ایک خاص اخلاقیات، اور چند اصولوں کا پاس بھی تھا۔“ (۸۹)

شوگر ملز کی ملازمت نے سیاست کی جانب بھی راغب کر دیا تھا اور یوں یہ ملازمت مزدور یونین اور انتظامیہ کے مابین جھگڑوں میں دبتی چلی گئی اور زندگی کا اولین مقصد یہی قرار پایا کہ کسی طرح مزدوروں کو ان کی جائز مراعات حاصل ہو جائیں۔ حیدر قریشی نے ۱۹۷۹ء کے اُس اندوہ ناک واقعہ کا ذکر بھی کر دیا ہے جس میں جنرل ضیاء الحق نے کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے مزدوروں پر اندھا دھند فائرنگ کرا کر صد ہا بے گناہوں کو قتل کرا دیا تھا۔ غرض یادنگاری کا یہ سفر کئی ذیلی کہانیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے اور قاری یادوں کے اس تیز بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔

اس کتاب کا ہر صفحہ شوق کی آگ بھڑکاتا ہے اور ٹوٹتی اُمیدوں کے ساتھ اُمید کی شمع روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔ حیدر قریشی نے جب یادوں کے چراغ روشن کیے تو اپنی پسندیدہ عادات واشغال پر بھی تفصیلی معلومات فراہم کی ہے۔ مثلاً اپنے ذوق موسیقی پر بلا تکلف لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے پسندیدہ گلوکاروں کی فہرست میں محمد رفیع، لتا منگیشکر، مکیش، مہندر کپور، طلعت محمود، آشا بھوسلے، گیتا دت، ہیمنت کمار، کشور کمار، سمن کلیان پور، مبارک بیگم، منا ڈے اور پاکستانی موسیقی میں سلیم رضا، زبیدہ خانم، مہدی حسن، مسعود رانا، احمد رشدی، مالا، نسیم بیگم، مسرت نذیر اور

اسد امانت علی پسند ہیں۔ ”کھٹی میٹھی یادیں“ کے باب ”گراموفون سے سی ڈی تک“ میں حیدر قریشی نے نہایت دلچسپی اور فنی مہارت کے ساتھ موسیقی پر اظہار خیال کیا ہے۔ اگرچہ اُن کا شوقِ موسیقی گراموفون کے زیر اثر پروان چڑھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ آلات موسیقی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کے مطابق وہ خود بھی جدید چیزوں کے ساتھ وابستہ ہوتے چلے گئے۔

حیدر قریشی کی اس کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ یہاں ہر صاحب ذوق کی پسند کا سامان موجود ہے اور ہر شخص اپنی پسند ملحوظ رکھتے ہوئے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم نے اِنھی اوصاف کو مدِنظر میں رکھتے ہوئے لکھا ہے:

> ” اپنی کھٹی میٹھی یادوں کو حیدر قریشی نے عنوانات کے
> خوش رنگ اور مختلف پیمانوں میں بھر دیا ہے کہ ادب کا
> کوئی پیاسا جس پیمانے کی پیاس محسوس کرے پہلی سانس
> میں اُسی کو پی لے۔“ (۹۰)

اِن کھٹی میٹھی یادوں میں سبق آموز اور نتیجہ خیز واقعات کا ایسا سلسلہ ملتا ہے جو حیدر قریشی کے تخلیق عمل کے محرکات و اسباب کو بھی واضح کرتا ہے۔ یادوں کی یہ نیرنگی اور بوقلمونی اصل میں ان کی اپنی ہی ذات اور شخصیت کا پرتو ہے، یہ ان کی اپنی شخصی رنگارنگی ہے جو ان نثر پاروں میں حسن و جمال کے رنگ بکھیرتی ہے۔

☆ فکر و نظر کے زاویے

حیدر قریشی نے یہ کتاب بظاہر قلم برداشتہ لکھی ہے اس کے باوجود کئی مقامات پر ان کا تفکر فعال نظر آتا ہے۔ وہ واقعات کی تفہیم و ترسیل کے ضمن میں ان کی معنویت اور مقصدیت سے غافل نہیں رہتے۔ کرداروں کی تحلیل کے دوران اخلاقیات اور سماجیات کے حوالے سے بھی قاری کو فیض یاب کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

> (الف) ” مذہب کی ایک سطح عقائد اور فروعات
> سے تعلق رکھتی ہے۔ دنیا کے بیشتر مذہبی جھگڑے اسی سطح
> سے ابھرے اور خونریز فسادات کی حد تک گئے۔ مذہبی
> اختلافات اور فسادات کا یہ سلسلہ آج بھی دنیا بھر میں کسی
> نہ کسی رنگ میں چل رہا ہے۔ جبکہ مذہب کی دوسری اور
> اہم سطح روحانیت سے متعلق ہے دنیا کے ہر مذہب اور
> مسلک سے تعلق رکھنے والے کا دعویٰ ہے کہ صرف اسی
> کے مسلک پر عمل پیرا ہو کر خدا سے روحانی تعلق قائم کیا
> جا سکتا ہے۔“ (۹۱)

(ب) ''ہر مذہب کے دو پہلو ہیں۔ایک دانش والا
دوسرا دہشت والا۔ دانش والے پہلو میں دوسروں کے
ساتھ مکالمہ بلکہ ایک دوسرے کی تفہیم والے تقابلی مطالعہ
کا ظرف پیدا ہوتا ہے۔یہی پہلو آگے چل کر صوفیانہ
ریاضت کی طرف بھی لے جانے میں ممد ہوتا ہے۔جہاں
مختلف علوم ایک نقطے میں یکجا ہو جاتے ہیں۔اسی لیے
اپنے ظرف کی وسعت کے باعث مذہب کے اس پہلو
میں مکالمہ اور تقابلی مطالعہ سے کسی کو گھبراہٹ نہیں
ہوتی۔'' (۹۲)

محولا بالا دونوں اقتباسات کا تعلق مذہب کے ساتھ بنتا ہے لیکن وہ در پردہ اپنے اُس وژن کو واضح کر رہے ہیں جس کے تحت ان کی اپنی زندگی گزر رہی ہے۔ان باتوں میں باریک بینی، عمیق نظری اور دل کو گداز کر دینے والی سچائی پوشیدہ ہے۔حیدر قریشی کے لفظوں میں وہ گہری دانائی اور حکمت جھلکتی ہے جو زندگی کے عطر سے پھوٹتی ہے اور جہانِ معنی کا تازہ دریچہ وا کرتی ہے۔یہ جہانِ معنی پیچیدہ افکار اور گنجلک نظریات کا طلسم ہوشربا نہیں ہے، یہاں فکر و نظر کا بے ساختہ پن اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔جوگندر پال رقمطراز ہیں:

''حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز وہ چونکہ پورا منہ کھول کر
جی جان سے بات کرتا ہے اس لیے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے۔''(۹۳)

حیدر قریشی کا فطری رجحان سادگی اور سلاست کی طرف مائل ہے۔اُن کے ہاں مشکل سے مشکل جذبہ یا خیال واضح شعور کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔اِن یادوں میں مشاہدۂ حیات ہی نہیں مجاہدۂ حیات کا رس بھی ہے۔بیان میں ایسی روانی اور جوانی تبھی ممکن ہے جب لکھنے والا بحرِ حیات کا پختہ کار شناور ہو۔یادوں کا یہ سمندر محبت کے جواہر ریزوں سے بھرا ہوا ہے۔''کھٹی میٹھی یادیں'' فکریات کا عمدہ مطالعہ پیش کرتی ہیں۔اور بیسیوں جملے ایسے ہیں جو بغیر کسی پس منظر کے قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں،مثلاً:

''ہم لوگوں کی خرابی یہ ہوئی ہے کہ ہم گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح چند باتوں
اور نصیحتوں کو دہراتے رہتے ہیں لیکن ہمارا عمل کا خانہ یکسر خالی ہے۔''(ص ۱۷۴)
''بات ہم روح کی کرتے ہیں، دوڑتے جسم کی ضروریات کی طرف ہیں۔'' (ص ۱۷۹)
'' زندگی کے معاملہ میں دو جمع دو چار کی طرح کوئی دو ٹوک اور حتمی بات کہہ کر گزر جانا ممکن نہیں (۱۹۰)
'' روحانی تجربات کا مطلب یہ ہوا کہ اس بندے کو خدا سے پیار ہے

اور یہ اپنے رب کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔اس کے برعکس مغربی اسکالرز
جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت کر رہے ہیں،ان کا شمار اُن لوگوں
میں کیا جانا چاہیے جو خدا کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔''(ص ۱۷۹)

حیدر قریشی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اُن کی فکری بصیرت کتابی علم کی مرہون منت نہیں بلکہ سماج کی عملی ذمہ داریوں سے کشید ہوتی ہے۔ہمارے اُردو ادب میں ایسے دانشوروں کی کمی نہیں جو مستعار کتابی علم کی بدولت ہر کسی پر سکہ معتبری کرتے دیکھائی دیتے ہیں لیکن حیدر قریشی کا علمی اور فکری رویہ اصل میں اُن کے تخلیقی عمل ہی کی توسیع ہے۔

☆ **روحانیت سے لگاؤ**

حیدر قریشی کو تصوف اور روحانیت سے جو خاص لگاؤ ہے اس کا اظہار افسانہ نگاری، خاکہ نگاری اور سفر نامہ نگاری کے علاوہ یادنگاری میں بھی ہوتا ہے۔اس تصوف کا مدار اخلاص فی العمل پر ہے۔ان کی جملہ تحریروں کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا فکری جھکاؤ وحدت الوجود کی طرف ہے۔وہ خالق کائنات کو بجائے قال کے حال میں محسوس کرتے ہیں اور شریعت و طریقت میں کسی دوئی کے قائل نہیں ہیں۔حیدر قریشی کا صوفیانہ رویہ ایجابی ہے۔وہ تصوف کے انفعالی پہلوؤں کی مذمت کرتے ہیں اور اعلیٰ تصوف کو تمام مذاہب کی معراج تسلیم کرتے ہیں۔ان کے فکری نظام میں روحانیت اور تصوف کا اُسلوب متوازن اور تعمیری ہے۔
حیدر قریشی کرامات پر یقین رکھتے ہیں اور تمام کرامات کا سبب زبان و عمل کی پاکیزگی قرار دیتے ہیں۔روحانیت چوں کہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی تعبیر و تشریح ہر شخص اپنے فہم کے مطابق کرتا ہے۔لہٰذا حیدر قریشی نے اپنی کتاب کے باب ''روح اور جسم'' کے پہلے صفحے پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی ہے:

''اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق مختصر ترین عرض کرتا ہوں کہ
انسانی روح جب اپنے اصل مالک و خالق کی جستجو کا سفر
کرتی ہے تو یہ سفر روحانیت کہلاتا ہے خالقِ کائنات روح
اعظم ہے، ہم سب اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اس کی
طرف ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔'' (۹۴)

یہی خیالات شعری صورت میں اس طرح سامنے آتے ہیں:

اسی کے پاس تو جانا ہے لوٹ کر آخر
سو خوب گھومئے، پھریئے، رجوع سے پہلے
(۹۵)

حیدرقریشی کے فلسفہءروحانیت میں وہ آفاقی عنصر بآسانی دیکھا جاسکتا ہے جوان کی بات میں وزن پیدا کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’کوئی عام انسان اگر سچی لگن کے ساتھ خدا کی جستجو کرتا ہےتواس کی یہ جستجو ہی اس کی روحانیت ہے۔اس میں وہ جتنی ترقی کرتا جائے گا۔اتنا ہی روحانی طورآگے بڑھتا جائے گا ۔ روحانی مدارج طے کرنے کے لیے مختلف مذاہب کے ہاں مختلف طریقے ملتے ہیں میرا خیال ہے کہ طریق کارکوئی بھی اختیار کیا جائے۔اصل چیز یہ ہے کہ انسان کی جستجواورلگن سچی ہو۔‘‘ (۹۶)

یہ آفاقی نقطہءنظر اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتا ہے اگر روحانیت کو دوسرے عقائد ونظریات کی طرح چھوٹے چھوٹے تنگ خانوں میں بانٹ دیا جائے تو پھراس کی افادیت محدود بلکہ مشکوک ہوکر رہ جاتی ہے۔اصل میں صوفی اپنی ذات کے باطن میں بکھری سچائیوں اور گہرائیوں کی تعبیر کرتا ہے اور ذات وکائنات کے یکجا ہونے سے ہی حیات کا فلسفہ مکمل ہوتا ہے۔حیدرقریشی کا یہی طبعی میلان سماجی اور سائنسی علوم کے باطن میں چھپی اسی روحانی پہلوکو دیکھ لیتا ہے جو عام نظر سے مخفی رہتی ہے۔یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ’’میرا شروع سے یہی خیال رہا ہے کہ سائنس خدا کی نفی کرتے ہوئے اسی کی طرف جارہی ہے۔مذہب روحانی طور پراسی کی طرف سفر کراتا ہےاورادب بھی جمالیاتی سطح پراسی حقیقت عظمیٰ کی طرف سفر کرتا ہے۔‘‘ (۹۷)

حیدرقریشی کے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اپنا ایک مخصوص طرزفکر یافکری نظام موجود ہے جس کی مدد سے وہ اِدھراُدھر بکھری حقیقتوں کو پرکھنے کے بعد ایک وحدت میں پرودیتے ہیں۔وہ کائناتی مظاہر کوکُل کی شکل میں دیکھ کرحکم لگاتے ہیں اور یوں اس روحانیت کے ڈانڈے فلسفہ اور سائنس سے جا ملتے ہیں۔ان کے نزدیک ہر جزوکسی کُل کا حصہ ہے، اور جز میں کُل کا مشاہدہ ہی اصل روحانیت ہے۔حیدرقریشی نے اپنی روحانیت کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ قاری خودکوان تمام تجربات میں شریک سمجھتا ہے اور پیش کردہ واقعات اور مشاہدات میں پڑھنے والوں کی ذاتی دل چسپی بھی شامل ہوتی چلی جاتی ہے۔اُنھوں نے روحانی مشاہدات کہیں واضح انداز میں اور کہیں محض علامتی اُسلوب میں بیان کیے ہیں۔

اس کتاب میں روحانیت کا بیان حددرجہ وضاحت سے ہوا ہے۔کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ قاری کسی مقام پرکوئی اُلجھن یا ابہام محسوس نہیں کرتا ورنہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مابعدالطبیعیاتی عقائد ونظریات تحریر کو بوجھل اور بلکہ نا

قابل فہم بنادیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔چند مقامات پرتو یہ گمان گزرتا ہے جیسے مصنف معروضی اور منطقی استدلال کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے تاکہ اُس کا قاری عالمِ اسباب میں رہتے ہوئے روحانی لطف میں شامل رہے۔یہ تمام روحانی مسائل حیدرقریشی کے فکرونظر پر اچھوتا تناظر مہیا کرتے ہیں۔

☆ ادیبوں کا ذکر

حیدرقریشی کی زندگی کا بڑا حصہ علم ادبی سرگرمیوں کے لیے وقف رہا ہے۔پاکستان میں ان کا قیام اور پھر جرمنی میں مستقل سکونت نے علم وادب کے کتنے ہی نئے دراُن پروا کیے ہیں۔’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘ کا باب’’ادبی کائنات میں رنگ‘‘ادیبوں کے ذکر سے بھرا ہے۔جن خاص ادیبوں سے مراسم زیادہ رہےاُن کے نام کچھ یوں:

قرۃالعین حیدر، کشور ناہید، ڈاکٹر وزیرآغا، ڈاکٹر انور سدید، امرتا پریتم، بانو قدسیہ، عشرت آفرین (امریکہ) حمیدہ معین رضوی (لندن) نوشی گیلانی (آسٹریلیا) صفیہ صدیقی (لندن) ماہ طلعت زیدی، ثمینہ راجا، عذرا اصغر، کرشنا پال، جوگندر پال، ثریا شہاب، ڈاکٹر کرسٹینا (جرمنی) اولدک اسٹارک (جرمنی) ڈاکٹر لدمیلا (روس)، ڈاکٹر وسیم بیگم، شاہد ماہلی، صدیقہ بیگم، قمرعلی عباس، سیدہ حنا (پشاور)، نجمہ منصور، روشن آرا نزہت، راغب شکیب، پروین عاطف، ریحانہ قمر (امریکہ) افتخار نسیم (امریکہ) عباس تابش، عطیہ خان، رضیہ اسماعیل (انگلینڈ) پروین شیر (کینیڈا) فرحت نواز، اکبر حمیدی، اور بشریٰ ملک وغیرہم۔

محولہ بالا ادیبوں کی فہرست خاصی مختصر ہے۔اصل میں حیدرقریشی نے صرف اُنھی لوگوں کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے یادگار بن گئے ہیں۔ادیبوں کا یہ تذکرہ جہاں خالص لکھنے والوں کی تعریف وتوصیف سے مزین ہے وہاں ایسے جعلی ادیبوں کو بے نقاب بھی کرتا ہے جو دوسروں کو بھاری رقوم دے کر شعری مجموعے لکھواتے ہیں۔

حیدرقریشی کی یہ کتاب ایک ایسی مصدقہ تاریخی دستاویز ہے جہاں ادبی بدعنوانی پر سیر حاصل مقدمات پڑھنے کو ملتے ہیں۔گواس موضوع پر دوسرے ناقدین اور محققین نے بھی دل کھول کر لکھا ہے لیکن حیدرقریشی نے سنی سنائی معلومات سے زیادہ عینی مشاہدات کوفوقیت دی ہے۔’’قلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید‘‘ والی بات یہاں عملاً دیکھی جا سکتی ہے۔حیدرقریشی نے معیاری ادب پیدا کرنے والوں کا ذکر حددرجہ ادب احترام سے کیا ہے اوران کے ادب پاروں کی تحسین کی ہے۔

☆ احباب کا ذکر

حیدرقریشی کا حلقہءاحباب نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاکِ کاشغر پھیلا ہوا ہے۔دوستوں کا یہ حلقہ جنس اور عمر کے تکلفات سے یکسر آزاد ہے’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘ایسے دوستوں کا تذکرہ بھی محفوظ کرتی ہے جن سے اُن کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔حیدرقریشی کہتے ہیں:

میری ادبی زندگی میں بہت سے دوست آئے۔ کچھ نے
چند قدم تک ساتھ نبھایا بعض سے لمبی دوستی نبھی۔ کس سے
نباہ میں میرا سلیقہ کام آیا تو کس سے نباہ میں اس کی اپنی
محبت کارگر رہی۔ ادبی دوستوں میں اَن دیکھے دوستوں
سے تعلق کی نوعیت عام دوستوں سے خاصی مختلف ہو جاتی
ہے۔، میرے بہت سے اَن دیکھے دوست ہیں لیکن یہ
میرے لیے اور میں ان کے لیے انجانا نہیں۔'' (۹۸)

ایسے اَن دیکھے دوستوں کی محفل میں سب سے پہلے ابن صفی کا ذکر آتا ہے۔ حیدر قریشی نے ابن صفی کی عمران سیریز کا مطالعہ ساتویں جماعت سے شروع کر دیا تھا، وقت گزرتا گیا اور تعلق کی نوعیت میں شدت آتی گئی۔ حیدر قریشی دنیائے ادب میں اپنی شناخت بنانے کے بعد کھلے دل سے یہ اعتراف کرتے ہیں:

''اگرچہ میری تحریریں اُن کے موضوعات اور میدان سے
بالکل الگ ہیں لیکن مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی
ہو رہی ہے کہ میری نثر پر کہیں نہ کہیں اُن کے اُسلوب کا
کوئی نہ کوئی اثر ضرور ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی سے
میرے جیسے سینکڑوں ادیبوں نے پڑھنے اور لکھنے کا سلیقہ
سیکھا ہے۔'' (۹۹)

یہ حیدر قریشی کی بڑائی ہے کہ اُنھوں نے کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابن صفی کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ اگلے مرحلے پر معروف ادیب امین خیال کا ذکر آیا ہے جو ماہیے کی تحریک کے سرگرم رکن رہے تھے۔ اُن کے ذکر کا حوالہ ایک اور نسبت سے بھی آیا ہے جس کا تذکرہ حیدر قریشی نے ان الفاظ میں کیا ہے :

''میری ادبی ترقی جتنی بھی ہے اور جیسی بھی ہے یہ میرے
دوستوں میں سے زیادہ امین خیال جی کی محبت، خلوص اور
دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'' (۱۰۰)

دوستوں کا ذکر دراز ہوتا ہوا احمد حسین مجاہد تک جا پہنچتا ہے جو ماہیے کی تحریک میں حیدر قریشی کے ہم نوا رہے اور ماہیے کے عروضی مسائل پر گراں قدر کام کیا ہے۔ ترنم ریاض کے ساتھ مراسم کی اصل وجہ ماہیا نگاری قرار پاتی ہے۔ اگرچہ وہ افسانہ اور نظم بھی لکھتی ہیں۔ دوستوں کے اس تذکرے میں ''شعر و سخن'' کے مدیر جان عالم کا ذکر بھی محبت بھرا ہے۔ جان عالم سے ان کے فکری مکالمے بھی چلتے رہے اور دوستی کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ حیدر قریشی

کہتے ہیں۔

''جان عالم سے دوستی میں فکری مکالمہ شروع ہوا۔ میں
حیران ہوں کہ جان عالم نے کم عمری میں ہی کتنا سفر طے
کر لیا ہے۔ یہ نوجوان روحانیت کی دنیا سے گزرتا ہوا
سوالات کی دنیا میں آ گیا۔ سوال اٹھتے رہے اور اس کی
جستجو بڑھتی رہی اور جان عالم کی جان یقین اور گمان کے
بیچ اٹکی رہی۔'' (۱۰۱)

قاری کو ان یادوں سے بہت کچھ مل جاتا ہے کیونکہ حیدر قریشی نے حد درجہ ذمہ داری کے ساتھ تمام شخصیات کے خصائص کو بھی اجاگر کر دیا ہے، جو یادوں کا حصہ بنتی چلی گئی ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ سچ بہر حال سچ ہے اور اس کا ظاہر ہو جانا اچھا ہے۔ وہ خود سے وابستہ تمام دوستوں کا نفسی اور فکری تجزیہ کرنے کے بعد اُن کی باطنی دنیا کو پرکھنے کی شعوری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جان عالم کے بارے میں ان کی تجزیاتی رائے اس امر پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے۔

یادوں کے اس گلستان میں ہر قسم کی دوستی کا پھول مہک رہا ہے اور حیدر قریشی نے رنگ و بو کی تخصیص کا پاس لحاظ کرتے ہوئے شخصی مطالعات پیش کیے ہیں۔ اُنھوں نے جن دیگر دوستوں کا ذکر کیا ان میں محمد وسیم انجم، سید ظفر ہاشمی (ایڈیٹر دوماہی ''گلبن'' احمد آباد)، ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر فراز حامدی، ڈاکٹر جمیلہ عرشی اور بشری رحمٰن شامل ہیں۔ آخر میں وہ اپنے ایک ایسے دوست کا ذکر اچانک کر دیتے ہیں کہ قاری پر وجد کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ اس قریبی دوست کے بارے میں حیدر قریشی کا بیان ملاحظہ ہو:

''کیا کوئی ایسے دوست کا تصور کر سکتا ہے جو کبھی سامنے
آ کر ملا بھی نہ ہو اور اپنے دوست کی خیر خواہی میں ماں،
باپ، بھائی، بہن، بیوی، بچوں، مخلص دوستوں سے بڑھ
کر خیر خواہ ہو۔ شاید آپ نے میرے اس بہت پیارے
دوست کو پہچان لیا ہے۔ جی ہاں یہ میرا خدا ہے! جو ہم
سب کا خدا ہے'' (۱۰۲)

اس دوست کا ذکر پڑھ کر انسان کا سر جھک جاتا ہے اور وہ گہری سوچ میں ڈوب کر حیدر قریشی کے اس شعر کا ورد کرنے لگتا ہے۔

ستم جو ہم پہ کیے اس نے بے حساب کیے
کرم بھی کرنے پہ آیا تو بے شمار دیا

(۱۰۳)

حیدر قریشی نے دوستوں کے تذکرے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ جو دوست جس مقام و مرتبہ کا حامل تھا اسے حزم و احتیاط سے اسے درجے پر فائز کیا ہے۔ دوستوں کی اس گہما گہمی کی وجہ سے پوری کتاب کا ماحول پُر رونق ہو گیا ہے اور قاری بے خودی کی حالت میں کتاب پڑھتا چلا جاتا ہے اور اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ یادوں کا یہ طلسم کدہ ختم ہو گیا ہے۔ حیدر قریشی نے ماضی کو کھرچ کھرچ کر یادوں کا جو میلہ لگایا تھا وہ اپنی یادوں کے نقش چھوڑ کر جا چکا ہے۔ میں تو اسے یادوں کی جنتری کہتا ہوں جو پرانی ہونے کے باوجود صدیوں تک کارآمد ہوتی ہے۔ اِن یادوں میں دھوپ چھاؤں کا مزہ ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہے۔ دوست اور دشمن کے باطن میں جھانکنے کے مناظر ہیں اور زندگی کے ایسے ایسے رنگا رنگ نظارے ہیں جو خوشی اور غم کی اضافی قدروں میں نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔

☆ حیدر قریشی کا اعتراف

''میں نے اپنے خاکوں اور یادوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ
سب سچ ہے۔ بیتا ہوا سچ، دیکھا ہوا سچ یا سنا ہوا سچ اور وہ
انکشافی سچ جو کسی تخلیق کار کو نصیب سے ملتا ہے'' (۱۰۴)

کتاب پڑھ کر اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ حیدر قریشی کی یاد نگاری نے اُردو ادب کو ایک نئی تخلیقی صنف کا تحفہ دیا ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کتاب کا مطالعہ ایک جہانِ معنی کی سیر کراتا ہے۔ فاضل مصنف نے یادوں کی جمع آوری کے دوران ادب کی اعلیٰ اقدار کو ہر لمحہ پیشِ نظر رکھا ہے۔

****

(۱.۴) انشائیہ نگاری

(۱.۴) حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری

حیدر قریشی کی تخلیقی جہت کا ذکر انشائیہ نگاری کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کے انشائیے مختلف ادوار میں معاصر ادبی رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے اور بعد ازاں تمام انشائیے ''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' (شعری اور نثری کلیات) میں یکجا نظر آتے ہیں۔ بحث کو مزید آگے بڑھانے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ کی تعریف، اصطلاح اور حدود پر بات کر لی جائے تاکہ موضوع زیرِ بحث کے تمام مقامات روشن ہوتے چلے جائیں۔

☆ انشائیے کا آغاز

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے:

''جدید تنقید میں غالباً انشائیہ وہ واحد صنف ادب ہے
جس کے بارے میں بڑے نزاعی نظریات اور جذباتی
مقالات لکھے جاتے ہیں۔ اس کی تعریف اور آغاز دونوں
پر لے دے ہوتی رہی ہے۔'' (۱۰۵)

یہ رائے حقائق پر مبنی ہے۔ آج سے تقریباً نصف صدی قبل جب ڈاکٹر وزیر آغا اور اُن کے قریبی رفقا نے اپنی بعض مخصوص تحریروں کو انشائیہ کہنا شروع کیا تو بحث و مناظرے کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور خوابِ جوانی کی مانند انشائیے کی بھی نت نئی تعبیریں سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس قضیے کی اصل وجہ یہ تھی کہ کچھ ناقدین انشائیہ کی اصطلاح کو مضمون کے ساتھ خلط ملط کر رہے تھے اور دبستانِ سرگودھا کے تخلیق کار اور ناقدین و محققین اس صنف کو مضمون اور مقالہ نگاری سے الگ صنف ثابت کر رہے تھے۔ اگر ان تمام نزاعی امور پر نظر کی جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انشائیہ جیسی نئی صنف پر بات کرتے ہوئے عدل و انصاف اور معروض حقائق و شواہد کو پس پشت ڈال کر محض جذباتی تنقیدیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انشائیہ کو اردو ادب میں قدم جمانے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔

جدید عہد میں انشائیے کی صنف پر نظر ڈالی جائے تو علم ہوتا ہے کہ تمام تر رکاوٹوں اور سازشوں کے باوجود اس صنف نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ تربیت انشائیہ نگاری پر کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد فعال ہو گئی ہے۔

☆ انشائیہ کی تعریف

ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

''انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار
اُسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا
مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ
انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے
مدار کو وجود میں لانے کامیاب ہو جاتا ہے۔'' (۱۰۶)

یہ تعریف منطقی اعتبار سے جامع و مانع ہے اور انشائیہ کے تمام اوصاف کو محیط ہے۔ انشائیہ کا اسلوب شگفتہ اور غیر رسمی ہوتا ہے اور طنز و مزاح کے عناصر اگر خاص اعتدال سے شامل ہوں تو اس کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس صنف کے لیے طنز و مزاح کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اس حوالے سے روشنی فراہم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'' دراصل اُسلوب کی شگفتگی یا اس میں طنز و مزاح کی
آمیزش کو انشائیہ کیلئے ناگزیر قرار دینا کسی صورت میں بھی
مستحسن نہیں ہے۔ انشائیہ میں طنز کی کاٹ یا مزاح کی
پھلجھڑی کا در آنا انشائیہ نگار کے خاص موڈ یا مزاج کا
رہین منت ہوتا ہے۔'' (۱۰۷)

انشائیے کے موضوعات عموماً ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور انشائیہ نگار اپنے زورِ تخیل اور شخصی زاویہ نظر اختیار کرتے ہوئے موضوع کے ایسے پوشیدہ گوشے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے جو اَب تک نظروں سے اوجھل تھے۔ انشائیہ نگار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چنیدہ موضوع کو معمولی یا غیر معمولی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

عام مضمون کے برعکس انشائیہ میں منطقی ترتیب کا فقدان ہوتا ہے اور اصلاح پسندی یا کسی خاص نقطۂ نظر کا پرچار کرنا اس صنف میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ انشائیہ نگاروں کے ضمن میں جو اختلافی مباحث منظر عام پر آئے اگر اُن کا غیر جانب داری سے محاکمہ کیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اکثر ناقدین انشائیہ کو مضمون ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں اور مضمون نگاری کے جملے اوصاف کو انشائیے میں بھی متحرک دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ بدیں سبب سرسید احمد خان کی ایسی تحریروں کو انشائیہ کہا جانے لگا جس میں پند و نصائح اور مقصدیت کے عناصر حاوی تھے۔

اکبر حمیدی اس صنف کے دیگر وصفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''انشائیہ نگار نئے عہد کی نئی زندگی کے نئے نئے رخ نئے انسان کے اظہاری

تقاضوں کا دور تک ساتھ دیتا ہے۔'' (۱۰۸)

انشائیہ کے فنی اور فکری اوصاف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف نثر ہے جو قاری
کو بیک وقت لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی
حظ مہیا کرنے پر قادر ہے اس لیے میں اسے امتزاجی
صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی
لطافت اور سفر نامے کا فکری تحرک یکجا ہو گئے
ہیں۔''(۱۰۹)

مسرت کا حصول انشائیہ نگاری کا وہ اہم مقصد ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے انشائیہ نگار کے پیش نظر رہتا ہے اور خیالات کی تعمیر و تشکیل میں اپنا جلوہ دکھا جاتا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو مونٹین (Montaine) کی پیروی کا عمل آج بھی جاری ہے۔

☆ حیدر قریشی کے انشائیوں کا تعارف

حیدر قریشی کے کلیات میں کل دس انشائیے شامل ہیں اور اس کتاب کا نام ''فاصلے قربتیں'' رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے اور جلد منظر عام پر آجائے گی۔

اپنی موجود شکل میں یہ کتاب کلیات کا حصہ ہے۔

☆ انشائیوں کا عنوان :

۱۔ خاموشی
۲۔ نقاب
۳۔ وگ
۴۔ فاصلے، قربتیں
۵۔ بڑھاپے کی حمایت میں
۶۔ اطاعت گزاری
۷۔ یہ خیر و شر کے سلسلے
۸۔ چشم تصور
۹۔ اپنا اپنا سچ
۱۰۔ تجربہ اور تجربہ کاری

انشائیہ نگاری میں عنوان کی اہمیت دوسری اصناف کی نسبت قدرے زیادہ ہے۔انشائیہ نگاری اور تحلیل نفسی میں یہ نکتہ قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے کہ دونوں میں کسی ایک عنوان کے گرد سوچوں کا پورا ہالہ تیار کرنا ہوتا ہے اور خیالات کا ربط یا بے ربطی دونوں کا اپنا اپنا جواز ہے اور ہر ایک کی اہمیت مسلمہ ہے۔اُردو، انگریزی اور فرانسیسی انشائیہ نگاروں نے عنوانات کا چناؤ زندگی کے ازحد عمومی پہلوؤں سے کیا ہے مثلاً بٹن، کمرہ، کھڑکی، سڑک، ایک درخت، صدائے بازگشت، اُداسی، آئینہ، کرسی، روشنی اور دیوار وغیرہ۔

حیدر قریشی نے انشائیہ نگاری کے تمام اہم لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس صنف پر توجہ دی ہے۔ان کے انشائیے جہاں اور بہت سے تکنیکی اور فکری اوصاف کے حامل ہیں وہاں اس بات کی گواہی بھی دیتے ہیں کہ وہ انشائیے کے مرکزی اور ضمنی وقوعات کے ردوقبول کا سلجھا ہوا شعور بھی رکھتے ہیں۔اُن کے انشائیے اختصار اور جامعیت کے اصول پر تخلیقی سفر طے کرتے ہیں۔مسائل کو علامت اور استعارے کی صورت میں متشکل کرنا اُن کا کمال ہے۔ذیل میں ان کی انشائی صفات پر تجزیاتی مطالعات پیش کیے جاتے ہیں۔

(ا) انشائیے کا ابتدائی شعر

حیدر قریشی نے اپنے ہر افسانے اور انشائیے کا آغاز ایک شعر سے کیا ہے، اس کا منطقی جواز یہی ہے کہ ہر شعر مرکزی موضوع پر مبنی ہے اور موضوع زیر بحث کی بہت سی اَن کہی باتیں شعر کی زبانی بیان ہو جاتی ہیں۔یہ تمام اشعار طبع زاد ہیں اور موضوع کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً انشائیہ ''نقاب'' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

حیدؔر بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر الٹیں تو آگے اور نقاب (۱۱۰)

یہ انشائیہ پڑھ چکنے کے بعد قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ جیسے حیدر قریشی نے اسی شعری مضمون کو پھیلا کر انشائیہ بنا دیا ہے یا انشائیہ کے موضوع کو سمیٹ کر شعر میں بند کر دیا ہے۔

انشائیہ ''وگ'' کا ابتدائیہ دیکھیے:

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدؔر
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے (۱۱۱)

انشائیہ ''یہ خیر و شر کے سلسلے'' کا شعر ملاحظہ ہو:

خیر اور شر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں
بھول اور توبہ کرتے سارے سانس بسر ہو جائیں
(۱۱۲)

غرض ہر شعر پیش کردہ صورتِ حال کا جامع مرقع ہے۔

(۲) تفکر کے عناصر

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''انشائیہ انسان کی ذہنی اور تہذیبی ترقی کے ایک مرحلے پر نمودار ہوتا ہے۔'' (۱۱۳)

یہی ذہنی اور تہذیبی ترقی انشائیے میں فکریات کے ایسے عناصر پیدا کرتی ہے جن کا مطالعہ حیات و کائنات کی تقسیم میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکری اکائیاں دھیمے سروں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔اگر کہیں تخلیقی رو میں سروں کی آواز اُونچی ہونے لگے تو انشائیہ نگار شعوری کاوش سے اُنھیں پھر سے دھیما بنا دیتا ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں، انشائیہ ''اطاعت گزاری'' میں کہتے ہیں:

''اطاعت گزاری کا جوہر نہ صرف بغاوت، سرکشی اور انحراف کے جذبات کو ختم کرتا ہے۔ بلکہ انسانی ذہن کو زیادہ سوچنے کے عمل سے روک کر اسے بہت سی مشکلات سے بھی نجات بخش دیتا ہے۔زیادہ سوچنے والے لوگ یعنی آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے والے لوگ، جب سوچتے ہیں تو بُرے بھلے میں حدِ فاصل قائم کر کے تعصب اور آویزش کو ہوا دینے لگتے ہیں۔'' (۱۱۴)

اس طرح کے فکری تصورات اور تجربات کا اپنا سیاق و سباق بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ اپنے سیاق سے ہٹ کر بھی سماجی المیے کی ترجمانی کر رہے ہیں۔اقتباس میں موجود تمام الفاظ سادہ و سہل نظر آتے ہیں لیکن ان میں فکری پیچیدگی موجود ہے جو قاری کی توجہ چاہتی ہے۔اگرچہ انشائیے کا مقصد تلخ آگاہی نہیں ہوتا اور نہ پڑھنے والوں کو کسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کرنا ہے۔اب یہ انشائیہ نگار کا کمال ہے کہ وہ اس صنف اور موضوع کے اندر چھپے ابعاد اور جہات کو کبھی سنجیدگی کبھی خوشی اور کبھی مسرت کے پیرائے میں کھولتا چلا جاتا ہے اور قاری اس تخلیقی بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔

انشائیہ ''فاصلے، قربتیں'' کا یہ جملہ خاص توجہ کا متقاضی ہے:

''قربت کی انتہا سے فاصلہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کو جنم دیتی ہے یہ کوئی فلسفہ نہیں حقیقت ہے'' (۱۱۵)

''تجربہ اور تجربہ کاری'' ایک ایسا انشائیہ ہے جس میں حیدر قریشی نے ''تجربہ'' کو ایجابی اور ''تجربہ کاری'' کو سلبی اوصاف کے ساتھ منسوب کیا ہے اور اپنے اس موقف کو منطقی استدلال سے مزین کر دیا ہے۔یہ جملے لائق توجہ ہیں:

(ا) ''تجربہ کاری کا یہ اُصول ہے کہ جو چیز اپنے مطلب اور فائدے

کے مطابق ہے وہی سچائی ہے باقی سب جھوٹ ہے‘‘ (۱۱۶)

(ب) ’’تجربہ کاری کا ہنر جاننے والوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے
واجبی علم کی خامیوں کو چھپا کر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کریں گے۔‘‘ (۱۱۷)

(ج)’’زندگی کے تجربات زندگی کو معصومانہ حیرت سے دیکھنے اور پھر اس کی
جستجو کے سفر سے عبارت ہیں۔ یہ حیرت اور جستجو اجتماعی نوعیت کی ہے،
کیونکہ اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے‘‘ (۱۱۸)

حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکریات کا ایک پورا نظام فعال ہے، اس نظام کا مرکز ومحور اخلاقیات پر استوار ہے جس میں ایک طرف تو نام نہاد پاکبازوں کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے اور دوسری جانب سماجی رویوں میں چھپے کذب وافترا اور منافقت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے لیکن تنقید کا یہ عمل صنف انشائیہ کے مزاج کو متاثر نہیں ہونے دیتا۔

(۳) اُصول اخذ کرنے کی صلاحیت

حیدر قریشی کے انشائیوں میں سچی، کھری اور جرات مندانہ باتوں کا سلسلہ در سلسلہ بیان ملتا ہے۔ یہ بیان قاری کے تجربات میں خوشگوار اضافہ کرتا ہے اور اسے کئی مقامات پر چونکاتا بھی ہے۔ ’’فاصلے قربتیں‘‘ میں شامل تمام انشائیوں میں ایک نمایاں وصف یہ سامنے آتا ہے کہ حیدر قریشی نے جن حالات و واقعات کو موضوع بنایا پھر اُنھی میں سے مخصوص نتائج اور اُصول اخذ کرتے ہیں یہ اُصول وہ ثمرات ہیں جو قاری کی فکری اور جمالیاتی تربیت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ ’’ اگر ہر شئے بے نقاب ہوتی تو کسی شے میں کوئی جاذبیت نہ رہتی۔ ‘‘ (۱۱۹)

۲۔ ’’ ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔‘‘ (۱۲۰)

۳۔ ’’ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہے اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئیے
نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔ ‘‘ (۱۲۱)

۴۔ ’’یہ وہ تجربہ کاری ہے جو اپنی عیاری کو مومنانہ حکمت اور دوسروں کی
دفاعی حکمت کو بھی مکاری قرار دیتی ہے‘‘(۱۲۲)

(۴) سماجیات پر نظر

حیدر قریشی نے اپنے تقریباً تمام انشائیوں میں زندگی سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات کو بہ اندازِ دگر پیش کیا ہے یہ تجربات ومشاہدات اگرچہ انفرادی سطح سے اُٹھتے ہیں لیکن فنی چابکدستی اور انشائی تخلیقی عمل کی بدولت اجتماعی رنگوں سے مالامال ہیں۔ کچھ رنگ ملاحظہ ہوں:

(ا) ’’یہ ڈپلومیٹس (امریکی) دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں لیکن

اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے بعض ملکوں میں نہ صرف بادشاہت کو
تحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ
کر کے فوجی آمریت بھی مسلط کر دیتے ہیں‘‘(۱۲۳)

(ب) ’’اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لیے دوسروں کی بدصورتی
کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے‘‘ (۱۲۴)

(ج) ’’سچے اطاعت گزار کا کمال یہ ہے کہ جو سانحہ اس کے اپنے گروہ کے ساتھ پیش آئے
اُسے تو وہ خدا کی طرف سے آزمائش اور امتحان قرار دیتا ہے لیکن اگر ویسا ہی سانحہ
بلکہ اس سے بھی کم تر کسی دوسرے گروہ کو پیش آئے تو پورے ایمانی جوش وخروش
کے ساتھ سے عذابِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے‘‘ (۱۲۵)

حیدر قریشی نے خود کو عالمی سطح پر بھی باخبر رکھا ہوا ہے اور اُن کی شخصیت کا یہ پہلو جہاں اُن کی باقی اصناف پر خوش گوار اثرات مرتب کر رہا ہے وہاں انشائیوں میں بھی اس کی جھلکیاں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہیں۔ مذکورہ بالا مثالوں میں عمرانی شعور اسی صفت کا زائیدہ ہے۔

(۵) سائنسی عناصر

حیدر قریشی سائنسی علوم کے حوالے سے طبیعیات میں خاص دل چسپی رکھتے ہیں اور اس شوق کی وجہ ڈاکٹر وزیر آغا کی دوستی قرار دی جاسکتی ہے۔ آغا صاحب کے اکثر قریبی دوست اسی مشترک شوق کے اسیر ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں اس شوق کا اظہار کیا ہے مثلاً اُن کا انشائیہ ’’چشمِ تصور‘‘ ایٹم کے جدید تصورات پر روشنی ڈالتا نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے ایٹم کی اندرونی ساخت پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

(ا) ’’ پہلے پہل کہا گیا کہ ایٹم مادے کا بلڈنگ بلاک ہے بعد میں اسی ایٹم کے
چالیس سے زائد پارٹیکلز دریافت ہوگئے۔ بات Quarks تک پہنچی مگر پھر اس کے
بھی مزید چھ کلرز سامنے آگے۔ Quarks سے ’’ہیڈرونز‘‘ بنتے ہیں‘‘ (۱۲۶)

(ب) ’’سائنس ابھی تک چھوٹی کائنات یعنی ایٹم کا کوئی انت تلاش نہیں کرسکی۔‘‘ (۱۲۷)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں سائنسی مسائل سے اُس وقت تعرض کیا جب وہ تخلیقِ کائنات پر غور وفکر کر رہے تھے۔ اس دوران وہ لاشعوری طور پر تخلیق اور ایٹم کے باہمی تعلق پر سوچنے لگ گئے۔ اُنھوں نے نظامِ شمسی اور کائنات کے دیگر مظاہر کو بلیک ہولز کے تناظر میں بھی سمجھنے کی سعی کی ہے۔

حیدر قریشی کا چشم تصور اگر ایک طرف سائنس کے جدید ترین نظریات سے روشنی حاصل کرتا ہے تو دوسری جانب جن، دیو، پریاں اور اُڑن کھٹولے اُن کے تخیلات کو مہمیز لگاتے ہیں۔ وہ ایک اور انشائیے ’’فاصلے،

قربتیں''میں جب تخلیقی امکانات کو زیر بحث لاتے ہیں تو Big Bang، پارٹیکل اور اینٹی پارٹیکل کے تصورات کو بھی اپنے موضوع میں سموتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تمام سائنسی حوالہ جات محض سائنسی معلومات فراہم نہیں کر رہے بلکہ کائنات کے اَسرار و رموز کو تخیل کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیّر نے جو بات انشائی اُسلوب کے حوالے سے کی تھی یہ اس کی عملی صورت ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

''انشائیہ نگار اُسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے مراد
یہ کہ وہ روایتی اور مروجہ اُسلوبِ اظہار کے لیے نئے
امکانات و سراغ لگاتا ہے۔''(۱۲۸)

سائنسی موضوعات عموماً اپنی خشکی اور معروضی صفات کی بنا پر ادب میں مشکل سے ہی جگہ بنا پاتے ہیں لیکن حیدر قریشی جیسے پختہ کار انشائیہ نگار اپنے جاندار تخیل کی بدولت ان میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

(۶) ادبی مشاہدات و تجربات

حیدر قریشی کی زندگی کا بڑا حصہ ادبی مصروفیات کے تابع ہے لہٰذا اُن کی تحریروں میں اس کا ذکر آجانا خلافِ توقع نہیں ہے۔ اُنھوں نے اپنے انشائیوں میں کچھ مقامات پر تلخ ادبی تجربات کا تذکرہ کومل سروں میں کیا ہے۔
ایک جگہ کہتے ہیں:

''دبیز نقاب جب کسی معقول انسان کی عقل پر پڑتا ہے تو
وہ عاشق زار بن کر محلے کے شرفا کے لیے متعدد مسائل
پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل
پر پڑتا ہے تو وہ بے سروپا نظمیں یا مضمون نما خط قسم کی چیز
یں لکھ کر اپنے آپ میں ایک مسئلہ بن جاتا ہے، شاہد
نفسیاتی مسئلہ!''(۱۲۹)

انشائیہ ''وگ'' میں جب بہروپ بدلنے والوں کا ذکر آتا ہے تو حیدر قریشی کا قلم خود بخود ادب کی جانب مڑ جاتا ہے:

'' ادب میں بھی ایسی کئی بہروپیئے پائے جاتے ہیں
۔کسی مال دار ادیب سے دولاکھ روپے کھا کر اسے ۲۵ ہزار
روپے کا انعام دلانے والے، مناسب حق الخدمت کے
طور پر کسی لُولے لنگڑے افسانے کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین
افسانہ قرار دینے والے۔'' (۱۳۰)

ایسے ادبی مسائل و عوارض کا پس منظر چاہے کچھ بھی ہو حیدر قریشی ان میں عمومیت کا رنگ بھر کر یارانِ نکتہ داں

کو صلاحِ عام کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ ان واقعات و تجزیات کی شمولیت کا ایک حسن یہ ہے کہ اصل موضوع کی مرکزیت کس مقام پر متاثر نہیں ہوتی اور حیدر قریشی انشائیے کی مرکزیت کو قائم رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں ایسی کر جاتے ہیں جو بادی النظر میں اصل موضوع سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں لیکن اصل موضوع کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ انشائی اُسلوب ہی کا وصف ہے کہ اس میں موضوع کی وسعت حسب ضرورت بڑھائی یا کم کی جاسکتی ہے۔ بقول حیدر قریشی:

جو پھونک دیں تو قیامت ہی اک اُٹھائے گا
چھپا ہوا کوئی ایٹم کا صُور خاک میں ہے (۱۳۱)

(۷) نفسیات، مشاہدہء باطن اور اخلاقیات

انسانی نفسیات اور مشاہدہء باطن سے حیدر قریشی کو جو غیر معمولی دلچسپی ہے اس کا اندازہ یادنگاری، خاکہ نگاری، افسانہ نگاری اور انشائیہ نگاری سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

'' بچپن میں ہم جوانوں کو دیکھ کر جوان ہونے کی تمنا
کرتے ہیں لیکن جوان ہوتے ہی بچپن کو یاد کرنا شروع
کر دیتے ہیں اس کے برعکس جوانی میں ہم آنے والے بڑ
ھاپے کے تصور سے ہی خوف کھاتے ہیں، لیکن بڑھاپا
آتے ہی ہم پر فکر و دانش کے ایسے انوار برستے ہیں کہ نہ
صرف بڑھاپے سے سارا خوف دور ہو جاتا ہے بلکہ
ہماری زندگی میں ہی بڑھاپا ہمیں بچپن اور جوانی ہمارے
بیٹوں اور پوتوں کی صورتوں میں دکھا دیتا ہے۔''(۱۳۲)

☆ نفسیاتی ژرف بینی کی یہ مثال بھی دیکھئے:

''انسانی چہرہ بجائے خود ایک نقاب ہے جس میں سے کبھی
کبھی اس کے اندر کا حیوان جھانکتا ہوا نظر بھی آجاتا ہے۔
اندر کا فرشتہ تو اکثر چہرے پر ہی ملتا ہے۔ کون ہے جو کسی
دوسرے انسان کو پوری طرح جاننے کا دعوی
کر سکے۔''(۱۳۳)

☆ مشاہدہء باطن کی مثال ملاحظہ ہو

''اطاعت گزاری، فرمانبرداری اور وفا شعاری ایک ہی حقیقت کے مختلف چہرے ہیں

اطاعت کا مادہ انسانی نفس کو سنگسار کر کے اس کی روح اور ذہن کو ہر طرح سے سبکسار کر
دیتا ہے، گویا اطاعت سے مراحل تصوف کا آغاز ہوتا ہے اور کمالِ اطاعت تک وہ
کامل صوفی بن جاتا ہے۔'' (۱۳۴)

حیدر قریشی کا تخلیقی وجدان سماج، افراد، وقوعات، حوادث اور انسانی مظاہر کے باطن میں چھپے اَسرار ڈھونڈ نکالتا ہے، جو عام نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ حیدر قریشی کے انشائیوں میں اخلاقیات کا عنصر خاصا نمایاں ہے اور بعض اوقات وہ ناصح کا روپ بھی دھار لیتے ہیں، یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک اچھے مرد کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی بیوی پر
قناعت کرے۔ دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں
سے دیکھنے کی بجائے اپنے اور اپنی بیوی کے مشترکہ تخلیقی
عمل میں مگن رہے اور اس طرح زندگی میں اضافہ کر کے
زندگی کی جنت کا نظارہ کرتا رہے۔'' (۱۳۵)

گو ان کے ہاں پند و نصائح والی گہری سنجیدگی تو نہیں پیدا ہوتی لیکن دبے لفظوں میں وہ کوئی نہ کوئی ایسا اخلاقی نکتہ ضرور بیان کرتے ہیں جو قاری کی فکری تربیت کا سبب بنتا ہے۔ حیدر قریشی قاری کے بنیادی عقائد کو مدنظر رکھتے ہوئے عمومی نکتوں پر بات کرتے ہیں تا کہ ہر شخص حسبِ توفیق ان سے مستفید ہو سکے۔ عقائد اور نظریات کا ہر نظام عمرانی شعور سے پوری طرح منسلک ہوتا ہے اور اس کی نشو و نما اور ارتقاء کا سلسلہ اس وقت مزید مستحکم ہو جاتا ہے جب حیدر قریشی جیسا قلم کار اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

حیدر قریشی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

''میری انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بہت بڑا حصہ ہے باقی
انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، مشتاق قمر اور
اکبر حمیدی مجھے اچھے لگتے ہیں شاید ان کے اثرات بھی میرے انشائیوں
میں ملتے ہیں۔'' (۱۳۶)

حیدر قریشی کا یہ اعتراف خاص اہمیت رکھتا ہے اور ان کے اثرات کا کھوج بھی بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے جن شخصیات کا حوالہ دیا ہے ان میں سے تین پر وہ خاکے بھی لکھ چکے ہیں جو ''میری محبتیں'' کے حصہ دوم میں بعنوان ''عہد ساز شخصیت'' (ڈاکٹر وزیر آغا) ''ایک ادھورا خاکہ'' (غلام جیلانی اصغر) اور ''بلند قامت ادیب'' (اکبر حمیدی) دیکھے جا سکتے ہیں۔ دبستان سرگودھا کے یہ تینوں ادیب انشائیہ نگاری کے حوالے سے اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ حیدر قریشی نے ڈاکٹر وزیر آغا والے خاکے میں ایک بار پھر اس بات کا اعتراف کیا :

''وزیر آغا نے انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔'' (۱۳۷)

اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدر قریشی کی زیادہ ملاقاتیں اور مکتوبی رابطے وزیر آغا سے رہے اور آغا صاحب صنفِ انشائیہ کے بارے میں جو بصیرت افروز نظریات رکھتے تھے وہ مجموعی صورت میں ان کے لیے بھی قابل قبول تھے۔

''فاصلے قربتیں'' میں موجود انشائیے جہاں ان مقتدر شخصیات کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں حیدر قریشی کی تخلیقی
صلاحیت اور سلیقہ شعاری کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے لکھا تھا:

''انشائیہ نگار اُسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے مراد یہ ہے کہ وہ
روایتی اور مروجہ اُسلوبِ اظہار کے نئے امکانات کا سراغ لگاتا ہے
کثرتِ استعمال سے جو تراکیب محاورے، استعارے اپنی چمک دمک کھو
چکے ہیں اُنہیں نئے سیاق و سباق میں پیش کرتا ہے اور اس عمل میں وہ روایت
کو نئی سطح تفویض کرنے کی انشائی ٹیکنک کے تابع رہتا ہے۔ اگر وہ اُسلوب کی
تازگی کو بروئے کار نہ لا سکے تو اس کا انشائی تخلیقی عمل سے گزرنا مشتبہ قرار پائے گا۔''
(۱۳۸)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں مذکورہ بالا تمام شرائط کا التزام بطریقِ احسن کیا ہے، اور ویسے بھی ان کا تعلق انشائیہ نگاروں کے اس دبستان کے ساتھ ہے جن کا شمار انشائیہ نگاری کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ یہ اُنھی کی تربیت کا فیض ہے کہ آج حیدر قریشی کا شمار اُردو ادب کے اہم انشائیہ نگاررں میں ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کے انشائیوں میں تخلیقی ذہانت نظر آتی ہے جو انشائیے کا اصل جوہر ہے فکر و نظر کی تازہ لہروں نے ان کا اِنشائی حسن برقرار رکھا ہے، عام باتوں سے فلسفیانہ نکات کا استخراج اور معمولی شئے کو غیر معمولی بنانا ان کے اُسلوب کا کمال ہے جو ہر کسی کو ارزانی نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی کے انشائیے تخیل اور خیال افروزی کا خوبصورت امتزاج ہیں۔

(۱.۵) سفرنامہ نگاری

(۱.۵) حیدر قریشی کے سفرنامے

حیدر قریشی نے کل دو سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ پہلا سفرنامہ عمرے کے حوالے سے ہے جسے معیار پبلی کیشنز، دہلی نے ۲۰۰۰ء میں ''سوئے حجاز'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ دوسرا سفرنامہ حج کا ہے یہ چونکہ ذرا مختصر تھا لٰہذا حیدر قریشی نے اسے الگ طبع کرانے کے بجائے ''سوئے حجاز'' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دیا ہے۔ ''سوئے حجاز'' کا نقشِ ثانی سرور اکادمی، جرمنی نے دسمبر ۲۰۰۴ء طبع کیا تھا۔ پاکستان میں اس ایڈیشن کی تقسیم کاری کی ذمہ داری میاں محمد بخش پبلی کیشنز، خانپور کے سپرد ہے۔ درج ذیل سطور میں ان دونوں سفرناموں کا فنی و فکری مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

(الف) عمرے کا سفر

میرے پیشِ نظر ''سوئے حجاز'' کا نقشِ ثانی ہے جس میں عمرے کا احوال سولہ ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ ابتدائیہ
۲۔ سات عمرے (۱ تا ۷)
۳۔ ارادے سے روانگی تک
۴۔ مکہ کے تاریخی اور مقدس مقامات
۵۔ دربارِ نبیؐ مدینہ منورہ
۶۔ دربارِ نبیؐ میں آخری دن
۷۔ مکہ مکرمہ میں آخری دن اور جرمنی واپسی
۸۔ کعبہ شریف سے متعلق چند ماہیے
۹۔ نعت شریف

حیدر قریشی نے یہ عمرہ اپنی زوجہ (مبارکہ) کے ہمراہ کیا تھا۔ ارضِ مقدس کا یہ سفر تیرہ دنوں پر محیط ہے۔ کتاب کے باب ''ارادے سے روانگی تک'' میں حیدر قریشی بذاتِ خود اس کی معلومات فراہم کرتے ہوتے کہتے ہیں۔

> ''پہلے السعودیہ ایئر لائن کا ٹکٹ خریدا۔ یکم دسمبر سے ۱۲
> دسمبر تک کا عمرہ ٹکٹ تھا۔'' (۱۳۹)

چنانچہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ سفر یکم دسمبر ۱۹۹۴ء میں شروع ہو گیا تھا جو بالآخر ۱۲/ دسمبر کو اختتام پذیر ہوا۔ ''سُوئے حجاز'' کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ حیدر قریشی عمرے کا سفرنامہ نہیں لکھنا چاہتے تھے اور اس کی کئی وجوہات تھیں جس کی وضاحت ''ابتدائیے'' میں ملتی ہے:

> ''اردو ادب میں دو طرح کے سفرنامے لکھے جا رہے ہیں
> بہت اچھے اور بہت بُرے۔ سفرنامہ نگاری کے ایسے
> ماحول میں میرا سفرنامہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ
> میں اچھے سفرناموں کو پڑھ کر خود کو بے مایہ محسوس کرتا ہوں
> اور بُرے سفرنامے پڑھ کر عبرت پکڑتا ہوں۔'' (۱۴۰)

آپ مزید لکھتے ہیں:

> '' یکم دسمبر ۹۶ء تک جب مجھے عمرہ کی سعادت حاصل
> کرنے کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میرا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا
> کہ میں سفرنامہ لکھوں گا۔'' (۱۴۱)

آگے چل کر سفرنامہ لکھنے کے محرکات بھی بیان کر دیئے:

> '' یہ سفر میرے لیے صرف ایک سفر اور مذہبی فریضے کی
> ادائیگی نہ رہا۔۔۔۔ میں نے جسمانی سطح پر سفر کرنے کے
> ساتھ فکری اور روحانی طور پر بھی سفر کیا، پھر اس مختلف
> الجہات سفر کو کسی ایک نقطے پر یک جا ہوتے بھی محسوس
> کیا۔ سو یہ اسی روحانی تجربے کی شدت تھی جس نے مجھے
> یہ سفرنامہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔'' (۱۴۲)

حیدر قریشی کا یہ سفرنامہ کچھ اس لیے بھی دل چسپی کا حامل بن گیا ہے کہ انھوں نے ازاول تا آخر قاری کو ہر قسم کی باطنی اور ظاہری تبدیلیوں سے باخبر رکھا ہے۔ اُنھوں نے شاید یہ شعوری کوشش کی ہے کہ قاری کی ضروریات کا خاص خیال رکھا جائے اور اُسے ہر ایسی بات سے باخبر رکھا جائے جو اُس کی دل چسپی قائم رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدر قریشی کے سفرنامے میں کہانی پن کا عنصر پیدا ہو گیا۔ حج اور عمرہ کے سفرنامے عموماً سپاٹ انداز میں لکھے جاتے ہیں۔ اب ہر کوئی ممتاز مفتی کی طرح جرات اور بیباکی سے حج کا سفرنامہ نہیں لکھ سکتا!

ممتاز مفتی کا سفرنامہ حج (کچھ لوگوں نے اسے رپورتاژ بھی کہا ہے) روایتی سفرنامے کو ایک نیا اور اُچھوتا موڑ عطا کرتا ہے۔ اس میں باطنی کیفیات کو ایک نئے انداز اور نئے اسلوب میں پیش کرنے کی سعی ملتی ہے، حیدر قریشی نے بھی

''سوئے حجاز'' میں عمرہ اور حج کے مشاہدات، محسوسات اور تجربات کو بڑی عمدگی سے محفوظ کیا ہے۔اس سفرنامے میں خیال انگیز تنقیدی بصیرت بھی نظر آتی ہے جو مصنف کے تخلیقِ عمل کا لازمی جز ہے۔اُنھوں نے جس دل جمعی اور تسلسل وانہماک کے ساتھ عربوں کے وژن اور سماجی رویوں کی تشریح وتوضیح کی ہے کی ہے وہ قاری کے لیے جاذبِ توجہ ہے

''سوئے حجاز'' کے اہم فنی وفکری عناصر درج ذیل ہیں۔

(۱) اشعار کا برمحل استعمال

حیدر قریشی بذاتِ خود شاعر ہیں اور اپنی تخلیقی نثر میں بھی شعروسخن کی محفل سجانا پسند کرتے ہیں۔افسانہ ہو یا خاکہ، یادنگاری ہو یا سفر نامہ نگاری حیدر قریشی کے طبع زادہ یا پسندیدہ اشعار اپنی جگہ بناتے چلے جاتے ہیں۔'' سوئے حجاز'' میں انتساب کے بعد اصل سفر نامے کا آغاز اُن کے طبع زادہ ماہیے سے ہوتا ہے:

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی (۱۴۳)

حیدر قریشی نے پہلا عمرہ مکمل کرنے کے دوران حجر اسود کو چومنے کا ذکر کیا ہے اور ساتھ بتایا ہے کہ اس افراتفری کے ماحول میں ایک دوسرے کو دھکے دے کر اور دھکے کھا کر حجرِ اَسود کو بوسہ دینا نصیب ہوا۔اس موقع کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں

'' قیامت کے دن بھی ایسی نفسانفسی ہوگئی، اگر وہاں بھی
میرے جیسے گنہگار اسی طرح منزلِ مراد پا گئے اور دنیا میں
جنت کے ٹھکیدار اور دعویدار ویسے ہی لائن حاضر رہ گئے تو
کیا ہوگا۔''(۱۴۴)

پھر یہ شعر درج کر کے بات مکمل کردی:

؎ رند بخشے گئے قیامت کو
شیخ کہتا رہا حساب حساب (۱۴۵)

جب زم زم کے کنوئیں پر پہنچے تو وہاں اُردو، انگریزی اور عربی میں زم زم کے الفاظ دیکھ کر حیران رہ گئے، حیرت کی وجہ یہ تھی کہ عربی میں وہاں '' بئر شراب'' کے الفاظ لکھے تھے۔اس موقع پر غالبؔ کا یہ شعر یاد آ گیا:

؎ رات پی زم زم پہ مئے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامہء احرام کے (۱۴۶)

اُردو کے علاوہ سرائیکی اور پنجابی کے اشعار اور مصاریع بھی ''سوئے حجاز'' کا حصہ ہیں، مثلاً جب وہ حطیم کعبہ کے مقام پر آئے تو خانہ کعبہ کی جانب منہ کر کے بیٹھ گئے اور اپنی اس کیفیت کو اس مصرع میں پیش کیا:

ع تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیں دسنا (۱۴۷)

''یعنی تمہارے سامنے بیٹھ کے رونا ہے لیکن اپنا دکھ تمہیں نہیں بتانا۔'' اس مصرعے میں ایک خاص کیفیت ہے اور کہنے والے کو بخوبی احساس ہے کہ میری حالت ہی میرا بیانیہ ہے، میں جس کے سامنے موجود ہوں وہ مجھ سے زیادہ میری حالت سے باخبر ہے۔اس ایک مصرعے میں محبت، عشق، محرومی، توقع اور ارمان کی ملی جلی کیفیات شامل ہیں اور حیدر قریشی نے محض ایک مصرع لکھ کر اپنی دلی کیفیت آئینہ کردی ہے۔

حیدر قریشی نے ''سوئے حجاز'' میں زیادہ تر طبع زاد اشعار درج کیے ہیں ان میں ایک نعت، آٹھ ماہیے اور سات متفرق اشعار شامل ہیں۔

نعت کے چند اشعار :

؎ اٹھ کر بیٹھ گئے جب آدھی رات ہوئی
پھر محرابِ تہجد میں ہر بات ہوئی
روح کا صحرا یوں نکھرا کہ چمک اٹھا
نورِ محمدؐ کی ایسی برسات ہوئی
حیدؔر اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے
نعت کہی تو ہے لیکن کب نعت ہوئی (سوئے حجاز: ص۱۰۴)

کعبہ شریف سے متعلق ماہیا:

کثرت کی زبانی ہیں
کعبہ کی دیواریں
وحدت کی نشانی ہیں (سوئے حجاز:ص۱۰۲)

''سوئے حجاز'' کے ایک مقام پر تصویروں کی شرعی اور سماجی اہمیت اور ممانعت پر بات کرتے ہوئے حیدر قریشی کہتے ہیں:

''بعض ''موحد'' قسم کی حکومتوں نے سرکاری کرنسی نوٹوں پر اپنی شاہانہ تصویریں
طمطراق سے چھپوا رکھی ہیں بس جہاں جی چاہے بت پرستی اور تصویر پرستی کی
مذمت کردیجئے اور جہاں جی چاہے اپنی نمائش پسند نفسانی خواہشات کی تکمیل
کے لیے جواز پیدا کرلیجئے،

ے براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنالیتی ہے تصویریں'' (۱۴۸)

ان اشعار میں کئی ایسی ان کہی باتیں آ گئی ہیں جو اگر نثری اُسلوب میں لکھی جاتیں تو قابل گرفت ہو سکتی تھیں۔ حیدر قریشی نے خوفِ فسادِ خلق کی خاطر اپنے جذبات واحساسات کو شعری زبان میں سلیقے سے بیان کر دیا ہے۔

(۲) فکری عناصر

حیدر قریشی کو فلسفیانہ جستجو اور سماجیات سے خاص دل چسپی ہے اسی لیے ان کی تحریروں میں فکریات کی اکائیاں مناسب تناسب سے موجود رہتی ہیں۔ ''سوئے حجاز'' میں یہی فکری عناصر قاری کو متاثر کرتے ہیں، مثلاً احرام کے حوالے سے ان کے تجزیات خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

''احرام کو ارض حجاز کے قدیم ثقافتی حوالے سے دیکھیں تو اس کا اَن سلا
ہونا مکمل برہنگی اور مکمل لباس کی درمیانی کڑی قرار پاتا ہے۔ اسلام نے
مکمل برہنگی کی ممانعت کر دی لیکن مکمل لباس پہنچے سے بھی روک دیا اور
دونوں کے درمیان والے رستے یعنی اَن سلے احرام کی چادروں کو پسند فرمایا۔'' (۱۴۹)

حیدر قریشی نے احرام کے روحانی اور ثقافتی پہلوؤں پر قدرے منفرد انداز سے سوچا ہے جو پڑھنے والوں کو مزید تفکر کی دعوت دیتا ہے۔

کتاب کا وہ حصہ جو پہلے عمرے کے بارے میں ہے اس میں حیدر قریشی نے خدا کے دو اہم تاریخی تصورات پر قلم اٹھایا ہے، جن کا تعلق خدا کے تصورِ انوار پرستی اور ارض پرستی کے ساتھ ہے۔ سفر نامہ نگار نے دونوں کا محاکمہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''اسلام نے اللہ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہہ کر اسے
روشنی کے عام مظاہر سے ارفع قرار دیا، دوسری طرف
بت پرستی کو ختم کر کے خانہ کعبہ کو زمینی مرکز بنا دیا، یوں
اسلام نے انوار پرستی اور ارض پرستی کے مروجہ تصوارت
سے ہٹ کر ایسا معتدل تصور عطا کیا جو خالقِ کائنات کے
بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کرتا ہے۔'' (۱۵۰)

حیدر قریشی نے خدا کی ذاتِ باصفات کے حوالے سے جو باتیں لکھی ہیں وہ بظاہر بہت سادہ نظر آتی ہیں لیکن اگر اُن پر غور کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کے بارے میں ایسے تمام دلائل یا تصورات جن کا تعلق کونیات، غایت، وجودیات یا اخلاقیات سے بنتا ہے اور جس کی رو سے ذات باری تعالی کا ایک میکانکی تصور اُبھرتا ہے اُن کی نفی

کر دی ہے اور اس کے برعکس خدا کے اس ارفع تصور کو نمایاں کیا ہے جو قرآنی تعلیمات کا عطا کردہ ہے اور خدا کے بارے میں ہمارے تمام تصورات کو راست سمت رکھتا ہے۔

حیدر قریشی نے خالق کائنات کو اس کے کلام ہی سے اخذ کیا ہے کیوں کہ ہمارے لیے کلام الٰہی سب سے پہلی اور آخری دلیل ہے۔ خدا کو ہم کائناتی مظاہر سے ماورا ہو کر سمجھیں گے تب بات بنے گی۔ حیدر قریشی تصورِ توحید کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''میں اُن رسومات اور افعال کو بھی اچھا نہیں کہتا جن سے
شرک کا واضح اندیشہ ہو۔'' (۱۵۱)

یہ توحید کا وہ کامل تصور ہے جو خدا کو کائنات کی واحد خود مکتفی ہستی ثابت کرتا ہے۔ ہماری کئی سماجی اور ثقافتی رسومات مثلاً قبر پرستی، مزار پرستی یا وسیلہ پرستی نے ہمارے شفاف ذہنوں کو اتنا پرگندہ کر دیا ہے کہ ہمیں اپنے شرک کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی نے اُس خالص دینی تصور کو عام کرنے کی سعی کی ہے، جو خدا کو علیمِ مطلق، قادرِ مطلق، ہمہ جائی و مکمل اور ایک مطلق روحانی وجود کے سامنے لاتا ہے۔ یہ خالصتاً الٰہیاتی مسائل ہیں جنھیں حیدر قریشی نے عام فہم پیرائے میں بیان کر دیا ہے ''سوئے حجاز'' کی انھی خوبیوں کی بدولت اکبر حمیدی نے یہ رائے دی ہے:

''یہ سفر نامہ ایک روحانی سیر ہے مگر اُسلوب اور ناقدانہ نظر
ایک باشعور ادیب کی ہے۔ یہ ادبی زبان میں لکھا ہوا
روحانی سفر نامہ ہے۔'' (۱۵۲)

منزہ یاسمین نے بھی ''سوئے حجاز'' کے فکری اوصاف کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

''سفر نامہ ''سوئے حجاز'' جہاں حیدر قریشی کے احساسات
اور خیالات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے وہاں اپنے
قارئین کے لیے اہم تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزینہ
بھی ہے۔'' (۱۵۳)

''سوئے حجاز'' میں فکری عناصر کی رنگارنگی پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے اس میں لوگوں کے رویے، معاملات، مسافروں سے برتاؤ۔ اور مقدس مقامات کے حوالے سے عربوں کا طرزِ عمل سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ تمام باتیں سچی، کھری اور حقیقت پسندانہ ہیں اور ان لوگوں کے کام آ سکتی ہیں جو عمرہ یا حج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

(۳) تاریخی مقامات کی معلومات

اکبر حمیدی نے لکھا ہے:

''تاریخی اعتبار سے یہ سفر نامہ معلومات کا خزانہ ہے جس

کے گہرے مطالعے سے وہاں کے اہم مقامات کے
بارے میں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہے۔''
(۱۵۴)

اور ساتھ یہ اضافہ بھی کیا ہے:

''وقت گزرنے کے ساتھ ان مقدس مقامات اور ماحول
میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے بخوبی
معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں بعض تبدیلیاں تکلیف
دہ بھی ہیں۔'' (۱۵۵)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

''جبل الا بوقبیس کے ایریا میں بہت سارے اسلامی
تاریخی مقامات تھے مثلاً حضور اکرمؐ کا مقام پیدائش،
حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکان، حضرت حسان بن ثابتؓ،
حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور متعدد دیگر صحابہ کرامؓ کے
مکانات یہ سارے مقامات ضائع کر دیئے گئے ہیں۔''
(۱۵۶)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مقدس مقامات کا مصرف کیا ہے؟ اس ضمن میں حیدر قریشی ہمیں بتاتے ہیں:

''ایک طرف مکتبہ مکۃ المکرّمہ کے نام سے کتب خانہ بنا
دیا گیا ہے، دوسری طرف شاہی خاندان کے محلات میں
بعض مقام غائب ہو گئے ہیں، شاہی خاندان کے محلات
کے سلسلے میں تو کوہ صفا کا بہت سارا حصہ بھی لے لیا گیا
ہے۔ سعی کرنے والوں کے لیے تھوڑی سی کوہ صفا کی نشانی
چھوڑ دی گئی ہے جو ظاہر ہے شاہی خاندان کی خاص
مہربانی ہے۔'' (۱۵۷)

گویا قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید کے مصداق حیدر قریشی نے تاریخی مقامات پر بات کرتے ہوئے دل کی بات بھی کر دی ہے۔ اُنھیں اس بات کا شدید دکھ ہے کہ سعودی حکومت نے عہد رسالتؐ کی تقریباً تمام بڑی بڑی یادگاریں ختم کر دی ہیں۔ مکہ کے ایک اور تاریخی مقام کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ہوٹل سے قریب ترین مقام ''شبیقہ'' تھا۔ یہ وہ خوفناک قبرستان ہے
جہاں زمانہء جاہلیت میں کفار مکہ اپنے گھر میں بیٹی پیدا ہونے پر غیرت کا مظاہرہ
کرتے ہوئے اُسے یہیں لا کر زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔'' (۱۵۸)

حیدر قریشی نے یہاں معلومات فراہم کرنے کے بعد اُنھی لوگوں سے اپنا قلبی اور تہذیبی رشتہ اُستوار کرتے نظر آتے ہیں، تجربے کی حساسیت اور مشاہدے کی گہرائی نے جہاں سفر نامہ نگار کو افسردہ کیا وہاں قاری بھی یہ سطور پڑھ کر غم زدہ ہو جاتا ہے:

''اس وقت اچانک مجھے ایسے لگا ہے جیسے ان سفاک
لوگوں سے میری بھی کوئی دور کی پرانی رشتہ داری ہے۔
شاید اسی لیے مجھ سے ایسا شعر ہوا ہے:
اس کی چیخوں کی صدا آج بھی آتی ہے مجھے
میں نے زندہ ہی تیری یاد کو دفنا دیا تھا (۱۵۹)

حیدر قریشی نے خاموشی، حیرت اور صدمے کی کیفیات کی تجسیم کر کے اپنے سفر کو تخلیقی ترفع عطا کیا ہے
''سوئے حجاز'' کے حصہ اول میں ایک باب ''بعنوان مکہ کے تاریخی اور مقدس مقامات'' اِنھی اُمور کے لیے وقف کیا ہے۔ اس باب کے کُل گیارہ صفحات ہیں لیکن اس کے باوجود قاری کو جنت المعلیٰ، مسجد الفتح، مسجد علیؓ، جبل الا بو قبیس، شعب ابی طالب، غارِ ثور، میدانِ عرفات، مسجد نمرہ، جبل الرحمت، مزدلفہ، مسجد مشعر الحرام، وادی محسر، جبل الا بابیل، مسجد الکوثر، غارِ حرا اور مسجد الناقہ کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔

(۴) تصوف کے عناصر

''سوئے حجاز'' میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''تصوف میرا پسندیدہ موضوع ہے صوفیا اور فقیروں سے محبت اور عقیدت رکھتا ہوں۔''(۱۶۰)

حیدر قریشی کو دین سے جو لگاؤ ہے وہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن تصوف بھی ان کی عملی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ تصوف میں ان کا مسلک خانقاہیت نہیں بلکہ اجتماعیت ہے وہ تصوف کو زندگی کی حرکی قوت سمجھتے ہیں اور دنیا تیاگ دینے والی روحانیت اور تصوف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اُن کا تصوف مجاہدہ اور مشاہدہ پسند ہے دین کے ٹھیکیدار اور ظاہر پرست اُنھیں متاثر نہیں کر سکتے۔

وہ کہتے ہیں:

''جبہ و دستار والے بہروپیوں کے مقابلے میں صوفی کی
عظمت اس کی عاجزی اور نیا زمندی میں ہوتی

ہے۔''(۱۶۱)

صوفیائے کرام سے ان کے لگاؤ کی وجہ یہ ہے:

''دوسروں کو عاجزی اور انکساری کی تلقین کرنے والے
متکبروں کے مقابلے میں صوفی اور فقیر لوگ خود انکساری
اور عاجزی کی جیتی جاگتی مثال ہوتے ہیں۔'' (۱۶۲)

''سوئے حجاز'' میں جگہ جگہ پر روحانی اشارے اور کنائے نظر آتے ہیں لیکن حیدر قریشی جب روضۂ رسولؐ کی زیارت کرنے مسجد نبویؐ پہنچے اور اُسطوانہ تہجد میں نفل ادا کرنے کے بعد مسجد نبویؐ کو آنکھ بھر کر دیکھنا شروع کیا تو معاً اُن کی نظر اصحابِ صفہ کے اس چبوترے پر پڑی جہاں دینِ اسلام کے اولین صوفیائے کرامؓ تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ اُن کے ذہن میں پہلی بات تو یہ آئی:

''اسلامی تصوف کے ابتدائی نقوش اصحاب صفہ اور حضرت علیؓ تک ملتے ہیں۔'' (۱۶۳)

آخر اس نتیجے تک پہنچے:

''صوفیوں کے ڈیروں پر اللہ، محمدؐ اور علیؓ کے ناموں کا ایک ساتھ دکھائی دینا بھی
کوئی صوفیانہ رمز ہی تھی۔'' (سوئے حجاز: ص ۷۶)

اس کتاب میں جہاں عمرہ و حج کے خارجی اُمور پر بات کی گئی ہے وہاں اس سفر کی برکات سے باطن کی سیاحت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ حیدر قریشی کا یہ سفر نامہ ذات و کائنات کی تفہیم کا ایک نیا در وا کرتا ہے۔

(۵) مذہب بیزار طبقہ کے بارے میں اُصولی موقف

حیدر قریشی نے اپنی تقریباً تمام تخلیقی اصناف میں لادین اور ملحد لوگوں پر بات کی ہے۔ اس کا مقصد پند و نصائح کی بجائے حقائق شناسی کی تربیت ہے۔ دنیا میں ایسے عقل پرست لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے روایتی مذہب سے بیزاری کا اعلان کرنے کے بعد لادینی کی بے مصرف زندگی بسر کر رہے ہیں، ایسے لوگ مذہبی معاملات میں یا تو خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا پھر مذہب سے وابستہ تمام اقدار، شعار، عقائد اور نظریات پر کڑی تنقید کرتے نظر آتے ہیں؛ بلکہ مذہب سے حاصل ہونے والی روحانی آسودگی کو بھی نفسیات کے تنگنائے میں لا کر بحث کرتے ہیں۔ ایسے عقلیت پرست اور تشکیک پسندوں کے بارے میں حیدر قریشی کا اپنا ایک خاص رویہ ہے۔ ''سوئے حجاز'' میں اُنھوں نے ایسے تمام لوگوں کے نظریات کی نفی کی ہے جو مذہبی فوائد و ثمرات کو نفسیات کی کارستانی خیال کرتے ہیں۔ اُنھوں نے پہلے تو یہ کہہ کر اپنا مؤقف واضح کیا:

''جو لوگ فیشن کے طور پر خود کو ملحد یا دہریہ کہلوا کر خوش ہوتے ہیں اور اس الحاد کو اپنی
دانشوری سمجھتے ہیں جبکہ یہ سب کچھ بے حد مصنوعی ہوتا ہے۔'' (۱۶۴)

پھر اعتدال پسندانہ رائے کا اظہار کیا:

''اگر ایسے (مقدس) مقامات پر جا کر کسی کو ذہنی، قلبی اور
روحانی بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ اس کی حالت میں بہتر
تبدیلی آتی ہے تو خود جدید نفسیاتی امراض کا اگر اس
طریقے سے علاج ہوتا ہے تو اس سے مذہب سے لاتعلق
جدید علوم سے بہرہ ور ہمارے دانشوروں کو خوشی ہونی
چاہئے۔'' (۱۶۵)

''سوئے حجاز'' میں اس نوع کے فلسفیانہ مباحث کو جدید علوم وفنون کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش ملتی ہے۔ اس خوبی کے باعث یہ سفر نامہ موضوعاتی وسعت کی طرف جست بھرتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر حیدر قریشی چاہتے تو عمرے کے مناسک پر تفصیلاً لکھ کر صفحات بھر سکتے تھے لیکن ان کا فلسفیانہ تفکر زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل کا احاطہ کرتا چلا جاتا ہے۔

اکبر حمیدی کہتے ہیں:

''یہ سفر نامہ محض مذہبی حیثیت ہی نہیں رکھتا جو ہمارے
نزدیک نہایت قابلِ قدر ہے بلکہ ایک تاریخی اور علمی
حیثیت بھی رکھتا ہے، جو ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو
مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے جنہیں مذہب سے
زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔'' (۱۶۶)

اکبر حمیدی نے زیر بحث سفر نامے کے دیگر ادبی اور اُسلوبیاتی خصوص کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بھی کہی ہے:

''یہ سفر نامہ اپنے صفحات کے لحاظ سے طویل نہیں مگر معنی، معلومات، کیفیات،
تاریخی تعارفات اور پیش آمدہ مسائل و معاملات اور تیر مشاہدات کے باعث
بہت بسیط ہے دیوانِ غالبؔ کی طرح جو حجم میں قلیل ہے مگر معنی میں طویل۔'' (۱۶۷)

اکبر حمیدی کے یہ تجزیات اپنی جگہ گہری معنویت رکھتے ہیں۔ اصل میں ''سوئے حجاز'' کا ایک پہلو ذاتی اور انفرادی ہے اور دوسرا اجتماعی۔ وہ ذاتی سطح پر اپنی ذہنی کیفیات اور روحانی تغیرات پر بات کرتے ہیں، لیکن اجتماعی حوالے سے ان کے پیش کردہ خیالات کا رشتہ معاشرتی، ثقافتی سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ جڑتا ہے۔ ''سوئے حجاز'' کو محض کسی فرد واحد کا سفر نامہ سمجھ لینا مناسب نہیں بلکہ یہ ایک عہد کی تاریخ بھی ہے۔ سفر نامہ نگار کمال مہارت سے ماضی حال اور مستقبل کے حالات، تجزیات اور خدشات کا اظہار کرتا ہے۔ سفر نامے کے کئی

ایسے مقامات ہیں جہاں انھوں نے ناپسندیدہ حالات کا تذکرہ کیا مگر وہاں جذباتیت اور جوشیلا لب ولہجہ اختیار کرنے کے بجائے سنجیدہ، متین اور نرم آہنگ انداز میں دل کی بات کہی ہے۔ اُن کے اُسلوب کی یہی خاصیت قاری کے فکر ونظر میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ ڈاکٹر نذر خلیق ''سوئے حجاز'' کی معنوی خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سوئے حجاز'' کی فکری اور ادبی سطح کے علاوہ بھی کئی سطحیں ہیں ---- یہ سفرنامہ عصرِ حاضر کے سفرناموں میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ ۔۔اس سفرنامے میں بھی وہ تخلیقی جوہر دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' (۱۶۸)

اصل میں دین سے سچی وابستگی اور سادہ اندازِ بیان نے سوئے حجاز'' کا لطیف منظرنامہ تشکیل دیا ہے۔ جو ہر قسم کے قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۶) دل چسپی اور تاثیر کے عناصر

''سُوئے حجاز'' کی نمایاں خوبی اس کی دل چسپی اور تاثیر ہے، قاری جب ایک دفعہ اس کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو پھر لمحہ بہ لمحہ سفرنامے کی گرفت اس پر مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ واقعات ومشاہدات کا بہاؤ اسے کسی مقام پر ٹھہرنے کا موقع نہیں دیتا۔ حج وعمرے کے سفرناموں میں بالعموم مطالعہ پذیری (Readability) یا دلچسپی کا عنصر کم ہوتا ہے؛ کیونکہ اس میں لگے بندھے واقعات یکسانیت سے بیان ہوتے ہیں جس سے پڑھنے والا جلد اُکتا جاتا ہے''سوئے حجاز'' کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حیدر قریشی کے تخلیقی وژن نے سفرنامے کو روایتی سطح سے اوپر اٹھا کر نئے فکری جہات سے روشناس کرایا ہے۔ شگفتہ اور خوشگوار اندازِ نگارش نے تحریر کا لطف بڑھا دیا ہے۔ عرب تہذیب وثقافت پر ان کی برجستہ آراء اور مشاہدات نے سفرنامے کے تاثر اور تاثیر کو گہرا کر دیا ہے۔

حیدر قریشی کو اگر کسی مقام پر تلخ تجربات سے گزرنا پڑا تو اس کا ذکر بھی ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ کیا ہے۔ اور ان تلخیوں کے پس پردہ دیگر فکری پہلوؤں کو اس انداز سے سامنے لایا ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ''سوئے حجاز'' میں جذبات واحساسات کی ایک دنیا آباد ہے لیکن جذباتیت کا دور دور تک کوئی گزر نہیں۔ عرب معاشرے کی بے حسی اور مقدس مقامات پر ان کی سختیوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن وقتی اور ہنگامی رویوں سے باہر نکل کر تفکر کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو انھوں نے دل چسپی کا عنصر کسی حال میں کم نہیں ہونے دیا۔

عموماً حج اور عمرے کے سفرناموں میں وہاں کی جھلسا دینے والی گرمی اور ریگزاروں کا ذکر اتنی شد ومد سے کیا جاتا ہے کہ اصل موضوع کہیں بیچ ہی میں دب کر رہ جاتا ہے''سوئے حجاز'' میں کہیں بھی وہاں کی گرمی اور تپش کا ذکر نہیں آیا

بلکہ مکہ اور مدینہ کے حوالے سے جب بھی کسی مقدس مقام کا تذکرہ کیا اسے پڑھ کر دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ حرم شریف اور روضہ رسولؐ کی ٹھنڈک کا ذکر کر کے ہمارے دلوں کو گرمایا ہے۔ ''سوئے حجاز'' میں حیدر قریشی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے روحانی اسفار اور مشاہدات نے اتنا بے خود کر دیا تھا کہ موسمی حالات کی طرح اُن کی توجہ منتقل ہی نہ ہو سکی۔

''سوئے حجاز'' میں دل چسپی اور تاثیر کی موجودگی یہ مژدہ بھی سناتی ہے کہ حیدر قریشی کا اُسلوب نگارش علامت اور تجرید کے بجائے صاف شفاف بیانیے اور لطیف پیرائیہء اظہار کو فوقیت دیتا ہے، جس کے باعث تفہیم، تاثیر اور ترسیلِ معانی کے راستے ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حیدر قریشی نے سفرنامے کے کسی مقام کو بوجھل اور ثقیل نہیں ہونے دیا اور جہاں کہیں شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی دکھانے کا موقع ملا اسے بھی ضائع نہیں کیا، یہ مثال دیکھئے:

> ''میں زیارت روضہ رسولؐ کے بعد باہر آیا تو صبح کے پونے سات بجے تھے۔ مبارکہ عورتوں والے حصے سے ابھی تک باہر نہیں آئی تھی۔ پورے ایک گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا۔ اتنا طویل انتظار اور پھر وہ بھی بیوی کا ۔۔۔۔۔لیکن اس عمر میں تو بیوی کا ہی انتظار کیا جا سکتا ہے۔'' (۱۶۹)

حیدر قریشی کی یہ شعوری کوشش رہی ہے کہ ان کا سفرنامہ روایتی سفرناموں کی طرح محض عبادات کا اشاریہ نہ بنے بلکہ وہاں کی روزمرہ زندگی''سوئے حجاز'' میں بھی چلتی پھرتی دکھائی دے۔ اُنھوں نے سفرنامے کی مجرد روایت کو توڑا ہے اور زمان ومکان کی روایت میں رہتے ہوئے جدید سفرنامے کو فروغ دیا ہے۔ اس سفرنامے میں ایک تخلیق کار کا رچا ہوا شعور اور مذاق ملتا ہے جو قاری کے بصری عمل کو دورانِ مطالعہ فعال رکھتا ہے۔

حیدر قریشی نے''سوئے حجاز''میں ان صاحبانِ اختیار کے بے حس رویوں کو بھی زیر بحث لایا ہے جو نفسا نفسی کے اس دور میں عمومی شکل اختیار کرنے کے باعث ہمارے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور لوگوں (زائرین) کی روحانی اور ذہنی اذیت کا مستقل موجب بنتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ رویے بھی سفرنامے کی دل چسپی کو مہمیز لگاتے ہیں کیونکہ لوگ دوری کے باعث اپنے میزبانوں کا جو تصور قائم کر لیتے ہیں وہ حقیقت سے دور ہوتا ہے حیدر قریشی نے یہ فاصلہ ختم کر کے اصل رخ کی تصویر کشی کر دی ہے۔ ''سوئے حجاز'' کا مطالعہ کرنے کے بعد اکبر حمیدی کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے:

> ''حیدر قریشی کا یہ امتیاز بہت نمایاں ہے کہ وہ قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب اس طور باندھ رکھتا ہے کہ پڑھنے

والے کو کہیں ادھر اُدھر کی نہ تو فرصت ملتی ہے اور نہ ہی
ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حیدر قریشی کے تخلیقی سحر میں
سرتاپا شرابور ہوتا چلا جاتا ہے۔'' (۱۷۰)

حیدر قریشی نے یہ سفرنامہ جس تکنیک میں لکھا وہ قاری کے نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس تکنیک کا فائدہ یہ ہے کہ سفرنامہ نگار اپنی ذاتی اپچ اور تخلیقی توانائی کو راست سمت میں استعمال کر سکتا ہے۔ حیدر قریشی کا یہ فن پارہ اپنے موضوع، محرکات، انداز، پیش کش اور تخلیق مزاج کی وجہ سے منفرد شناخت رکھتا ہے۔ ان سات عمروں میں ایک اَسرار کا پہلو یہ بھی ہے کہ دینی اور دنیاوی اعتبار سے سات کا عدد اپنی ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ اگرچہ حیدر قریشی سات سے زیادہ یا سات سے کم عمرے بھی کر سکتے تھے لیکن ممکن ہے کہ ان کے لاشعور میں سات کا عدد کسی نفسیاتی یا روحانی ضرورت کے تحت فعال رہا ہو۔ قرآن حکیم کی سات منزلیں جبکہ سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ اگر حج اور عمرے کی مناسبت سے سات کے ہندسے پر غور کیا جائے تو پھر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایامِ جاہلیت میں خانہ کعبہ کی دیواروں پر سات عظیم قصائد آویزاں رہے جن کو اصطلاح میں سبع معلقات کا نام دیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ کا طوائف بھی سات مرتبہ کیا جاتا ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے دوران سات چکر لگائے جاتے ہیں۔ جنت کے ساتھ دروازے اور سات چشمے ہیں۔ دوزخ کے سات طبقات اور ہفتے کے ساتھ دن ہیں۔ اگر انسانی جسم پر غور کیا جائے تو خون کی نالیوں کی تعداد بھی سات ہے۔ سات کے ہندسے کا یہ چکر خاصا طویل ہے اور مختلف مذاہب اور تواریخ میں یہ عدد فضیلت کے باعث خاص مقام کا حامل ہے؛ کچھ تعجب نہیں کہ حیدر قریشی نے بھی سات عمرے کیے اور سات کی روایت میں اپنا حصہ محفوظ کر لیا۔

اس کتاب کا انتساب حضرت ابراہیمؑ، حضرت بی بی ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کے نام کر کے اُن مبارک ہستیوں کی یاد تازہ کی گئی ہے جن کا شمار خانہ کعبہ کے اولین بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ عمرے کا یہ سفر اپنے اختصار، اُسلوب، دل چسپی، معلومات، مشاہدات اور اثر پذیری کی وجہ سے قاری کی توقعات پر پورا اُترتا ہے۔

(ب) حج کا سفر

''سوئے حجاز'' کا دوسرا سفرنامہ حج پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں صرف عمرے کی تفصیلات تھیں جبکہ دوسرے ایڈیشن میں حج کے سفر کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ یہ سفرنامہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر قریشی نے حج کا پروگرام اچانک نہیں بنایا بلکہ کئی سال پہلے وہ اس کا مضبوط ارادہ باندھ چکے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

''دسمبر ۱۹۹۶ء میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد
سے دل میں یہ خواہش تھی کہ ارضِ حجاز میں پھر سے
حاضری دی جائے۔'' (۱۷۱)

چنانچہ اُنھوں نے کچھ برسوں بعد اسے عملی شکل دے ڈالی:

''۲۰۰۳ء میں حج کے لیے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔'' (۱۷۲)

''۲/ فروری اتوار کے روز ساڑھے نو بجے کی حج فلائیٹ سے روانہ ہوئے۔
۳/ فروری کو علی الصبح سعودی عرب کے وقت کے مطابق ۵ بجے جدہ پہنچے۔'' (۱۷۳)

(۱) مشکلات اور بدنظمی کا ذکر

حج کے موقع پر رش کے باعث جہاں اور لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ حیدر قریشی بھی تلخ تجربات کا شکار ہوئے اور اس کا آغاز جدہ ائیر پورٹ پر ہی ہو گیا تھا جہاں ان کا تمام سامان گم ہو گیا اور صرف وہ بیگ باقی بچا جو کندھے سے لگا رکھا تھا اور اخراجات کی تمام رقم مع ٹکٹ اور پاسپورٹ اسی میں محفوظ تھے۔ افراتفری کا یہ عالم خاوند بیوی دونوں کے لیے پریشان کن تھا لیکن اس کے باوجود ہمت نہ ہاری اور اسے سفر کا حصہ سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔ جدہ ائیر پورٹ پر ان کا وقت بہت مشکل سے گزرا کیونکہ یہاں کے معاملات سے گلوخلاصی کراتے کراتے پندرہ گھنٹے بیت چکے تھے۔ تھکن، پریشانی اور ذہنی اذیت کی ملی جلی کیفیات نے بدمزہ کر دیا تھا۔ پریشانی کی حالت میں ہوٹل پہنچے اور پھر تھوڑی دیر بعد حرم شریف روانہ ہو گئے۔

حیدر قریشی رقم طراز ہیں:

''حرم شریف پر نظر پڑتے ہی ایسے لگا جیسے ساری تکالیف کی قیمت وصول ہو گئی ہو۔'' (۱۷۴)

اس کے بعد سترہ (۱۷) دنوں کا احوال اُنھوں نے روزنامچے کی طرز پر تاریخ وار درج کیا ہے۔

(۲) زائرین اور خانہ کعبہ

حیدر قریشی نے ''سوئے حجاز'' میں ایسی کئی نئی باتوں کا ذکر کیا ہے جو عموماً دوسرے سفرنامہ نگار چھوڑ جاتے ہیں۔ شاید اُن کا یہ گمان ہوگا کہ اس نوع کی باتیں تو حج کے معمولات کا حصہ ہیں اور ہر کوئی ان سے واقف ہوگا۔ حیدر قریشی نے ایسا بالکل نہیں کیا۔ اُنھوں نے بچے کی آنکھ سے سب کچھ دیکھا اور قارئین کے لیے محفوظ کر لیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''۴/ فروری کو خانہ کعبہ کی زیارت نصیب ہوئی تو منظر
بہت بدلا بدلا سا لگا۔ غلافِ کعبہ کو اُس کے اصل مقام
سے شاید ڈیڑھ دو میٹر اُونچا کر دیا گیا تھا اور اس کے نیچے
سفید لٹھا قسم کا کپڑا اسلائی کر دیا گیا تھا۔ یہ صورت دیکھ کر
دل کو دھچکا سا لگا۔ کعبہ شریف غلاف میں اس ردوبدل
کے باعث پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔'' (۱۷۵)

خانہ کعبہ کے غلاف میں تبدیلی کی وجہ خود ان الفاظ میں بیان کر دی ہے:

''بہت زیادہ عقیدت مند حجاج، حج کی رش سے فائدہ اٹھا
کر غلافِ کعبہ کے ٹکڑے قینچی سے کاٹ کر گھروں میں
تبرک کے طور پر لے جاتے رہے ہیں (چوری کیا ہو
تبرک) غالباً اسی وجہ سے حکومت نے حفاظتی تدبیر کے
طور پر غلافِ کعبہ کو اُونچا کر دیا تھا۔'' (۱۷۶)

منزہ یاسمین کہتی ہیں:

''حیدر قریشی نے دورانِ سفر اپنے مشاہدات اور تجربات کے ساتھ ساتھ
دیارِ حرم کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔'' (۱۷۷)

یہ سفر نامہ نگار کا کمال ہے کہ اتنے مختصر سفر نامے میں ایسی خاص جزئیات کا اہتمام کر دیا ہے جو ضخیم سفر ناموں میں بھی کم کم دیکھنے میں آتی ہیں۔اس موضوع پر لکھے گئے سفر ناموں میں عموماً ایسی معلومات نہیں ملتی لیکن اس سفر نامے کی ایک ایک سطر قاری کے علم میں ایسا اضافہ کرتی ہے کہ اگر قاری بذاتِ خود کبھی حرم شریف جائے تو یہ کتاب اُس کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے گی۔

(۳) کہانی پن

حیدر قریشی نے عمرہ اور حج دونوں سفر ناموں میں کہانی پن کی تکنیک شعوری یا لاشعوری طور پر برتی ہے، جس کی وجہ سے پڑھنے والے کی دل چسپی ہر مقام پر نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ اسے مزید آگے پڑھنے کی تحریک دیتی ہے۔
''سوئے حجاز'' کا یہ اضافی حسن ہے کہ اس میں حقیقی دنیا کے چشم دید واقعات کہانی کے پیرائے میں ڈھالے گئے ہیں۔
ورنہ عموماً کہانی پن اُن موضوعات میں مزہ دیتا ہے جس کی بنیاد تخیلی اور تصوراتی عناصر پر اُٹھائی گئی ہو۔حیدر قریشی نے سفر نامے کی روایتی ہیئت برقرار رکھتے ہوئے کہانی پن کا جو اُسلوبیاتی تجربہ کیا وہ کتاب کے مجموعی حسن میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے پروفیسر منور رؤف نے لکھا ہے:

''موجودہ دور میں سفر نامے کہانی کی تکنیک پر لکھے
جا رہے ہیں اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ تجرید اور
علامت کے رجحان نے ادب سے افسانے کا رومان اور
کہانی پن چھین لیا ہے۔'' (۱۷۸)

یہ بیان حیدر قریشی کے سفر ناموں پر بھی صادق آتا ہے، انھوں نے اپنے سفر نامے میں کہانی پن کا جو

تجربہ کیا وہ سفر نامے کی روایتی ساخت کو مزید مضبوط بناتا ہے۔

(۴) حج اور گداگری

گداگری کی وبا پوری دنیا میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، اس میں ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ممالک کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔البتہ مقامِ حیرت ہے کہ بھکاریوں نے خانہ کعبہ جیسے مقدس مقام پر گداگری کی دکانیں چمکا رکھی ہیں۔ حیدر قریشی ان لوگوں کے طریق واردات پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حج کے دروان یہ تکلیف دہ منظر دیکھنے میں آیا کہ پیشہ
ور بھکاریوں کی ایک بڑی تعداد منظّم طریقے سے نہ صرف
سارے علاقے میں بلکہ حرم شریف میں صحنِ کعبہ تک
پھیلی ہوئی تھی۔ان لوگوں میں بعض واقعتاً معذور تھے اور
بعض اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کی بنا پر معذور بنے ہوئے
تھے۔'' (۱۷۹)

سفر نامہ نگار نے ان کے بارے میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ یہ گداگر جدید طرز پر اپنا نیٹ ورک چلا رہے تھے، کیوں کہ سب فقیروں کے پاس موبائل فون تھے جس پر وہ دوسروں کو یہ خبریں پہنچاتے رہتے تھے کہ کس کس جگہ پر لوگ زیادہ پیسے دے رہے ہیں، چنانچہ اطلاع ملتے ہی وہ گروہ مطلوبہ جگہ پہنچ جاتا اور یوں اس کی چاندی ہو جاتی۔ خواتین حجاج نرم مزاجی کی وجہ سے زیادہ نشانہ بن رہی تھیں۔

(۵) معذروں کی سہولت کا انتظام

''سوئے حجاز'' میں تقریباً ہر قسم کی اہم معلومات مل جاتی ہے۔اگر کوئی شخص عمرہ یا حج پر جانے سے پہلے ''سوئے حجاز'' کا مطالعہ بطور، گائیڈ بک'' کر لے تو وہ بہت سی پیش آمدہ پریشانیوں سے بچ سکتا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ پاک و ہند کے زائرین عمرہ یا حج اُسی وقت کرتے ہیں جب وہ جسمانی طور پر زیادہ توانا اور صحت مند نہیں رہتے۔بیش تر لوگ بڑھاپے کی دہلیز پار کرنے کے بعد یہ سعادت حاصل کرتے ہیں۔سعودی حکومت نے ایسے لوگوں کی آسانی کے لیے ہر ممکن اقدام کر رکھے ہیں اور ان کو آسانی فراہم کرنے کی خاطر طواف کرنے کے لیے وہیل چیر اور کندھوں پر اٹھائے جانے والی ڈولی کا پورا پورا بندوبست کیا گیا ہے۔یوں معمر اور معذور لوگ دوسرے صحت مند لوگوں کی نسبت بہتر سہولت اور آرام کے ساتھ طواف مکمل کر لیتے ہیں۔

(۶) تجاویز

حیدر قریشی نے عمرہ اور حج کے اسفار میں جو بدانتظامی اور کمی محسوس کی اس کا ذکر وہ جگہ جگہ پر محبت کے ساتھ کرتے رہے ہیں تاہم چند ایک مقامات پر اُنھیں محسوس ہوا کہ یہاں انقلابی انتظامات کی ضرورت پڑے گی لہٰذا وہ قدرے

تفصیل سے اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہیں۔اس کا خلاصہ یوں ہے:

(ا) جدہ ائیر پورٹ سے لیکر منیٰ کی سڑکوں تک ایسے اہلکار تعینات کے جائیں جو عربی کے علاوہ وہ زبانیں بھی جانتے ہوں جس کا فائدہ پاکستان، بنگلہ دیش، انڈیا، ملائیشیا، ترکی، ایران اور افغانستان کے زائرین کو پہنچے گا۔

(ب) متذکرہ بالا ممالک سے بلا معاوضہ خدمات گار یا رضا کار بلوائے جا سکتے ہیں۔

(ج) جو لوگ گروپ کی شکل میں آتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جبکہ انفرادی طور پر آنے والے زائرین کو توجہ کم ملتی ہے، یہ فرق ختم ہونا چاہیئے۔

(د) منیٰ میں رمی جمعرات کے موقع پر اموات کا سلسلہ صرف اس لیے چلتا رہتا ہے کہ لوگوں کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے اگر آنے اور جانے کے لیے الگ الگ راستے بنا لیے جائیں تو بھگدڑ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

(ر) حجاجِ کرام کی خدمات کا جذبہ ہونا چاہیئے صرف نیت سے کام نہیں چلے گا۔ یہ تمام اُمور توجہ طلب ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ سفر دوسرے لوگوں سے اسی لیے مختلف ہو جاتا ہے کہ وہ کھلی آنکھ اور بیدار ذہن کے ساتھ مشاہدہ کر رہے تھے۔

(۷)''سوئے حجاز'' کا حاصل

حیدر قریشی رقم طراز ہیں:

''حج کرنے کے بعد حج اور عمرہ کے فرق کا اندازہ ہوا۔ حج فرض ہے، عمرہ کی حیثیت نوافل جیسی ہے۔ محض فرض نمازیں پڑھنے سے قربِ خداوندی نہیں ملتا۔ قربِ خداوندی کے لیے فرض سے آگے بڑھ کر نوافل کی منزل طے کرنا ہوتی ہے۔'' (۱۸۰)

وہ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''جیسے نمازوں میں فرض اور نوافل کا فرق ہے ویسے ہی حج اور عمرہ میں فرق ہے۔ حج فرض ہے اور صاحبِ توفیق پر لازم ہے۔ اس میں مشقت اور ریاضت کا پہلو نمایاں ہے عمرہ فرض نہیں ہے لیکن نوافل کی طرح اس کی لذت الگ ہے۔'' (۱۸۱)

حیدر قریشی کے یہ تجزیات حُبِ رسولؐ کی بنیاد پر اُستوار ہیں ان کا سفر نامہ ءعمرہ میں قاری کو دوران مطالعہ ایک

خاص نوع کی لذت اور سرشاری کا سراغ ملتا ہے جبکہ حج کے سفر نامے میں عبادات اور مناسک حج کی ادائیگی کا بیان تو مفصل ہے لیکن مشاہدہ ءحق کی کیفیت اور اظہار قدرے دھیما ہے۔ حج کے سفر نامے میں جو تاثر اُبھرتا ہے اس میں تنقیدی زاویہ ءنظر اور اصلاحی رنگ غالب ہے اس کے برعکس عمرے کا تاثر جذب و مستی کی روحانی شعاعوں کو منعکس کرتا ہے۔ اُردو ادب میں یہ سفر نامے اپنے انفرادی اُسلوب اور فکری مباحث کی وجہ سے نمایاں رہیں گے۔

....

حوالہ جات

۱۔ قیصر تمکین، افسانے (مضمون) مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات (متفرق مضامین) مرتب: پروفیسر نذر خلیق، میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳ء ص ۲۰۰

۲۔ ڈاکٹر انور سدید، حیدر قریشی کے افسانے (آراء اور تبصرے) مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات (متفرق مضامین) ص ۲۰۸

۳۔ قرۃ العین حیدر، پکچر گیلری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۳۵

۴۔ حیدر قریشی، ایک کافر کہانی (افسانہ) مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۹ ئ ص ۱۸۶

۵۔ ایک کافر کہانی، مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۱۸۶

۶۔ ایک کافر کہانی، مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۱۸۶

۷۔ سعید شباب (مرتب) حیدر قریشی کے انٹرویوز، نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ایمسٹرڈیم، ہالینڈ، ۲۰۰۴ء ص ۹۹

۸۔ دیوندر اسر، روشنی کے شیشہ گھر میں (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، ص ۱۹۵

۹۔ جوگندر پال، روشنی کی بشارت کے افسانے (مضمون) مشمولہ حیدر قریشی کی دابی خدمات ص ۱۹۳

۱۰۔ روشن نقطہ، مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۲۲۴ تا ۲۲۶

۱۱۔ دھند کا سفر (افسانہ) کلیات، ص ۱۸۰

۱۲۔ ماںتا (افسانہ) کلیات، ص ۱۹۵

۱۳۔ اندھی روشنی (افسانہ) کلیات، ص ۲۰۱

۱۴۔ روشن نقطہ (افسانہ) کلیات، ص ۲۲۴

۱۵۔ دو کہانیوں کی ایک کہانی (افسانہ) کلیات، ص ۲۲۸

۱۶۔ مناظر عاشق ہرگانوی، حیدر قریشی کے افسانوں میں برتاؤ کی توانائی (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی فن اور

شخصیت،مرتبین،نذیر فتح پوری،سنجے گوڑ بولے،اسباق پبلی کیشنز،پونہ(انڈیا)،۲۰۰۲ء(اپریل)ص ۹۵

۱۷۔ جیلانی کامران،حیدرقریشی کی افسانہ نگاری مشمولہ،حیدرقریشی کی ادبی خدمات،ص ۱۱۹

۱۸۔ انکل انیس(افسانہ) کلیات،ص ۲۴۳

۱۹۔ انکل انیس(افسانہ) کلیات،ص ۲۴۴

۲۰۔ انکل انیس(افسانہ) کلیات،ص ۲۴۵

۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی،افسانے کی حمایت میں،شہرزاد،کراچی،۲۰۰۴ء(طبع دوم)ص ۲۰

۲۲۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی،حیدرقریشی کے افسانوں میں برتاؤ کی توانائی(مضمون)مشمولہ حیدرقریشی فن اورشخصیت،ص ۱۰۱،۱۰۹

۲۳۔ بھولے کی پریشانی(افسانہ) کلیات،ص ۲۳۷

۲۴۔ ایم.ڈی.تاثیر،نثر تاثیر،انتخاب وترتیب،فیض احمد فیض،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۹ء،ص ۴۹

۲۵۔ حیدرقریشی فن اورشخصیت،ص ۹۹

۲۶۔ حوا کی تلاش(افسانہ) کلیات،۲۰۴

۲۷۔ حوا کی تلاش(افسانہ) کلیات،ص ۲۰۴،۲۰۵

۲۸۔ حوا کی تلاش(افسانہ) کلیات،ص ۲۰۵

۲۹۔ حوا کی تلاش(افسانہ) کلیات،ص،۲۰۶

۳۰۔ حیدرقریشی،دعائے دل(شعری مجموعہ) کلیات،ص ۸۷

۳۱۔ نجمہ رحمانی،عالمی بیداری اوراُردوشاعری(مضمون)مشمولہ سہ ماہی،ذہنِ جدید،جلد ۱۷،شمارہ ۵۰ (دسمبر تا فروری)۲۰۰۸ء،ذاکرنگر،دہلی،ص ۱۱۰

۳۲۔ گلاب شہزادے کی کہانی کلیات،ص ۱۷۱

۳۳۔ گلاب شہزادے کی کہانی(افسانہ)ص ۱۷۲

۳۴۔ گلاب شہزادے کی کہانی(افسانہ)ص ۱۷۲

۳۵۔ گلاب شہزادے کی کہانی(افسانہ)ص ۱۶۸

۳۶۔ ڈاکٹر ظفر قدوائی،ایٹمی جنگ(مضمون)مشمولہ،عکاس انٹرنیشنل(حیدرقریشی نمبر) شمارہ نمبر۴،مرتبہ ارشد خالد،مکتبہ عکاس،اسلام آباد،یکم اکتوبر،۲۰۰۵ء،ص ۳۱

۳۷۔ سلیم انصاری،حیدرقریشی کے افسانوں کی حقیقت(مضمون)مشمولہ عکاس انٹرنیشنل(حیدرقریشی نمبر)،

ص ۳۶

۳۸۔ کاکروچ(افسانہ) کلیات،ص ۲۲۱

۳۹۔ کاکروچ(افسانہ) کلیات،ص ۲۲۳

۴۰۔ کاکروچ(افسانہ) کلیات،ص ۲۲۳

۴۱۔ ڈاکٹر حنیف فوق،بدلتی دنیا میں ادب کا کردار(مضمون) اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۲۰۰۵ء،ص ۳۳

۴۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر،تنقیدی اصطلاحات،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء،ص ۶۳

۴۳۔ آپ بیتی(افسانہ) کلیات،ص ۱۸۲

۴۴۔ روشنی کی بشارت(افسانہ) کلیات،ص ۱۹۰

۴۵۔ دیویندر اسر،حیدرقریشی۔مشاہیر کے سوچ آبشار،مشمولہ،ماہنامہ شاعر،جلد ۷۵،شمارہ ۱۱،نومبر ۲۰۰۴ء

۴۶۔ دیویندر اسر،حیدرقریشی۔مشاہیر کے سوچ آبشار،مشمولہ،ماہنامہ شاعر،جلد ۷۵،شمارہ ۱۱،نومبر ۲۰۰۴ء

۴۷۔ ڈاکٹر ذکاالدین شایان،حیدرقریشی کا افسانوی مجموعہ روشنی کی بشارت،مشمولہ،حیدرقریشی فن اورشخصیت،ص ۹۱

۴۸۔ سیداحمد دہلوی،فرہنگِ آصفیہ،ترقی اُردو بورڈ،نئی دہلی،۱۹۹۰ء،ص ۸۳۸

۴۹۔ نورالحسن نیر(مولوی) نوراللغات(جلد دوم) نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۸۹ء(طبع دوم)ص ۶۴۰

۵۰۔ وارث سرہندی،علمی اُردو لغت(جامع) علمی کتاب خانہ لاہور،۱۹۹۰ء،ص ۶۶۳

۵۱۔ اُردو لغت(جلد ۸)،اُردو لغت بورڈ،کراچی ۱۹۸۷ء،ص ۳۸۸

۵۲۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،تنقیدی اصطلاحات(توضیحی لغت) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء،ص ۱۱۷

۵۳۔ حیدرقریشی،مائے نئی میں کنوں آکھاں(خاکہ:امی جی) مشمولہ،عمرلا حاصل کا حاصل(کلیات)ص ۲۸۱

۵۴۔ حیدرقریشی،برگد کا پیڑ(خاکہ:اباجی) مشمولہ،عمرلا حاصل کا حاصل،ص ۲۷۵

۵۵۔ حیدرقریشی،برگد کا پیڑ(خاکہ:اباجی) مشمولہ،عمرلا حاصل کا حاصل،ص ۲۷۵

۵۶۔ حیدرقریشی،برگد کا پیڑ(خاکہ:اباجی) مشمولہ،عمرلا حاصل کا حاصل،ص ۲۷۵

۵۷۔ رماشنکر ترپاٹھی،تاریخ قدیم ہندوستان،مترجم سید سخی حسن نقوی،سٹی بک پوائنٹ، کراچی ۲۰۰۶ء(طبع سوم)،ص ۲۴

۵۸۔ حیدرقریشی،بلند قامت ادیب(خاکہ:اکبر حمیدی) مشمولہ کلیات،ص ۳۴۵

۵۹۔ حیدرقریشی،اُجلے دل والا(خاکہ:چھوٹا بھائی) مشمولہ،کلیات،ص ۳۱۸

۶۰۔ ڈاکٹر انور سدید،،میری محبتیں(مضمون) مشمولہ،حیدرقریشی کی ادبی خدمات،مرتبہ،پروفیسر نذر خلیق،

میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳، ص ۲۱۱

۶۱۔ طاہر مجید، میری محبتیں (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی فن اور شخصیت، ص ۱۱۹

۶۲۔ حیدر قریشی، بلند قامت ادیب (خاکہ) کلیات، ص ۳۴۳

۶۳۔ رشید حسن خان، مولوی سید احمد دہلوی (خاکہ) مشمولہ، دلی والے، مرتبہ، ڈاکٹر صلاح الدین، اُردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۶، ص ۲۱۲

۶۴۔ حیدر قریشی، ڈاچی والیا موڑ مہار وے (خاکہ: دادا جی) مشمولہ، کلیات، ص ۲۸۷

۶۵۔ حیدر قریشی، ڈاچی والیا موڑ مہار وے (خاکہ: دادا جی) مشمولہ، کلیات، ص ۲۸۸

۶۶۔ منشایاد، میری محبتیں (مضمون) مشمولہ، عکاس انٹرنیشنل (حیدر قریشی نمبر) شمارہ نمبر ۴، ص ۴۲

۶۷۔ حیدر قریشی، پسلی کی ٹیڑھ (خاکہ: مبارکہ) مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل، کلیات، ص ۳۱۱

۶۸۔ حیدر قریشی، ڈاچی والیا موڑ مہار وے (خاکہ: دادا جی) مشمولہ، کلیات، ص ۲۸۹

۶۹۔ ترنم ریاض کے خط کا یہ اقتباس ماہانہ ادبی خبر نامہ ''اُردو دنیا'' (جرمنی) شمارہ فروری ۲۰۰۰ میں شائع ہوا تھا۔ (یہ اقتباس ''حیدر قریشی فن اور شخصیت'' کے ص ۱۱۶ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔)

۷۰۔ خاور اعجاز، حیدر قریشی اور میری محبتیں (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی فن اور شخصیت، ص ۱۱۶

۷۱۔ منشایاد، میری محبتیں (مضمون) مشمولہ، عکاس انٹرنیشنل (حیدر قریشی نمبر) شمارہ ۴، ص ۴۲

۷۲۔ ڈاکٹر انور سدید، میری محبتیں (مضمون)، مشمولہ، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، مرتبہ، پروفیسر نذر خلیق، میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳، (طبع اول) ص ۲۱۱

۷۳۔ ریاض احمد، اُسلوب، مشمولہ نئی تحریریں، حلقہ ارباب ذوق، لاہور، نومبر ۱۹۵۷، ص ۶۹

۷۴۔ حیدر قریشی، مائے نی میں کنوں آکھاں (خاکہ: امی جی) کلیات، ص ۲۸۶

۷۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات، ص ۱۱۵

۷۶۔ حیدر قریشی، ہم کہ ٹھہرے اجنبی (خاکہ: فیض احمد فیض) کلیات، ص ۳۳۳

۷۷۔ جاوید خان، حیدر قریشی کی خاکہ نگاری، مشمولہ، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، ص ۲۴۰

۷۸۔ حیدر قریشی، پسلی کی ٹیڑھ (خاکہ: مبارکہ) مشمولہ، عمر لا حاصل کا حاصل، کلیات، ص ۳۱۲

۷۹۔ حیدر قریشی، زندگی کا تسلسل (خاکہ: پانچوں بچے) کلیات، ص ۳۲۷

۸۰۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد، ۲۰۱۳، ص ۹

۸۱۔ Mathai,M.O,Vikas Publishing House,New Delhi,1978, P No

۸۲۔ منزہ یاسمین، حیدر قریشی شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ: برائے ایم اے اُردو) میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳، ص ۱۷۸

۸۳۔ منزہ یاسمین، حیدر قریشی شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ: برائے ایم اے اُردو) ص ۱۷۸

۸۴۔ حیدر قریشی نے میری ای میل کا مفصل جواب ۲۷/ جولائی ۲۰۱۳ کو دیا تھا۔

۸۵۔ حیدر قریشی نے میری ای میل کا مفصل جواب ۲۷/ جولائی ۲۰۱۳ کو دیا تھا۔

۸۶۔ حیدر قریشی نے میری ای میل کا مفصل جواب ۲۷/ جولائی ۲۰۱۳ کو دیا تھا۔

۸۷۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹی یادیں، ص ۵

۸۸۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹی یادیں، ص ۱۲

۸۹۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۳۸

۹۰۔ سلطان جمیل نسیم، کھٹی میٹھی یادیں (مضمون) مشمولہ عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد، مرتبہ ارشد خالد، ۲۰۰۵، ص ۴۹

۹۱۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۶۱

۹۲۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۱۷۸

۹۳۔ جوگندر پال، حیدر قریشی۔ مشاہیر کے سوچ آبشار، مشمولہ، شاعر، جلد ۵۷، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۰۴، ممبئی، ص ۱۰

۹۴۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۱۶۳

۹۵۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۱۶۳

۹۶۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۱۶۳

۹۷۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۱۶۲

۹۸۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۸۵

۹۹۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں ص ۸۵، ۸۶

۱۰۰۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ۸۸

۱۰۱۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۹۶

۱۰۲۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۹۶

۱۰۳۔ حیدر قریشی، کھٹی میٹھی یادیں، ص ۹۶

۱۰۴۔ کھٹی میٹھی یادیں، ص ۱۶۷

۱۰۵۔ ڈاکٹرسلیم اختر،اُردوادب کی مختصر ترین تاریخ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳(۲۵واں اڈیشن)ص ۵۲۶

۱۰۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا،(دیباچہ،انشائی مجموعہ: جزیرے کا سفر)بحوالہ،جدید اُردو انشائیہ،مرتبہ اکبر حمیدی، اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۱۹۹۱،ص ۴

۱۰۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا،(دیباچہ،انشائی مجموعہ: جزیرے کا سفر)بحوالہ،جدید اُردو انشائیہ،مرتبہ اکبر حمیدی،ص ۶

۱۰۸۔ اکبر حمیدی،جدید اُردو انشائیہ(دیباچہ)،ص ۹

۱۰۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا،اُردو انشائیہ کی کہانی مشمولہ،جدید اُردو انشائیہ،مرتبہ اکبر حمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، 1991 ،ص ۲۴

۱۱۰۔ حیدر قریشی،نقاب(انشائیہ)مشمولہ عمر لاحاصل کا حاصل (کلیات)ص ۵۱۰

۱۱۱۔ حیدر قریشی،وگ(انشائیہ)مشمولہ کلیات،ص ۵۱۳

۱۱۲۔ حیدر قریشی،یہ خیر و شر کے سلسلے(انشائیہ)مشمولہ،کلیات،۵۲۵

۱۱۳۔ ناصر عباس نیر،نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق(مضمون)مشمولہ،سہ ماہی ادبیات،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد۔جلد ۱۳ شمارہ ۵۳،۲۰۰۰،ص ۱۸۳

۱۱۴۔ حیدر قریشی،اطاعت گزاری(انشائیہ)مشمولہ،کلیات،ص ۵۲۴

۱۱۵۔ حیدر قریشی،فاصلے،قربتیں (انشائیہ)مشمولہ،کلیات،ص ۵۱۸

۱۱۶۔ حیدر قریشی،تجربہ اور تجربہ کاری(انشائیہ)مشمولہ،کلیات،ص ۵۳۵

۱۱۷۔ حیدر قریشی،تجربہ اور تجربہ کاری(انشائیہ)مشمولہ،کلیات،ص ۵۳۵

۱۱۸۔ حیدر قریشی،تجربہ اور تجربہ کاری(انشائیہ)مشمولہ،کلیات،ص ۵۳۴

۱۱۹۔ نقاب(انشائیہ)کلیات،ص ۵۱۱

۱۲۰۔ یہ خیر و شر کے سلسلے(انشائیہ)کلیات،ص ۵۲۷

۱۲۱۔ اپنا اپنا سچ(انشائیہ)کلیات ،ص ۵۳۱

۱۲۲۔ تجربہ اور تجربہ کاری(انشائیہ)کلیات،ص ۵۳۵

۱۲۳۔ تجربہ اور تجربہ کاری(انشائیہ)کلیات،ص ۵۳۵

۱۲۴۔ اپنا اپنا سچ(انشائیہ)کلیات،ص ۵۳۱

۱۲۵۔ اطاعت گزاری(انشائیہ)کلیات،ص ۵۲۲

۱۲۶۔ چشم تصور(انشائیہ)کلیات ۵۲۹

۱۲۷۔ چشم تصور(انشائیہ)کلیات ۵۲۹

۱۲۸۔ ناصر عباس نیر،نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق(مضمون)مشمولہ،سہ ماہی ادبیات،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،ص ۱۸۴

۱۲۹۔ نقاب(انشائیہ)کلیات،ص ۵۱۲

۱۳۰۔ وگ(انشائیہ)کلیات،ص ۵۱۲

۱۳۱۔ حیدر قریشی،سلگتے خواب(شعری مجموعہ)مشمولہ،کلیات،ص ۶۳

۱۳۲۔ بڑھاپے کی حمایت میں(انشائیہ)کلیات،ص ۵۲۰

۱۳۳۔ نقاب(انشائیہ)کلیات،ص ۵۱۰،۵۱۱

۱۳۴۔ اطاعت گزاری(انشائیہ)کلیات،ص ۵۲۲

۱۳۵۔ اپنا اپنا سچ(انشائیہ)کلیات،ص ۵۳۲

۱۳۶۔ حیدر قریشی سے لے گئے انٹرویوز،مرتبہ،سعید شباب،نظایہ آرٹ اکیڈمی،ایمسٹرڈیم،ہالینڈ،۲۰۰۴، ص ۶۶

۱۳۷۔ عہد ساز شخصیت(ڈاکٹر وزیر آغا) کلیات،ص ۳۳۲

۱۳۸۔ ناصر عباس نیرؔ،نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق ص ۱۸۴

۱۳۹۔ حیدر قریشی،سوئے حجاز،سرور اکادمی ،جرمنی ۲۰۰۴،ص ۱۴

۱۴۰۔ حیدر قریشی،سوئے حجاز،ص ۷

۱۴۱۔ سوئے حجاز ،ص ۷

۱۴۲۔ سوئے حجاز ،ص ۷

۱۴۳۔ سوئے حجاز،ص ۴

۱۴۴۔ سوئے حجاز،ص ۲۲

۱۴۵۔ سوئے حجاز،ص ۲۲

۱۴۶۔ سوئے حجاز،ص ۲۴

۱۴۷۔ سوئے حجاز،ص،۲۵

۱۴۸۔ سوئے حجاز،ص ۴۲

۱۴۹۔ سوئے حجاز،ص ۳۵،۳۶

۱۵۰۔ سوئے حجاز،ص ۲۷

۱۵۱۔ سوئے حجاز،ص ۹۴

۱۵۲۔ اکبر حمیدی، حیدر قریشی سوئے حجاز (مضمون)، مشمولہ، عکاس انٹرنیشنل (شمارہ:۴) مرتب ارشد خالد، ناشر مکتبہ عکاس، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۶۰

۱۵۳۔ منزہ یاسمین، حیدر قریشی شخصیت اور فن، ص ۱۴۴

۱۵۴۔ اکبر حمیدی، حیدر قریشی سوئے حجاز، ص ۶۰

۱۵۵۔ حیدر قریشی سوئے حجاز ص ۶۰

۱۵۶۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۴۲

۱۵۷۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۴۲، ۴۳

۱۵۸۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۳۹

۱۵۹۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۳۹

۱۶۰۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۷۶

۱۶۱۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۷۶

۱۶۲۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۷۶

۱۶۳۔ حیدر قریشی، سوئے حجاز، ص ۷۶

۱۶۴۔ سوئے حجاز، ص ۸

۱۶۵۔ سوئے حجاز، ص ۹

۱۶۶۔ اکبر حمیدی، حیدر قریشی سوئے حجاز (مضمون) ص ۶۰

۱۶۷۔ اکبر حمیدی، حیدر قریشی سوئے حجاز (مضمون) ص ۶۰، ۶۱

۱۶۸۔ ڈاکٹر نذر خلیق، سوئے حجاز پر ایک نظر (مضمون) مشمولہ، سہ ماہی، ادب ساز، شمارہ، جنوری تا جون ۲۰۰۸، ص ۱۰۱

۱۶۹۔ سوئے حجاز، ص ۴۳

۱۷۰۔ اکبر حمیدی، حیدر قریشی سوئے حجاز (مضمون) ص ۶۱

۱۷۱۔ سوئے حجاز، ص ۱۰۷

۱۷۲۔ سوئے حجاز، ص ۱۰۷

۱۷۳۔ سوئے حجاز، ص ۱۰۸

۱۷۴۔ سوئے حجاز، ص ۱۱۰

۱۷۵۔ سوئے حجاز، ص ۱۱۱

۱۷۶۔ سوئے حجاز، ص ۱۱۱

۱۷۷۔ منزہ یاسمین، حیدر قریشی شخصیت اور فن ص ۱۴۶

۱۷۸۔ منور روف، پروفیسر، اُردو سفرنامے کا سفر، مشمولہ خیابان (اضاف نثر نمبر)، تحقیقی مجلّہ، شعبہ اُردو جامعہ پشاور (سال ۱۹۹۵ء۔۱۹۹۴ء) ص ۲۲، ۳۴

۱۷۹۔ سوئے حجاز، ص ۱۳۱

۱۸۰۔ سوئے حجاز، ۱۳۴

۱۸۱۔ سوئے حجاز، ۱۳۴، ۱۳۵

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

باب دوم

حیدر قریشی کی شاعری

باب دوم

حیدرقریشی کی شاعری

حیدرقریشی کا شعری سرمایہ تین اصناف پر محیط ہے۔درجہ بندی کے اعتبار سے غزل سرِ فہرست ہے پھر بالترتیب ماہیا اورآزادنظم کی باری آتی ہے۔یہ تینوں اصناف تخلیقی تجربات،موضوعات اور اُسلوبیاتی تنوع کی بدولت لائقِ توجہ ہیں۔اب تک شائع ہونے والے تمام شعری مجموعوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) **شعری مجموعے:**

۱۔ **سلگتے خواب** (غزلیں)

(تجدیداشاعت گھر،لاہور،طبع،۱۹۹۱ء)

۲۔ **عمرِگریزاں**

(تجدیداشاعت گھر،لاہور،طبع،۱۹۹۶ء)

۳۔ **محبت کے پھول** (ماہیے)

(نایاب پبلی کیشنز،خانپور،طبع،۱۹۹۶ء)

۴۔ **دعائے دل** (غزلیں،نظمیں)

(نصرت پبلشرز،لاہور،طبع،۱۹۹۷ء)

۵۔ **دردسمندر**

(یہ مجموعہ الگ شائع نہیں ہوا بلکہ اسے حیدرقریشی نے اپنے نثری وشعری کلیات بعنوان:'' عمرِ لاحاصل کا حاصل'' میں شامل کیا ہے،ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۰۹ء)

(ب) **شعری کلیات**

۱۔ **غزلیں،نظمیں،ماہیے**

(سروراد بی اکادمی،جرمنی،طبع،۱۹۹۸ء)

۲۔ **قفس کے اندر** (چھے شعری مجموعے)

(عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد،طبع ۲۰۱۳ء)

حیدرقریشی کا تقریباً تمام شعری سرمایہ مطبوعہ صورت میں نیز انٹرنیٹ کی مختلف ویب گاہوں اور بلاگس (اس کی تفصیل کتابیات میں موجود ہے) پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔مقالے کے زیرِنظر حصے میں اُن کی غزل،آزادنظم اور ماہیانگاری کا بالاستیعاب مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

■■■

(۲۱) غزل

(الف) حیدرقریشی کی غزل......فکری موضوعات کا مطالعہ

حیدرقریشی کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید دواہم نکات کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں:

''حیدرقرشی کی غزل نے بیسویں صدی کے ربع آخر میں
آنکھ کھولی اس لیے آوازوں کے جنگل میں کھو جانے کی
بجائے اُس نے جنگل کے درختوں کی گھنی چھاؤں سے
آسودگی حاصل کرنے کی آرزو کی ہے۔۔۔حیدرقریشی
اپنے عصر کی حسیّت سے بھی واقف ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر انور سدید کا یہ اقتباس بالواسطہ یا بلا واسطہ حیدر کے فکری پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اُن کی انفرادی اوراجتہادی آواز کی توثیق بھی کررہا ہے۔یہ آواز فکرونظر کے زیراثر ہے اور عصری تغیرات سے پوری طرح باخبر ہے۔افکاروخیالات کی یہی لہریں اُن کی غزل کا معنوی دائرہ کشادہ کرتی ہیں۔حیدرقریشی کی اسی فکری آگہی کو مختلف عنوانات کے تحت سمجھنے کی ایک کوشش کی جارہی ہے۔

(۱) سماجی شعور

حیدرقریشی کی غزل میں سماجی اقدار وتغیرات اور عصریت پر بصیرت افروز اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ایک سچے اور کھرے شاعر کی طرح اُنھوں نے زندگی کی صداقتوں کوشعری پیکروں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔یہ باطنی تخلیقی تجربے کا کرشمہ ہے کہ اُن کی غزل زندگی سے ماورا معلوم نہیں ہوتی اور دورانِ مطالعہ قاری کوبھی یہ احساس رہتا ہے کہ ان غزلوں کا شاعر اسی دنیائے خوب وزشت کا باسی ہے۔انسانی رشتوں کی اصلیت پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

ے سارے رشتے جھوٹے ہیں، سارے تعلق پُرفریب
پھر بھی سب قائم رہیں یہ بددعا کر آئے ہیں (۲)

سماجی رویے کیا ایک اور مثال:

ے کئی خوش نظر سے گماں لیے، گئے ہم بھی کاسۂ جاں لیے
پڑا واسطہ تو پتہ چلا وہ سخی بھی کتنا بخیل ہے (۳)

حیدرقریشی باطل قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں:

ے مجھے معلوم ہے سلطان جابر کیا کرے گا
مگر میں کلمۂ حق ہوں، بیاں ہونے لگا ہوں (۴)

اسی موضوع پر ایک اور شعر:

ے ابھی تو زور ہی ٹوٹا ہے جابروں کا، ابھی
نظامِ جبر کا پورا زوال باقی ہے (۵)

ہردے بھانو پرتاپ لکھتے ہیں۔

'' حیدرقریشی کی شاعری فکروفلسفے سے معمور ہے۔وہ
صرف حسینوں کی قصیدہ خوانی نہیں کرتے پھرتے بلکہ وہ
اس سماج کو اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔اپنی زندگی
سے حاصل ایک ایک تجربے کو وہ اپنی شاعری میں بہت
ہی فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔'' (۶)

سماجی اقدار کی شکست وریخت، نئے نئے معاشرتی مسائل اور بحران زدہ معاشرے کے حوالے سے درج ذیل اشعار کا مطالعہ ناگزیر ہے:

ے حکم رہائی اس کے لیے موت ہی نہ ہو
بہتر ہے پہلے پوچھ لو اپنے اسیر سے (۷)

ے اَنمول رتن بننے سے بے مول ہی اچھے
سر جبر کی سرکار کے در پر نہیں رکھا (۸)

ے پھر اہل جور کے حق میں فقیہ شہر کے صدقے
حدیثِ جبر کی کوئی نئی تاویل ہونا ہے (۹)

حیدرقریشی کے یہ اشعار جس جداگانہ فکری منطقے کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں اس میں اُن کا تخلیقی شعور اور فنی گرفت بھی ہمراہ ہے۔اِن کی غزل میں سماجیات کا ایک واضح نظام موجود ہے جس میں اخلاقی پسماندگی، تعصب اور نفرت کے مختلف پہلوؤں کی مذمت کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے مثبت رویوں پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔

(۲) محبت کا جذبہ اور رویہ

حیدرقریشی کی غزلوں میں محبت کے اعلیٰ جذبوں اور رویوں کی تجسیم ملتی ہے، ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

'' حیدرقریشی کی غزل میں محبت کا تجربہ اپنے سارے
کرب کے ساتھ سامنے آیا ہے مگر پھر بھی اس نے اپنے

اس تجربے پر معروضی نظر بھی ڈالی ہے جہاں تک اس کے
ہاں محبت کے تجربے کا تعلق ہے تو اس کا ذائقہ افلاطونی
نہیں بلکہ زمینی اور جسمانی ہے۔'' (۱۰)

حیدر قریشی کے پہلے شعری مجموعے ''سلگتے خواب'' کی غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو۔

کسی بھی لفظ کا جادو اثر نہیں کرتا
وہ اپنے دل کی مجھے بھی خبر نہیں کرتا
عجیب طور طریقے ہیں اس کے بھی حیدرؔ
وہ مجھ سے پیار تو کرتا ہے، پر نہیں کرتا (۱۱)

مندرجہ فوق اشعار میں قلبی واردات کو نہایت عمدگی کے ساتھ شعری تجربے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ تخلیقی تجربہ جیتی جاگتی زندگی کا عکاس بن گیا ہے۔ اسی نوع کے رنگارنگ تجربات دیگر شعروں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں:

بس ترے بعد ترے غم سے محبت رکھی
سینکڑوں خوشیاں اگرچہ مری گرویدہ تھیں (۱۲)

دکھ تو بے شک بہت ہوا لیکن
اس کی چاہت تو آزمالی ہے (۱۳)

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہاں جس محبوب کی بات ہو رہی ہے وہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہے جو لفظوں میں ڈھل کر ایک پیکر تو بنتا ہے لیکن اس کے خدوخال واضح نہیں ہوتے۔ یہ محبوب، شاعر کے تخیل میں زندہ اور تازہ ہے جس کی وجہ سے قلبی اور باطنی کیفیات شعروں کی صورت منعکس ہو رہی ہیں۔

یہ بھی آنا تھا مقام آخر تمہاری چاہ میں
ہم نے اپنے آپ سے بے زار ہونا تھا، ہوئے (۱۴)

خراب کر لی جوانی تمہاری چاہت میں
اب اس سے بڑھ کے بھلا کیا خراب ہونا ہے (۱۵)

سپردگی بھی محبت کا ایک رنگ سہی
مزہ ہی کیا رہا جب اس میں رد و کد نہ رہے (۱۶)

جس قدر ہوتا گیا اس کی محبت کا اسیر
ذات کے زندان سے حیدرؔ رہا ہوتا گیا (۱۷)

حیدر قریشی کا جذبۂ محبت خالص ہے ان کے ہاں محبت کی شدت جذبے کو کندن بناتی ہے۔ محبت کے یہی حدود آشنا

جذبے قلبی واردات کی تطہیر میں مصروف نظر آتے ہیں، منزہ یاسمین لکھتی ہیں:

''حیدر قریشی نے اپنے شاعری میں عشق کو محض تذکرے
کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ انہوں نے عشق کو اس کی تمام تر
حرارتوں اور جذباتی محرکات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان
کا محبوب روایتی غزل کا خیالی ہیولہ نہیں بلکہ یہ اُس کی دنیا
کا باسی ہے جو ان کے اردگرد اپنی تمام تر حقیقتوں کے
ساتھ موجود ہے۔'' (۱۸)

درج بالا اقتباس کی تائید میں یہ شعر دیکھے جا سکتے ہیں:

اُس کے ہونٹوں پہ میں پھر مہکوں تمنا بن کر
پھر وہ چاہت جو کبھی اس نے تھی چاہی، مانگوں

اس کو پانے کی تمنا پہ یقیں کب ہے مگر
ہاتھ جب اُٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں (۱۹)

محبت کی یہ منزل آسانی سے ہاتھ نہیں آتی اور حیدر قریشی کو یہاں تک پہنچنے میں خاصی محنت کرنا پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں اپنی محبت پر کامل اعتبار ہے:

وجود میرا اگر اس پہ منکشف ہو جائے
مجھے یقین ہے وہ خود سے منحرف ہو جائے

نہ اعتراف بھی حیدرؔ کبھی کریں دونوں
اور اپنے پیار کی دنیا بھی معترف ہو جائے (۲۰)

حیدر قریشی نے کہیں کہیں محبوب کے ظاہری اوصاف کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کی ہے، مثلاً:

زباں ایسی کہ ہر اک لفظ مرہم سا لگے اس کا
نظر ایسی کہ اٹھتے ہی دلوں میں تیر ہو جائے (۲۱)

خود اپنے حسن کے نشے میں چور لگتا ہے
جو سر سے پاؤں تلک رنگ و نور لگتا ہے (۲۲)

(۳) منفی اقدار پر طنز

حیدر قریشی کی غزل میں ان کی پوری تخلیقی شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے، اس شخصیت کا آدرش آزادی اور وسیع المشرب روایت کو آگے بڑھانا ہے۔ وہ اپنے اجتماعی احساس اور خواب کی صورت گری شعری پیمانوں میں کرتے

ہیں جہاں اُن کی تجزیاتی فکر سماج کے باطن میں چھپے منفی عناصر کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔اس حوالے سے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

منافقت کا ہنر آ سکا نہ حیدرؔ کو
ہنروروں میں یہی بے کمال باقی ہے (۲۳)

نہیں اس جیسی عیاری تو ممکن ہی نہیں تھی
زمانے سے ذرا بس استفادہ کر لیا ہے (۲۴)

اُردو شاعری میں ''فقیہہَ شہر'' بھی استحصال کی علامت ہے حیدر قریشی کی غزل میں یہی علامت منفی اقدار کو نمایاں کرتی ہے:

فقیہِ شہر کی باتوں کا احترام کرو
چمن کو دشت کہو، دشت کو چناب لکھو (۲۵)

پروفیسر سید محمد عقیل نے لکھا ہے:

''غزل میں مخصوص نظامِ زندگی، معاشرت اور تہذیب
کے بھی دھارے بہتے رہتے ہیں۔''(۲۶)

اصل میں یہ شاعر کا اپنا فکری نظام ہے جو غزلوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔حیدر قریشی کی غزل میں جو تہذیبی اُفق ابھرتا ہے وہ قاری کی فکری تربیت بھی کرتا ہے۔حیدر قریشی اپنے مشاہدات اور مفروضات میں دوسروں کو شریک کرنے کا فن جانتے ہیں یہ مثال دیکھیے:

وزیر، فیل اور شاہ پھر سے بدل رہا ہے
وہ چال، شاید اب اور ہی کوئی چل رہا ہے (۲۷)

ایک اور شعر کے تیور ملاحظہ ہوں:

اپنے حق میں تُو بھلے کتنی گواہی لائے
بے گناہی سے بریت نہیں ہونے والی (۲۸)

ہمارے معاشرے ضدی، مغرر، بے حس اور بے عمل عالموں پر یہ شعر تازیانے کا کام کرتا ہے:

تم اہلِ علم وفضل ہو لیکن کچھ اس طرح
جیسے کوئی کتاب ہو دیمک لگی ہوئی (۲۹)

ڈاکٹر محبوب راہی رقمطراز ہیں:

''حیدر قریشی کی غزل رنگینیِ تخیل کا محض نگار خانہ نہیں،
جیتی جاگتی زندگی کے رنگا رنگ حقائق کا منظر نامہ پیش
کرتی ہے۔'' (۳۰)

حیدر قریشی کی شاعری کا فکری حوالہ خاصا مضبوط ہے، انھوں نے سماج کے کثیر الجہات، سنجیدہ موضوعات کو اپنی غزل کا حصہ بنا کر یہ تخلیقی سرمایہ محفوظ کیا ہے۔یہ ذخیرہ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے ثروت مند ہے۔

(۴) خدا کا تصور

حیدر قریشی کے فکری نظام میں تصورِ خدا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔یہ تصور اپنی تمام تر ہمہ جائیت، ہمہ دانیت اور قادرِ مطلقیت کے ساتھ ان کی تقریباً تمام اصناف میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود رہتا ہے۔حتیٰ کہ اُن کے افسانوں میں بھی یہ حرکی تصور مرکزی دھارے کے طور پر موجود ہے۔یہ تصور اگر چہ ایمانی حوالہ ہے لیکن حیدر قریشی نے اپنی تحریروں میں اس کا منطقی جواز فراہم کرنے کی سعی بھی کی ہے۔اُن کے پہلے شعری مجموعے ''سلگتے خواب'' کی ایک غزل کا شعر توجہ طلب ہے:

کعبے میں جا کے یا کہیں پتھر تراش کر
ممکن ہو جس طرح بھی خدا کو تلاش کر (۳۱)

دورِ جدید میں جہاں نئے نئے علوم وفنون کی وجہ سے مادیت پرستی کا رواج عام ہوا وہاں خدا سے دوری یا خدا ناشناسی کا چلن بھی اپنی جگہ بنا چکا ہے اور یہ روش مشرق اور مغرب دونوں جگہ فعال ہے۔حیدر قریشی کے نزدیک ایسے انتہا پسندانہ رویے کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہیں اس لیے ان کا کہنا ہے کہ ''ممکن ہو جس طرح بھی خدا کو تلاش کر'' ماہنامہ ''شاعر'' کے مدیر افتخار امام صدیقی نے اپنے انٹرویو میں حیدر قریشی سے خدا کے حوالے سے ایک سوال پوچھا تھا وہ سوال وجواب بھی ان کے تصورِ خدا کو قطعی طور پر واضح کرتا ہے:

سوال: '' کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟

جواب: بہت گہرا یقین اور اس یقین کے کئی ذاتی تجربے بھی ہیں۔'' (۳۲)

خدا پر غیر مشروط ایمان کی وجہ سے ان کا اعتماد بھی بڑھ گیا ہے اور اب ان کے سامنے کسی قسم کی مشکل باقی نہیں رہی اسی لیے وہ کہتے ہیں:

خدا ہے مشکل کشا تو حیدرؔ
کوئی بھی کار محال کیا ہے (۳۳)

یہ اسی ایمان کا نتیجہ ہے کہ اب زمینی خدا ان کا راستہ نہیں روک سکتے:

؎ زمیں کے جھوٹے خداؤں سے کچھ نہیں لینا
مرا معاملہ اب صرف اپنے رب سے ہے (۳۴)

خدا سے وابستہ دوسرا اہم تصور توحید کا ہے اس حوالے سے یہ شعر ملاحظہ ہو

؎ تیری وحدت سے سمجھ پائے تجھے
اور کثرت میں نظارہ کر لیا (۳۵)

توکل کی ایک مثال اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے، یہ توکل صرف انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو ذاتِ خداوندی پر کامل ایمان کی کیفیات سے سرشار ہوتے ہیں:

؎ خدا پہ چھوڑ دو سارا معاملہ حیدرؔ
نتیجہ جو بھی نکل آئے استخارے کا (۳۶)

عشقِ خداوندی کے اِنھی جذبوں نے حیدر قریشی کی غزل پرکشش بنائی ہے۔ اب ان کے لیے زندگی کے تمام رنگ اسی عشق کے طفیل حقائق کی صورت گری کرتے ہیں۔ خدا کو اس قدر قریب محسوس کرنے کا ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی دنیا میں پاکیزہ اور پرخلوص اقدار تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(۵) گزرتی عمر کا تذکرہ

نئی غزل نے شاعر کو موضوعاتی اور اُسلوبیاتی وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ عہدِ جدید کا شاعر حیات وکائنات کے چھوٹے بڑے مسائل کو شعری پیرائے میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا ہے۔ اِن شعری رویوں کو دروں بینی اور بیروں بینی کی اصطلاحوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی داخلیت پسندی یا دروں بینی شاعر کو اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے، اور اس کا تخلیقی عمل اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پانے کی سعی کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے ہاں داخلیت پسندی کا یہ رویہ نت نئے موضوعات تخلیق کرتا ہے۔ جس میں گزرتی عمر کا احساس قدرے حاوی جذبے کے طور پر اُبھرتا ہے۔ اس حوالے سے چند مثالیں حاضر ہیں:

؎ یہ کیسی وقت کی آندھی بدن پہ آئی ہے
کہ پھول پتے تو کیا میری ڈالیاں بھی گئیں
قویٰ جوڑ ڈھیلے پڑے اعتدال آنے لگا
جوانی ڈھلتے ہی بے اعتدالیاں بھی گئیں (۳۷)

؎ تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی (۳۸)

اپنی آدھی عمر گزرنے کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں:

؎ چار قدموں کا ہے زندگی کا سفر
دو قدم چل چکے، دو قدم رہ گئے (۳۹)

ایسا نہیں کہ ڈھلتی عمر نے ان کے جذبوں کو ماند کر دیا ہو، ابھی جوش و ولولہ قائم ہے:

؎ یہ ڈھلتی عمر بھی شعلے مرے بجھا نہ سکی
لہو میں اپنے ابھی اشتعال باقی ہے (۴۰)

گزرتی یا ڈھلتی عمر کے حوالے سے حیدر قریشی نے جتنے شعر بھی تخلیق کیے ان میں کرب اور دکھ کی حدّت تو موجود ہے لیکن مایوسی کا ذکر دور دور تک نہیں ہے۔ ان کی نظر زندگی کے وسیع منظر کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے خود کو کسی مصنوعی خول میں بند نہیں کیا ہے بلکہ ایک حساس اور روشن ضمیر تخلیق کار کی طرح اپنی دلی کیفیات کا برملا اظہار کر دیا ہے۔

(۶) فلسفۂ عشق

حیدر قریشی کا تہذیبی مزاج جہاں زندگی کی کلاسیکی قدروں کو اپناتا دکھائی دیتا ہے وہاں ان کا فلسفۂ عشق بھی عصرِ حاضر کے مسائل کو اپنی ذات میں سمونے کی کوشش کرتا ہے اور یوں عشق کی وجدانی تحریک ان کی شاعری میں فکر ونظر کے تشکیلی اجزاء کو از سرِ نو ترتیب دیتی چلی جاتی ہے، یہی جذبۂ عشق زندگی کی طویل جدوجہد میں ان کا اصلی رفیق اور ہم راز ہے۔ اس جذبۂ عشق کے کچھ انداز پیشِ خدمت ہیں:

؎ عشق کے قصے سبھی مجھ پہ ہوئے آ کے تمام
کوئی مجنوں، کوئی رانجھا نہ ہوا میرے بعد (۴۱)

اس عشق کی شدت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ شعر پڑھنا بہت ضروری ہے:

؎ روز طوفان اٹھانے کی مشقت تھی اسے
دشت بے چارے کو آرام ملا میرے بعد (۴۲)

مندرجہ فوق دونوں اشعار میں تعلّی کا انداز اپنی جھلک دکھا رہا ہے لیکن پس پردہ شاعر کی عشقیہ توانائی کا اظہار قاری کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ منزہ یاسمین نے لکھا ہے:

"حیدر قریشی نے اپنی شاعری میں عشق کو محض تذکرے کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ انہوں نے عشق کو اس کی تمام تر حرارتوں اور جذباتی محرکات کے ساتھ پیش کیا ہے۔"
(۴۳)

مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

؎ اے خدا! ڈر ہے مجھے طے ہی نہ ہو جائے کہیں
منزلِ عشق کو دو چار قدم رہنے دے (۴۴)

یہ شعر اس بات کی بھرپور غمازی کرتا ہے کہ حیدر قریشی کو اپنے عشق پر نہ صرف ناز ہے بلکہ وہ عشق کی تمام منازل طے کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔اُردو ادب کے معروف انشائیہ نگار اور نقاد اکبر حمیدی کا نقطۂ نظر قدرے مختلف ہے، اُن کا کہنا ہے:

''حیدر قریشی کی غزل میں عشق ایک مسئلے کی شکل میں
دکھائی دیتا ہے جو حل نہیں ہوتا بلکہ مسلسل اُلجھتا چلا جاتا
ہے۔ یہ برائے بیت نہیں جیسا کہ اکثر شاعروں کے
ہاں ہم محسوس کر سکتے ہیں۔'' (۴۵)

اس بیان کا پہلا حصہ محلِ نظر ہے، اکبر حمیدی نے اپنے دعوے کی دلیل میں کوئی مثال پیش نہیں کی جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ عشق کے اُلجھاوے سے وہ کیا مراد لے رہے ہیں۔حیدر قریشی کی غزل میں عشق کا جذبہ خلوص اور فکری گہرائی کا پروردہ ہے، اُن کا فلسفہ عشق تقلید، فرسودگی، باسی پن اور روایتی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ یہ عشق انفرادی وجدان کا زائیدہ ہے۔عشق کی یہی توانائی ان کی شاعری کو پُرکشش اور دل کش بناتی ہے۔اگرچہ عشق کا مسئلہ اُن کی غزل میں حل ہوتا دکھائی نہیں دیتا تاہم یہ کسی اُلجھاوے کا شکار بھی نظر نہیں آتا۔عشق کے بارے میں حیدر قریشی کی رائے بہت واضح اور مثبت ہے۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:

؎ اہلِ دنیا بھلا اس رمز کو کیسے سمجھیں
عشق رسوا نہیں ہوتا کبھی رسوائی سے (۴۶)

؎ یہ سوچ لیجئے پہلے یہ بازارِ عشق ہے
سودا تو مل ہی جائے گا پر نقدِ جان پر (۴۷)

حیدر قریشی کا فلسفۂ عشق کے حوالے سے اصل نقطۂ نظر اس شعر میں بیان ہو جاتا ہے:

؎ درد و غم سے اِسے نکھارتا ہے
عشق انسان کو سنوارتا ہے (۴۸)

یہ شعر بھی اُن کے تصورِ عشق پر روشنی ڈالتا ہے:

؎ نمازِ عشق تو پروانہ وار ہوتی ہے
پھر اس میں سجدہ، رکوع و قیام کا مطلب ! (۴۹)

حیدر قریشی نے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کی شاعری کا دارومدار ہی جذبۂ عشق پر ہے۔

؎ اک فرشتہ ہے عشق کا حیدرؔ
مجھ پہ جو شاعری اتارتا ہے (۵۰)

حیدر قریشی کا فلسفۂ عشق رجائیت پر مبنی ہے اور یہی ان کے فکر و تخیل کی اصل پہچان ہے۔ان کی شاعری میں یہ جذبہ کبھی جنون اور کبھی والہانہ محبت کی صورت سامنے آتا ہے اور فکری تہہ داری میں اضافہ کرتا ہے۔

(۷) اپنی ذات پر شعری تبصرے

غزل ایک ایسی صنف ہے جو ذاتی حالات و واقعات کو پیش کرنے کے لیے خاصی موثر ثابت ہوتی ہے۔حیدر قریشی کی غزل میں بھی ان کی ذات کسی نہ کسی حوالے سے اظہار پا جاتی ہے:

؎ کبھی تم چاند سے بڑھ کر تھے حیدرؔ
مگر اب خاک ہوتے جا رہے ہو (۵۱)

اپنی حالتِ زار کو ایسے بھی بیان کرتے ہیں:

؎ بے خانماں یہ شخص کہ حیدر ہے جس کا نام
اے ارضِ پاک دیکھ لے تیرا ہی لال ہے (۵۲)

حیدر قریشی کی غزل پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مسائل کی نوعیت جذباتی، ذاتی اور معاشی رہی ہے۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو اس کی شاعری میں شوریدہ سری اور تلخی در آتی لیکن حیدر قریشی کا فن اعتدال اور رکھ رکھاؤ کی حدود میں نمو پذیری کے مراحل طے کرتا ہے۔ مسائل کی آگ نے ان کی شخصیت اور فن کو جلایا نہیں، کندن بنایا ہے۔ وہ اپنی ناراضی، تکلیف اور دکھ کا اظہار بھی تہذیب اور شائستگی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔ ناسازگار حالات اور مخالفت کے باوجود وہ اپنے دکھوں کو بہت زیادہ نمایاں نہیں کرتے، کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

؎ کس کی سازش تھی کہ سائے رخ بدلنے لگ گئے
ہم جہاں بھی چند گھڑیاں رک کے ستانے لگے (۵۳)

؎ مشینوں کے اس عہدِ ناروا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا (۵۴)

؎ اک اعتدال رہا عمر بھر عزیز ہمیں
نہ بے اصول بنے ہم، نہ بااصول ہوئے (۵۵)

اکبر حمیدی زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے ہماری رہنمائی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'' اس کے مسائل اس کے حقیقی مسائل ہیں اور ان مسائل کو
شعری لباس پہنا کر اس نے جدید غزل میں اضافہ کیا ہے۔

یوں اس حیدر قریشی کا شمار آج کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے

وہ بے حد اوریجنل ہے۔۔۔اُردو کی جدید غزل کو حیدر قریشی

جیسے شاعروں کی بہت ضرورت ہے۔'' (۵۶)

حیدر قریشی کے ذاتی حالات کے تناظر میں یہ شعر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی کا نہایت قیمتی حصہ چینی کے کارخانے کی نذر ہو گیا تھا۔

؎ جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہا

مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا (۵۷)

(۸) اہلِ خانہ کا ذکر

حیدر قریشی کو اپنے اہل خانہ سے جو قلبی اور روحانی لگاؤ ہے اس کا ثبوت اُن کی شعری اور نثری تخلیقات میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اُنھوں نے جہاں ادیبوں اور دوستوں کے خاکے تحریر کیے وہاں اہلِ خانہ کے حوالے سے بھی یادگار خاکے تخلیق کر کے اپنی تصنیف میں شامل کیے ہیں۔ یادنگاری پر مشتمل اُن کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' بھی اہل خانہ کے ذکر سے بھری ہوئی ہے، اور اگر شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی قریبی رشتوں کا محبت بھرا ذکر ملتا ہے۔ محبت کا عملی ثبوت دینے کے لیے اپنے پانچ شعری مجموعوں کو بالترتیب اپنی زوجہ (مبارکہ) اپنے بیٹوں (شعیب، عثمان، طارق)، والدہ صاحبہ، والد صاحب اور ماموں (صادق) کے نام معنون کیا ہے۔ پہلے مجموعے ''سلگتے خواب'' کا انتساب زوجہ کے حوالے سے کچھ یوں ہے:

؎ استعارے تو کجا سامنے اس کے حیدؔر

شاعری ایک طرف اپنی دھری رہتی ہے (۵۸)

اپنے ایک اور مجموعے ''دردسمندر'' کو ماموں صادق کے نام موسوم کیا ہے:

؎ آنکھوں میں ابھی دھول سی لمحوں کی جمی ہے

دل میں کوئی سیلاب سا رونے کے لیے ہے (۵۹)

حیدر قریشی نے اپنے شعری مجموعے ''عمرِ گریزاں'' میں ایک پوری غزل اپنی بڑی بہن (آپی) کے لیے لکھی ہے۔ ''میری محبتیں'' میں آپی پر ایک جاندار خاکہ بعنوان ''محبت کی نمناک خوشبو'' موجود ہے، اس خاکے میں حیدر قریشی یہ اعتراف کرتے ہیں:

''ہم دونوں میں جو محبت ہے وہ شاید کسی اور بہن بھائی کے حصے میں نہیں آسکی۔'' (۶۰)

آپی کے حوالے سے لکھی گئی غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے، بخوف طوالت دو شعروں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

؎ اتنی محبت ہے کہ گماں جیسی لگتی ہے

ماں جاتی ہے لیکن ماں جیسی لگتی ہے۔

اس کے ہونٹوں کی محراب دعاؤں والی

اس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے (۶۱)

''دعائے دل'' (شعری مجموعہ) میں حیدر قریشی نے ایک غزل بڑے بیٹے شعیب کے نام کر دی ہے۔ اس غزل کے کل سات شعر ہیں اس کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو:

؎ محبت کا مزہ ہے ہجر میں بے تاب ہونے تک

بہاریں دل کی ہیں دکھ درد سے سیراب ہونے تک

چراغ نیم شب حیدر ابھی جلتے ہی رہنا ہے

سحر ہونے تلک، ظلمت سے فتح یاب ہونے تک (۶۲)

ایک اور غزل کے یہ تین شعر توجہ طلب ہیں۔

؎ اپنے بچپن سے جوانی کے زمانے تک کی

سونپ دی بچوں کو ہر ایک نشانی اپنی

صورت ابو کی اُبھر آئی مرے چہرے میں

دے گئی کیسی خوشی جاتی جوانی اپنی

آج اولاد کے آئینے میں حیدؔر ہم نے

تازہ کر لی ہے ہر اک یاد پرانی اپنی (۶۳)

حیدر قریشی نے اپنی والدہ سے اس طرح اظہار عقیدت کیا ہے:

؎ یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی

کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے (۶۴)

ڈاکٹر صابر آفاقی ایسے اشعار کو بنیاد بنا کر یہ کلیہ اخذ کرتے ہیں:

''حیدر قریشی انسان دشمنوں کی استواری اور اخلاقی قدروں کی پائیداری

کو تہذیب کی نشو و نما کے لیے ضروری سمجھتا ہے'' (۶۵)

(۹) احساس محرومی

حیدر قریشی حساس شاعر ہونے کے ناطے اپنے گرد و پیش کے اثرات دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ سماج میں موجود طبقاتی تنگ نظری، معاشی جبریت، دقیانوسی طرزِ فکر اور حق تلفی کے مناظر اُنھیں دکھی کرتے ہیں، عدم تحفظ اور غیر یقینی صورتِ حال نے ان کے اندر احساس محرومی کو بھی پروان چڑھایا ہے یہ شعر توجہ کا طالب

ہے:

زندگی حیدؔر بسر ہوتی رہی
جیسے کوئی گیت فریادوں کے بیچ (۶۶)

شاعر کے لیے بھی لمحہ فکر یہ ہے:

گھر گئے ہیں ناشناسوں میں کہاں
منہ کھڑے تکتے ہیں دلدادوں کے بیچ (۶۷)

مگر یہ احساس محرومی اس وقت شدت اختیار کر جاتا ہے جب شاعر کی بات سمجھنے والا آس پاس کوئی موجود نہ ہو:

عجیب لوگ ہیں بے چہرہ شہر کے حیدؔر
یہ تیری بات کا مطلب سمجھ نہ پائیں گے (۶۸)

حیدر قریشی اپنے محبوب سے گلہ مندی کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں :

نہیں تو صرف مرے حال سے نہیں واقف
وہ بے خبر جو جہاں بھر کے راز رکھتا ہے (۶۹)

یہ احساسِ محرومی کئی جہتوں میں پھیلا ہوا ہے اور شاعر کی زندگی کو مشکل بھی بنا رہا ہے:

نجانے کب کوئی آ کر بجھائے پیاس مری
میں کتنی صدیوں سے پیاسا ہوں پانیوں کی طرح
عبث ہے اب تو تلاش اور جستجو حیدؔر
وہ کھو چکے ہیں وفا کی نشانیوں کی طرح (۷۰)

ان اشعار میں موجود احساسِ محرومی کا جذبہ شاعر کی فکر پر غالب آ کر کوئی منفی رجحان پیدا نہیں کر رہا بلکہ اس کی فکر کو آفاق گیر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حیدر قریشی کا تنقیدی شعور احساسِ محرومی کو علویت کی طرف لے جاتا ہے یوں اُنھوں نے اپنی اضطراری کیفیت کو تعمیری تخلیقیت کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

(۱۰) رجائیت

حیدر قریشی کی شاعری میں رجائی عناصر ان کی تخلیقی قوت میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ وجود کے تمام مظاہر کو از سرِ نو پرکھ کر اپنے خوابوں، خیالوں، حادثوں اور کیفیات کا رخ متعین کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ اور شعور زیادہ دیر تک مایوسی کی حالت میں نہیں رہتے بلکہ اس گرداب سے نکل کر رجائی سرحدوں میں زندگی تلاشتے ہیں، اب وہ موت کو محض زندگی کا اختتام نہیں سمجھتے بلکہ اسے نئی زندگی کا اعلامیہ قرار دیتے ہیں۔

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی (۷۱)

مزید مثالیں:

گھٹن کب دیر تک رستہ ہوا کا روک پائی
اُسے کہہ دو کہ میں پھر سے رواں ہونے لگا ہوں (۷۲)

انتہائے تیرگی سے ہو گیا سورج طلوع
پیاس اتنی بڑھ گئی کہ خود سمندر ہو گئی (۷۳)

یہ شعر پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مایوسی نے ان کا راستہ کبھی نہیں روکا۔ حیدر قریشی کی فکری بالیدگی زندگی کے ہر موڑ پر رجائیت کو ہمراہ رکھتی ہے۔

(۱۱) فکر و فلسفہ

حیدر قریشی کا فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز فکر بھی ان کی غزلیہ شاعری کا لازمی حصہ ہے وہ اپنے اردگرد موجود انسانی رویوں اور فطری مظاہر کو تجزیاتی نظر سے دیکھتے ہیں اور پھر کمال مہارت سے اپنا فلسفیانہ نقطۂ نظر شعری پیرائے میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی نظر گہری اور تجزیات بعض معروضی سطح پر ابلاغ کرتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

بڑھنے گھٹنے کا عجب ہے سلسلہ
بڑھ گئے حد سے تو سمجھو گھٹ گئے (۷۴)

عطا زمیں کی ہیں رسمیں، روایتیں ساری
کسے خبر ہے کہ کتنا شعور خاک میں ہے (۷۵)

جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر
دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے (۷۶)

یہی تذبذب و تشکیک اب سند ٹھہرے
سند سمجھتے تھے جن کو وہ مستند نہ رہے (۷۷)

(۱۲) حقیقت پسندی

شاعری خواہ کتنی ہی تصوراتی اور تخیلاتی کیوں نہ ہو جائے وہ زمان و مکاں کے حقائق سے بھی ایک واضح علاقہ ضرور رکھتی ہے۔ یہ حقائق معاشرتی ہوتے ہیں اور خالصتاً تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کے وجدان اور احساس کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ حیدر قریشی کی شاعری میں مجرد اور خالص عقلیاتی مکالمے نظر آتے

ہیں، جواُن کی حقیقت پسندی پر روشنی ڈالتے ہیں:

اعتبار اک دوسرے پر کب ہمیں تھا زندگی
جھوٹی موٹی دوستی تھی اور نبھانی پڑ گی (۷۸)

شرطوں پہ محبت کی کوئی بات نہ کرنا
یہ تیرا طلب گار شہنشاہ نہیں ہے (۷۹)

ابھی تو اس نے کئی عہد مجھ سے کرنا ہے
ابھی تو اس نے ہر ایک عہد سے مکرنا ہے

تو کیوں نہ مل لیں ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے
یہ جب یقیں ہے کہ ایک دن ہمیں بچھڑنا ہے (۸۰)

مندرجہ بالا اشعار کسی ایسے شاعر کے نہیں ہو سکتے جو محض خیالی دینا سے دل چسپی رکھتا ہو۔ یہ شاعر لوگوں کے بدلتے رویوں سے پوری طرح آگاہ ہے اوران رویوں کو سہنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔

(ب) فنی اور اُسلوبیاتی محاسن

حیدر قریشی کا فکری اُسلوب جہاں حیات وکائنات کے اہم مسائل سے تعرض کرتا ہے وہاں شعری اُسلوب میں فنی محاسن کی موجودگی معیار و اعتبار کے نئے علاقے قائم کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنا وسیلۂ اظہار موثر بنانے کے لیے عمدہ الفاظ، معیاری زبان و بیان، بلیغ تراکیب، معنی خیز استعارات وتشبیہات اور جدید علائم و رموز کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ مواد و ہیئت کا سلجھا ہوا امتزاج اور ارتکاز اُن کی غزل کا وقار بڑھاتا ہے، ذیل میں اہم فنی محاسن کو موضوع بنایا گیا ہے۔

(ا) تلمیحات

علمِ کلام اور معنی و بیان کو گہرا اور تہہ دار بنانے کے لیے تلمیح کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس کا استعمال صدیوں پرانا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر تلمیح کی تعریف پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ’’علم بدیع کی اصطلاح میں تلمیح اس شاعرانہ حربے کو کہتے
> ہیں جس کے تحت کہنے والا یا لکھنے والا اپنے کلام یا تحریر
> میں کم سے کم الفاظ میں کس قصے، آیت، حدیث، شخصیت
> یا مشہور واقعے کی طرف اشارہ کرے‘‘ (۸۱)

تلمیح عام طور پر مرکب الفاظ یا تراکیب پر مشتمل ہوتی ہے جیسا کہ آبِ حیات، اورنگ سلیمانؑ، صبر ایوبؑ اورلن

ترانیؑ وغیرہ اور بعض اوقات مفرد الفاظ بھی تلمیح کا مفہوم ادا کر دیتے ہیں، مثلاً معراج، کربلا، سقراط اور فرعون وغیر ہ۔

حیدر قریشی کی غزلوں میں تلمیح کا یہ دوسرا انداز قدرے غالب ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

جبر کے کرب و بلا کی خاک میں رُلتی ہوئی
زندگی بھی حضرت زینبؓ کی چادر ہوگئی (۸۲)

کربلا کی نسبت سے کچھ مزید تلمیحات:

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں (۸۳)

جب یزیدِ عصر کے لشکر سے باہر آگئے
حر سے نسبت اپنی بھی تھوڑی سی حیدرؔ ہوگئی (۸۴)

حیدر قریشی کی تلمیح کا ایک جدید آہنگ یہ بھی ہے:

رومیؔ کو حیدرؔ جب بھی پڑھنے لگتا ہوں
باطن کی دنیا طبریزی ہو جاتی ہے (۸۵)

عشق و محبت کے حوالے سے یہ تلمیح لائق توجہ ہے:

کام ہمارے حصے کے سب کر گیا قیس دوانہ
کون سا ایسا کام تھا باقی جس کو اب ہم کرتے (۸۶)

حیدر قریشی کی غزل میں تلمیح کا ایک ایسا انداز بھی ملتا ہے جس میں اُنھوں نے تلمیح کی وضاحت کے لیے کوئی خاص لفظ یا ترکیب تو استعمال نہیں کی البتہ شعری فضا میں ایسے لطیف اشارے رکھ دیئے ہیں جس سے تلمیح کا لطف پیدا ہو گیا ہے اور پڑھنے والے کا ذہن فوراً اصل تلمیح تک جا پہنچتا ہے، شعر ملاحظہ ہو:

رہا نہ دھیان کسی کو دیا بجھانا تھا
جب اس کو میں نے، مجھے اس نے آزمانا تھا (۸۷)

غرض حیدر قریشی نے تلمیحات کا استعمال بڑی عمدگی اور ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ کیا ہے اور کسی مقام پر اصل تلمیح کی جمالیات متاثر نہیں ہونے دی بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ تلمیح کے حسن کو دوبالا کرنے کی خاطر تلازمات کا بھی سہارا لیں۔ تلمیح میں تلازمات کا اضافہ اس صنعت کو مزید نکھارتا ہے، ایک مثال دیکھیے:

پھر قصرِ زلیخا میں رسائی بھی ہو کیسے
کنعانِ تمنا میں کوئی چاہ نہیں ہے (۸۸)

حیدر قریشی کی فکر اصلاً رجائیت پر اُستوار ہے لہٰذا اُن کا فنی حوالہ بھی ہر قسم کے منفعلانا اور قنوطی وسیلے کو رد کر دیتا ہے وہ تحرک اور نمو کے قائل ہیں فعال اندازِ نظر اُن کے فن کی پہچان ہے:

ے ہم کہاں کے کوئی سقراط تھے پر ہم پر بھی
آئے الزام نئی نسل کو بہکانے کے (۸۹)

ڈاکٹر شفیق احمد نے حیدر قریشی کی تلمیحات میں سے ایک نیا نکتہ یہ اخذ کیا ہے:

''حیدر قریشی کی شاعری میں تقریباً تمام صنائع شعری ملتے
ہیں لیکن تلمیحات کثرت سے ہیں۔اس حوالے سے یہ
بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ غالبؔ کے ہاں تلمیحات زیادہ
تر ایرانی ادبیات سے ماخوذ ہیں اور اقبال کی تلمیحات کا
دائرہ اسلام اور اسلامی تاریخ پر محیط ہے، لیکن حیدر قریشی
ہندی تلمیحات کو بھی کام میں لاتے ہیں۔'' (۹۰)

اس ہندی رنگ کی دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

ے تمہارے نام کے ساتھ اپنے نام کا مطلب
وہی جو ہوتا ہے رادھا سے شامؔ کا مطلب (۹۱)

ے پریوں کے جمگھٹے میں جو اِندر بنا رہا
عمرِ عزیز! وہ تیرا حیدرؔ کدھر گیا (۹۲)

حیدر قریشی نے اپنی غزل میں جن کلاسیکی تلمیحات کا سہارا لیا ہے اس کے طفیل ان کا کلام زیادہ بامعنی، نتیجہ خیز، لطیف اور مؤثر ہو گیا ہے، اُن کی پیش کردہ تلمیحات معنی آفرینی اور جمال آفرینی کا خوبصورت مرقع ہیں۔اِن تلمیحات میں تفکر و تخیل کی ہم آہنگی خیال انگیز ہے۔

(۲) تغزل

معیاری شعر کے اجزائے ترکیبی میں خیال بندی اور کیفیت کے عناصر اپنی فنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں تغزل کا تعلق کیفیت کے ساتھ ہے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تغزل کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعر کے عام اوصاف کے علاوہ غزل کے شعر میں بعض
کا خاص عناصر بھی ہوتے ہیں مثلاً نفاست و نزاکت، نکتہ
سنجی، رمز و ایما، تعمیم، گداز، بے ساختگی اور جذبے کا

سوز و گداز اِن عناصر کے مجموعے کو تغزل کہا جاتا ہے''
(۹۳)

تغزل صرف صنف غزل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ وصف کسی بھی شعری صنف میں پایا جا سکتا ہے۔ان اوصاف کا معیاری ہونا شرط ہے، محض سطحی جذبات کو موزوں کرنے سے تغزل پیدا نہیں ہوتا۔اسی طرح شدید جذبات اور بوجھل احساسات بھی تغزل سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔تغزل روح کی لطافتوں میں خوشگوار اضافہ کرتا ہے۔حیدر قریشی کی غزل میں تغزل کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں۔کہیں یہ تغزل کومل سروں میں اپنا راگ چھیڑ جاتا ہے اور کہیں جذبے کی دھیمی آنچ خیال انگیزی کو ہوا دے جاتی ہے:

ے ہماری عمر کی یہ آخری محبت ہے
سو اب کے بار محبت کی کوئی حد نہ رہے (۹۴)

ے تشریف تو لے آئے وہ حیدرؔ دمِ رخصت
سو اپنے لیے اتنی عنایت ہی بہت ہے (۹۵)

ے چند لمحے وہ ان سے ملاقات کے
میری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے (۹۶)

ے ہر آن ہے گمان کہ شاید وہ آ گئے
دھڑکن ہے دل کی یا کوئی دستک لگی ہوئی (۹۷)

ان اشعار میں خیال کی ترتیب اور نزاکت قلبی واردات کو جمالیاتی آہنگ کے ساتھ مربوط کر رہی ہے جس کی وجہ سے شعر کی لطافت اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے اور پڑھنے والے پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہے۔اس ضمن میں درج ذیل اشعار بھی توجہ طلب ہیں:

ے پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا (۹۸)

ے گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک روح میں مہکار کا احساس باقی ہے (۹۹)

ے وہ نام لکھوں تو لفظوں سے خوشبوئیں اُٹھیں
وہ دے گیا جو مہکتے ہوئے خیال مجھے (۱۰۰)

(۳) صنعت تضاد یا طباق

صنعتِ تضاد کا تعلق صنائع معنوی کے ساتھ ہے مولوی نجم الغنی نے ''بحر الفصاحت'' میں اس کی تعریف ان الفاظ

میں کی ہے۔

''اس کوصنعت تضاد، مطابقت اور تکافو بھی کہتے ہیں۔یعنی ایسے الفاظ استعمال میں لائے
جائیں جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے فی الجملہ ضد اور مقابل ہوں۔''(۱۰۱)

حیدر قریشی نے جن شعری وسائل کو برتا ہے اس میں صنعتِ تضاد کا بھی خاص التزام ملتا ہے۔ یہ صنعت ان کے حسیاتی ادراک کے تابع ہے اور ان کے ذہن کی تلازماتی قوت کو ظاہر کرتی ہے:

صنعت تضاد کی نمائندہ مثالیں:

ے بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدرؔ
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں (۱۰۲)

ے دیکھا خلوص موت کا تو یاد آ گیا
کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے (۱۰۳)

ے مرے ہی خواب کنوارے نہیں رہے اب تو
کہ آرزوئیں تری بھی بیاہیاں نہ گئیں (۱۰۴)

محولہ بالا مثالوں میں صنعتِ تضاد کا اہتمام دونوں مصرعوں میں کیا گیا ہے البتہ چند غزلوں میں صنعتِ تضاد کو ایک ہی مصرعے میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش بھی ملتی ہے:

ے کسی کے جور و ستم کی حیدرؔ کرامتیں ہیں
بجھا ہوا ہے یہ دل مگر پھر بھی جل رہا ہے (۱۰۵)

خود اپنے آپ سے احوال کہہ کے روتے رہے
کہ شہر دل کو جلانا تھا اور بجھانا تھا (۱۰۶)

☆ قوافی میں صنعتِ تضاد کی مثال

ے جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا
سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا (۱۰۷)

حیدر قریشی کی غزل میں صنعتِ تضاد کی ایک مثال ایسی بھی ہے جس میں پہلے مصرعے کے دوسرے لفظ اور دوسرے مصرعے کے دوسرے لفظ میں تضاد کا علاقہ دکھایا گیا ہے۔صنعتِ تضاد میں لفظوں کی یہ ترتیب گہرا تاثر پیدا کرتی ہے۔

ے پہلے غم سے نہال کرتا تھا
اب خوشی سے نہال کر ڈالا (۱۰۸)

کہیں جذبے کی شدت کو دوآتشہ کرنے کے لیے حروفِ عطف کی مدد سے ایک لفظ کے دو متضاد علاقے برت کر اپنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے:

ے اک حقیقت کے روپ میں آ کر
مجھ کو خواب و خیال کر ڈالا (۱۰۹)

صنعت تضاد کا یہ تکنیکی تنوع ان کی شاعری کو پر کشش بناتا ہے۔

(۴) تکرار لفظی

شاعری کے فنی لوازم میں صنعتِ تکرار یا تکریر کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔مولوی نجم الغنی نے اس ضمن میں ''بدائع الافکار'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''دولفظوں کو، جو ایک ہی معنے رکھتے ہوں، مصرعوں یا شعر میں برابر جمع کرنا''(۱۱۰)

صنعتِ تکرارِ لفظی کی سات قسمیں ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔تکرارِ مطلق — ۲۔تکرارِ مثنٰی
۳۔تکرارِ مستانف — ۴۔تکرارِ مشبہ
۵۔تکرارِ مع الوسائط — ۶۔تکرارِ موکد
۷۔تکرارِ حشو

حیدر قریشی کی غزل میں ان سات اقسام میں سے چند ایک کا استعمال ہوا ہے جس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

(الف) تکرارِ مطلق

نجم الغنی تکرارِ مطلق کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ اس طرح ہے کہ ایک شعر میں لفظ مکرر آویں، خواہ دونوں
مصرعوں کے اول میں ۔۔۔یا مصرع اول کے شروع میں یا
مصرع ثانی کے شروع میں'' (۱۱۱)

غرض اس کا اہتمام دونوں مصرعوں میں کسی بھی جگہ ممکن ہے حیدر قریشی کے ہاں اس کی وافر مثالیں موجود ہیں:

ے روشنی روشنی سی ہر سُو ہے
یہ ترا دھیان ہے کہ خود تو ہے (۱۱۲)

ے نہیں ہے کوئی بھی اُمید جس کے آنے کی
دل اس کے آنے کے سو سو قیاس رکھتا ہے (۱۱۳)

ے کسی کے گاؤں جا کے دل میں آبلے سے پڑ گئے

گلاب جیسے لوگ تھے کہ خار خار ہو گئے (۱۱۴)

(ب) تکرارِ مستانف

مولوی نجم الغنی تکرار یا تکریرِ مستانف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لفظ ایسے مکرر آئیں کہ پہلے لفظ کے بعد دوسرا لفظ لانے سے معنی کی تجدید ہو جائے۔
لفظ تو وہی ہوتا ہے مگر اس کے آنے سے معنے میں نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے''(۱۱۵)

حیدر قریشی نے دوسرے لفظ میں معنی کی تجدید ایسے انداز سے کی کہ اسے قافیہ بنا دیا، مثلاً ایک غزل کا مطلع یوں ہے:

اسی خموشی کو تیرا جواب ہونا ہے
ہمارے صبر نے سیلِ چناب ہونا ہے (کلیات:ص۸۶)

حیدر قریشی نے اس غزل کے چوتھے شعر میں تکرارِ مستانف کا اہتمام اس انداز سے کیا ہے:

ابھی کچھ اور بھی الزام وہ لگائے گا
پھر اس کے بعد اسے آب آب ہونا ہے(۱۱۶)

ایک اور غزل کا مطلع اس طرح ہے:

دل کہیں پر ہے اور دماغ کہیں
اپنا ملتا نہیں سراغ کہیں (۱۱۷)

اسی غزل کے پانچویں شعر میں تکرارِ مستانف کا استعمال ملاحظہ ہو:

خواب مجھ سا ہی دیکھ کر کوئی
ہو رہا ہو گا باغ باغ کہیں (۱۱۸)

☆ تکرارِ مطلق کی منفرد مثال

تکرارِ مطلق کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ شعر کے دونوں مصرعوں میں لفظی تکرار پیدا ہو جائے:

لوگ مر مر کے جی رہے ہیں آج
اور جی جی کے مر رہا ہوں میں (۱۱۹)

ج۔ تکرار مع الوسائط

مولوی نجم الغنی نے اس کی تعریف میں لکھا ہے:

''دو لفظ مکرر کے درمیان کوئی لفظ واسطہ واقع ہو۔''(۱۲۰)

اور پھر مثال میں یہ شعر درج کیا ہے:

جان حاسد پہ برستی تھی پڑی نار پہ نار

دل پہ یاں اپنے اُترتا تھا سدا نور پہ نور (۱۲۱)

حیدر قریشی کی غزل میں تکرار مع الوسائط کی مثال قابلِ توجہ ہے:

خواب کی دنیا میں کتنی دیر تک رہتے بھلا
اک نہ اک دن تو ہمیں بیدار ہونا تھا ہوئے (۱۲۲)

حیدر قریشی نے غزل میں صنعتِ تکرار لفظی کے متنوع زاویے متعارف کرا کے اپنی فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

(۵) تشبیہات کا استعمال

تشبیہ علمِ بیان کا اہم رکن ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اپنی تصنیف ''اُردو اور تدریسِ اُردو'' میں تشبیہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'' لغوی معنوں میں تشبیہ ایک چیز کو دوسری چیز کے معنی
میں شریک کرنے کو کہتے ہیں، لیکن اصطلاح میں ایک
شئے کو کسی دوسری جیسا ظاہر کرنا تشبیہ کہلاتا ہے۔
(۱۲۳)''

تشبیہ کے چار ارکان ہیں یعنی مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ اور حرفِ شبہ، تشبیہ کی کئی اقسام اردو ادب میں مروج ہیں، حیدر قریشی کی غزل میں عموماً تشبیہ مفصل یا مطلق کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ اس نوع کی تشبیہ میں چاروں ارکان اپنی پوری صحت کے ساتھ مذکورہ ہوتے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ممکنہ حد تلک شب سے اُلجھے تو ہیں
جگنوؤں کی طرح گو چمکتے رہے (۱۲۴)

کچھ اس طرح ڈوبنے لگی ہے یہ دل کی دھڑکن
کہ جیسے دھیرے سے کوئی گھر سے نکل رہا ہے (۱۲۵)

زندگی حیدؔر بسر ہوتی رہی
جیسے کوئی گیت فریادوں کے بیچ (۱۲۶)

نہیں وہ رنگ پہ رنگوں سا عکس ہے اس کا
نہیں وہ پھول پہ پھولوں سی باس رکھتا ہے (۱۲۷)

حیدر قریشی کی تشبیہات سادہ اور پُر اثر ہیں اُنھوں نے تشبیہ کے روایتی انداز کو اپنایا ہے اور اپنی تقریباً تمام غزلوں

میں تشبیہِ مطلق کو برتا ہے اگر چہ وہ نئی اور جدید غزل پر بھروسا کرتے ہیں لیکن تشبیہہ کے ضمن میں وہ قدما کی پیروی کو کافی سمجھتے ہیں۔

(۶) استعارات کا استعمال

استعارہ علم بیان کا اہم ارکن ہے اس کا لغوی مفہوم ہے ''ادھار لینا'' استعارے کا تعلق مجاز کی اعلیٰ صورتوں کے ساتھ ہے۔ ''علمی اُردو لغت'' کے مولف وارث سرہندی نے استعارے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''کسی لفظ کو اصل معنی کی بجائے کسی اور معنی میں استعمال کرنا جب کہ ان دونوں میں تشبیہہ کا تعلق ہو۔'' (۱۲۸)

علمائے علم بلاغت نے استعارے کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے یعنی استعارہ بالتصریح اور استعارہ بالکنایہ، حیدر قریشی کی غزلوں سے کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں جس میں استعارے کو خوبی سے باندھا گیا ہے۔ اگر چہ وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں:

ے استعارے تو کجا سامنے اس کے حیدرؔ
شاعری ایک طرف اپنی دھری رہتی ہے (۱۲۹)

مگر استعاروں کا خوبصورت استعمال بھی کرتے ہیں:

ے عجب اب کے طلسمِ خامشی طاری کیا اس نے
وہ جادوگر نہ کچھ سنتا نہ کچھ ارشاد کرتا ہے (۱۳۰)

ے ستم گر حوصلے کی داد تو دینے لگا حیدرؔ
اگر چہ داد میں بھی وہ مجھے بے داد کرتا ہے (۱۳۱)

ان اشعار میں ''جادوگر'' اور ''ستم گر'' کے الفاظ مجازی حوالے سے محبوب کے لیے استعمال کر کے استعارہ بنایا گیا ہے۔

(۷) سہل ممتنع

سہل ممتنع کا دارومدار سادگی، سلاست اور آسانی پر اُستوار ہے جب کوئی سادہ اور رواں شعر پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرے کہ ایسا شعر تو میں بھی لکھ سکتا ہوں لیکن وہ لکھ نہ سکے تو ایسی خوبی کو سہل ممتنع کہا جاتا ہے میر تقی میرؔ اور ناصرؔ کاظمی کے ہاں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ حیدر قریشی کی غزلوں میں سہل ممتنع کی امثال بآسانی مل جاتی ہیں۔

ے عجب بے کیف سی ہے زندگی پچھلے مہینے سے
نہ کوئی یاد آتا ہے نہ کوئی یاد کرتا ہے (۱۳۲)

ے خواب کی دنیا میں کتنی دیر تک رہتے بھلا
اک نہ اک دن تو ہمیں بیدار ہونا تھا ہوئے (۱۳۳)

ے اب کے اس نے کمال کر ڈالا
اک خوشی سے نڈھال کر ڈالا (۱۳۴)

ان مثالوں میں سہل متمنع کے جملہ اوصاف پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔

(۸) الفاظ کا چناؤ اور برتاؤ

غزل جیسی نازک صنف میں الفاظ کی بحث خاص اہمیت رکھتی ہے اُردو، عربی اور فارسی میں اس موضوع پر خاطر خواہ تحقیقات اور تجزیات وتنقیدات موجود ہیں۔ اُردو زبان میں شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن کی گراں قدر تصنیف ''مرۃ الشعر''، مولوی احمد دین کی ''سرگزشتِ الفاظ'' اور غلام ربانی کی کتاب ''الفاظ کا مزاج'' میں ''لفظ'' کی ماہیت، معنی، ارتقا اور تاثیر پر سیر حاصل مقدمات ملتے ہیں غلام ربانی لکھتے ہیں:

''الفاظ، اینٹ اور پتھر کی طرح بے جان نہیں ہوتے۔ یہ جانداروں کی طرح پیدا ہوتے، بڑھتے اور مر جاتے ہیں ان میں شریف بھی ہوتے ہیں اور رزیل بھی، سخت بھی ہوتے ہیں اور نرم بھی کسی میں شہد کی سی مٹھاس ہوتی ہے۔ اور کوئی کڑوا ہوتا ہے۔ کسی میں ترنم ہوتا ہے اور کوئی چٹان کا روڑا ہوتا ہے ان میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی'' (۱۳۵)

حیدر قریشی ''لفظ'' کی نامیاتی قوت سے پوری طرح آگاہ ہیں اُنھوں نے ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے اور ہر ممکن طریقے سے آسان، علم فہم، بامعنی اور سلیس الفاظ کی مدد سے دل کی بات شعر میں بیان کر دی ہے۔ ان کے نزدیک لفظ کی فصاحت اور بلاغت کا معیار سادگی اور فطری پن ہے ان کے تمام شعری سرمائے میں نامانوس اور بوجھل الفاظ نظر نہیں آتے۔ وہ الفاظ کی صوری اور معنوی جمالیات کا ہر دم احساس رکھتے ہیں۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

ے اپنی ذات کے دروازے تک آ پہنچے
بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں (۱۳۶)

ے ایک خوش خط سے شخص نے حیدرؔ
ہم کو بھی خوش خیال کر ڈالا (۱۳۷)

ایک غزل کے کچھ شعر توجہ چاہتے ہیں:

مرجھائے ہوئے پھول کی خوشبو ہے کہ تو ہے
یہ حسن کا ٹوٹا ہوا جادو ہے کہ تو ہے
آنکھوں کو یقیں آیا نہیں خود پہ ابھی تک
ایک وہم سا پھیلا ہوا ہر سو ہے کہ تو ہے
مٹنے ہی جو والا ہے ابھی خاک پہ گر کر
پلکوں پہ لرزتا کوئی آنسو ہے کہ تو ہے (۱۳۸)

حیدر قریشی کا غزل میں استعمال ہونے والا ذخیرۂ الفاظ ابلاغ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے اُردو شاعری (خواہ جدید ہو یا قدیم) میں اکثر اوقات فارسیت کا غلبہ نظر آتا، حیدر قریشی نے اس کے برعکس خالص اُردو کے الفاظ پر توجہ مرکوز رکھی ہے، البتہ کہیں کہیں ہندی الفاظ فکر اور جذبہ واحساس کو متحرک کرتے نظر آتے ہیں:

(۹) ہندی روایت کا اثر

حیدر قریشی کی غزلوں میں ہندی طرزِ احساس کا اظہار ہندی الفاظ اور ہندی روایت کی مدد سے ظاہر ہوتا ہے۔ان کے ایسے تمام شعر جہاں ہندی اثرات نظر آتے ہیں ان میں ایک خاص قسم کی ترنگ اور ادا بھی محسوس ہوتی ہے۔کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

پہلے دیوی بنایا ہے تجھ کو
پھر تیری آرتی اتاری ہے (۱۳۹)

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدرؔ
ہم نے کب زندگی گزاری ہے (۱۴۰)

گیان، دھیان کے رستوں پر اب اور نہ مجھ کو رول
میرے مالک! مجھ پر میرا ساتواں در بھی کھول (۱۴۱)

محولہ بالا اشعار سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حیدر قریشی کو ہندی الفاظ سے خاص لگاؤ ہے۔درج ذیل اشعار سے ان کی ہندی روایت سے دل چسپی کا اظہار بھی ہو جاتا ہے:

حیدر ہمارے عہد میں، اکیسویں صدی میں بھی
میرا نے اپنے ہاتھ سے رادھاؔ کو شامؔ لکھ دیا (۱۴۲)

پھر وقت کے برگد کے تلے گیان کی دُھن میں
نکلا ہوا گھر سے کوئی سادھو ہے کہ تو ہے (۱۴۳)

ہندی روایت کا گہرا شعور اُس غزل میں خصوصاً بہت واضح دکھائی ہے جو انھوں نے بابا بلھے شاہ کی زمین میں کہی ہے ۔چند شعر بطور مثال درج ہیں:

رقص کناں ہے جس کے اندر ازل ابد کا مور
وہ ہے اک بے انت خلا سا جس کی اور نہ چھور
من سے لے کر بکل تک ہوں ویران و حیران
چوری کرنا چھوڑ گئے ہیں میرے سارے چور
سات سمندر سے تو اپنے پاپ نہیں دُھل پائے
تو ہی بھیج اب دل کے صحرا کوئی گھٹا گھنگور (۱۴۴)

(۱۰) انگریزی الفاظ کا استعمال

اُردو زبان وادب کے کلاسیکی عہد میں اور خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنی تخلیقات میں انگریزی الفاظ و تراکیب برتنا شروع کر دی تھیں۔اقبالؔ اور اکبرؔ الہ آبادی کے کلام میں انگریزی الفاظ طنز و مزاح کی شدت نمایاں کرنے کے لیے استعمال ہوئے جبکہ جدید عہد میں انگریزی الفاظ اکثر و بیشتر سنجیدہ مقاصد کے لیے بھی برتے جا رہے ہیں، اگر چہ مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ آج بھی خوبی سے استعمال ہو رہے ہیں۔حیدر قریشی کی غزلیات میں ماسوائے چند اشعار کے، باقی جس جگہ بھی انگریزی لفظ آیا وہ فطری معلوم ہوتا ہے۔اُنھیں خود بھی احساس ہے کہ وہ اپنی شاعری میں انگریزی کا استعمال کر جاتے ہیں، ایک جگہ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

کوشش جتنی بھی بچنے کی کر لوں پھر بھی
اُردو میں کچھ کچھ انگریزی ہو جاتی ہے (۱۴۵)

اسی غزل کا ایک اور شعر دیکھئے:

بے حد پاور جس کو بھی مل جائے، اُس کی
طرز یزیدی یا چنگیزی ہو جاتی ہے (۱۴۶)

وہ غزلوں میں کہیں کہیں انگریزی الفاظ کی مدد سے طنز و مزاح کی کیفیت اس انداز سے پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اصل مفہوم تک پہنچ کر سنجیدہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مثلاً:

رہا نہ کام علامت یا استعارے کا
یہاں تو عشق ہے جیسے بجٹ خسارے کا (۱۴۷)

کچھ مقامات پر انگریزی کا استعمال محض مزاح پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے:

؎ چھاؤں کا اک خیال سا تھا وہ بھی چھن گیا
فیشن کسی نے کر لیا زلفیں تراش کر (۱۴۸)

؎ وہ بھی تھا کچھ ہلکے ہلکے سے میک اپ میں
بال اپنے ہم نے بھی کالے کر رکھے تھے (۱۴۹)

حیدر قریشی نے انگریزی لفظ کی مدد سے تغزل کی کیفیت پیدا کرنے کا کامیاب تجربہ بھی کیا ہے:

؎ فون سے بھی اس کے ہونٹوں کا اثر آیا سدا
گھولتا ہے کان میں، لفظوں کو رس کرتے ہوئے (۱۵۰)

حیدر قریشی کا کمال ملاحظہ ہو کہ اُنھوں نے سائنس کے جدید نظریات اور قرآنی فکر میں ہم آہنگی تلاش کرنے کی خاطر بھی انگریزی الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ جو قاری کی قوتِ فکر بڑھاتا ہے۔

؎ جو پھونک دیں تو قیامت ہی ایک اُٹھائے گا
چھپا ہوا کوئی ایٹم کا صورِ خاک میں ہے (۱۵۱)

حیدر قریشی کی غزل میں انگریزی الفاظ کا استعمال متنوع پس منظر رکھتا ہے جس میں نمائندہ زاویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بخوفِ طوالت و تکرار زیادہ مثالوں سے گریز کیا گیا ہے۔

(ii) تراکیب کا استعمال

دو یا دو سے زیادہ الفاظ مل کر ترکیب بناتے ہیں۔ ہر نئی ترکیب نیا احساس متعارف کراتی ہے۔ ترکیب بنانے کے متعین اُصول و ضوابط موجود ہیں جن کی پاسداری ہر شاعر پر لازم ہے تاہم ان اُصولوں کو توڑنے کی کوشش بھی عام ہے۔ حیدر قریشی شعری روایات اور اُصول و ضوابط کا احترام کرتے ہیں البتہ بعض مقامات پر وہ اس سے انحراف بھی کر جاتے ہیں جس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ اُن کی غزلوں میں دولفظی، سہ لفظی اور چہار لفظی تراکیب کی مثالیں عام ہیں۔ دورانِ بحث صرف نمائندہ مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔

(الف) دولفظی تراکیب

دولفظی تراکیب کہیں مرکبِ عطفی کی صورت سامنے آتی ہیں اور کہیں مرکبِ اضافی کے پیرائے میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں:

؎ یہ بال و پر تو چلو آگئے نئے حیدؔر
بلا سے پہلے سے اپنے وہ خال و خد نہ رہے (۱۵۲)

؎ رہنے دو مری جان یہ توقیر و تکلف

حیدؔر ترا اب اتنا بھی ذی جاہ نہیں ہے (۱۵۳)

؎ زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم
بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر (۱۵۴)

(ب) سہ لفظی تراکیب

؎ تردیدِ شبِ ہجر میں روشن سی کوئی شب
پھیلی رہی تا حدِ سحر اور مکمل (۱۵۵)

؎ یہ گردشِ ماہ و سال کیا ہے
زمانے! تیری یہ چال کیا ہے (۱۵۶)

؎ حقیقتیں تو فریب نکلیں
جہانِ خواب و خیال کیا ہے (۱۵۷)

(ج) دولفظی اور سہ لفظی تراکیب کا اشتراک

حیدر قریشی کے ہاں ترکیب بندی کی ایک صورت یہ ملتی ہے کہ مصرع اول میں دولفظی ترکیب برتی گئی ہے جبکہ مصرع ثانی میں سہ لفظی ترکیب جمالیاتی تاثر گہرا کرتی ہے:

؎ قریش مکہ میں ہو یا مدینہ والوں میں
فقیر نسبتِ ارضِ حجاز رکھتا ہے (۱۵۸)

ایک شعر میں ان دونوں تراکیب کو مصرع اولی میں پیش کر دیا گیا ہے:

؎ ہے ماہِ شبِ ہجر بھی وہ ماہِ وصالاں
یوں جمع کبھی دونوں مہینے نہیں دیکھے (۱۵۹)

(۲) چہار لفظی تراکیب:

اس ترکیب کی دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

؎ اگرچہ اُن کا تعلق ہے عرش سے لیکن
اساسِ کعبہ و بنیادِ طور خاک میں ہے (۱۶۰)

؎ مئے رخسار و چشم و لب اتنی
چھوٹا پڑ جائے نہ ایاغ کہیں (۱۶۱)

حیدر قریشی نے اکثر و بیشتر تراکیب غزل کی مجموعی مزاج کے مطابق برتی ہیں۔ ان تراکیب میں سادگی، قدرت اور وضاحت ملتی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ تراکیب معیاری اور جمالیاتی ہیں۔

(۲۲) ماہیا نگاری

(۲۲) حیدر قریشی کی ماہیا نگاری کا فنی و فکری مطالعہ

حیدر قریشی کی ادبی شناخت کا ایک بڑا حوالہ ماہیا نگاری ہے۔اس صنف کے ساتھ ان کا تعلق تخلیقی ،تنقیدی اور تحقیقی سطح پر قائم ہے۔نوے کی دہائی میں اُنھوں نے صنف ماہیا کی تفہیم اور تحقیق وتنقید کے ضمن میں جن علمی مباحث کو اٹھایا اس نے بالآخر ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی، جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔مقالے کے زیر نظر حصے میں ماہیا نگاری کی صرف اس جہت پر بات ہوگی جس کا تعلق حیدر قریشی کے تخلیقی عمل کے ساتھ ہے۔ان کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

☆حیدر قریشی کے مطبوعہ ماہیے

حیدر قریشی کے مطبوعہ ماہیوں کی دو صورتیں ہمارے سامنے ہیں، اولاً ماہیوں کے الگ مجموعے، ثانیاً غزل اور نظم کے مجموعوں میں ماہیوں کی شمولیت،ان تمام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) محبت کے پھول(ماہیے)

نایاب پبلی کیشنز،خانپور،طبع ۱۹۹۶ء

(ب) عمرگریزاں(غزلیں،نظمیں،ماہیے)

تجدید اشاعت گھر،لاہور،طبع ۱۹۹۶ء

(ج) دردسمندر(غزلیں،نظمیں،ماہیے)

’’دردسمندر‘‘(غزلیں،نظمیں،ماہیے)الگ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا بلکہ حیدر قریشی نے اسے اپنے مجموعہء نظم ونثر بعنوان’’عمرلاحاصل کا حاصل‘‘میں شامل کیا تھا۔یہ کلیات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی نے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا تھا۔اس کلیات میں پانچ شعری اور چھے نثری مجموعے جمع کر دیے گئے ہیں۔حیدر قریشی کا تمام شعری اور نثری سرمایہ مع کلیات انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔

(د) قفس کے اندر(چھے شعری مجموعوں کا مجموعہ)

اس کلیات میں وہ تمام ماہیے بھی شامل ہیں جو پہلے دوسرے مجموعوں میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ کلیات عکاس انٹر نیشنل اسلام آباد اور نایاب پبلی کیشنز،خانپور کے باہمی اشتراک سے ۲۰۱۳ء میں منظرِ عام پر آتا تھا۔

(ر) زندگی(غزل،نظم،ماہیا)

یہ انٹرنیٹ ایڈیشن ہے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لیے www.haider-qureshi.blogspot.de پر کلک کرنا ہوگا۔ اس میں تقریباً وہی کلام طبع ہوا ہے جو پہلے مجموعوں میں موجود ہے، کچھ پرانا کلام بھی یہاں پڑھا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی کے تمام ماہیے قارئین کو بآسانی دستیاب ہیں۔

(الف) فکری محاسن

اُردو ادب میں ماہیا کی صنف اپنے اختصار اور تاثیر کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔یہ اگرچہ مختصر سہ مصرعی اظہاریہ ہے تاہم اس میں زندگی کے بے شمار فکری رویے اپنی جگہ بناتے چلے جاتے ہیں۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں فکری عناصر خاصی تعداد میں موجود ہیں لیکن یہاں ان کی نمائندہ فکر پر روشنی ڈالی جائے گی۔

(۱) حضرت محمدؐ سے عقیدت اور محبت

سرورِ کونینؐ اور فخرِ موجودات حضرت محمدؐ کے ذاتِ اقدس پر دنیا کی ہر زبان میں لکھنے کا سلسلہ تا قیامت جاری وساری رہے گا۔اُردو زبان وادب میں بھی آپؐ کی سیرت،بصیرت اور حکمت واعجاز کی مدحت سرائی کی طویل روایت موجود ہے۔حق بات تو یہ ہے کہ آپ کی توصیف کرنے والا جہاں اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے، وہاں اپنی فلاح کا متلاشی بھی ہوتا ہے۔حیدر قریشی کی شاعری میں نعتیہ ماہیوں کا اپنا ایک خاص انداز ہے جو قاری کے دل ودماغ پر گہرے اثرات ثبت کرتا ہے۔درج ذیل ماہیوں میں یہ رنگ بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔اِن ماہیوں میں شاعر کے جذبات،احساسات اور خیالات عشقِ محمدؐ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

(ا) پھیلے تھے اُجالے سے
کملیؐ والے کے
پرنور حوالے سے (۱۶۲)

(ب) سب صبحوں کا تاج ہوئی
رحمت عالمؐ کو
جس شب معراج ہوئی (۱۶۳)

(ج) نکلی ہے یہ دل سے دعا
فیضِ محمدؐ سے
رب زدنی علما (۱۶۴)

ان نعتیہ ماہیوں میں حضور اکرمؐ کی مدحت تو اپنی جگہ روشن ہے اس کے پس پردہ شاعر کی عقیدت اور خلوص بھی موجزن ہے۔

(۲) خانہ خدا میں حاضری کی کیفیت

حیدر قریشی کو ۱۹۹۶ء میں عمرے کی اور ۲۰۰۳ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ یہ دونوں سفرنامے ''سوئے حجاز'' کے نام سے سرورا کادمی، جرمنی نے ۲۰۰۴ء میں یکجا صورت میں شائع کر دیئے تھے۔ خانۂ خدا میں وہ جن روحانی کیفیات سے سرشار ہوئے اس کا ذکر ''سوئے حجاز'' کے علاوہ غزلوں اور ماہیوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

(الف) کثرت کی زبانی ہیں
کعبہ کی دیواریں
وحدت کی نشانی ہیں (۱۶۵)

(ب) کس نور کا درشن تھا
سامنا ہوتے ہی
روشن مرا تن من تھا (۱۶۶)

(ج) پوچھو نہ مزہ ہم سے
پیاس بجھائی تھی
جب بئر زم زم سے (۱۶۷)

تیسرے ماہیے کے آخری مصرعے میں بئر کا لفظ آیا ہے، حیدر قریشی نے کلیات میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''عربی میں کنویں کو بئر کہتے ہیں۔ یعنی زم زم کا کنواں'' (کلیات: ص ۱۵۷) یہ ماہیے دین اسلام کی مرکزیت اور فرد کی روحانی کیفیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

(۳) حضرت علیؓ کے فرمودات سے اکتساب

حیدر قریشی ایک وسیع المطالعہ ادیب ہیں اُن کی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں میں علمی نکات کسی نہ کسی حوالے سے اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ درج ذیل ماہیوں میں اُنھوں نے حضرت علیؓ کے اقوال سے استفادہ کرتے ہوئے فکر و نظر کی تطہیر کا فریضہ انجام دیا ہے:

الف) اللہ کو جان لیا
جس نے بھی اپنے
من کو پہچان لیا (۱۶۸)

(ب) اب سمجھ میں آیا ہے
علم کے نقطے کو
جہلا نے بڑھایا ہے (۱۶۹)

حیدر قریشی نے اس حوالے سے اور بھی ماہیے لکھے ہیں لیکن بخوف طوالت انھی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۴) صوفیائے کرام سے نیازمندی:

حیدر قریشی کو صوفیائے کرام سے خاص لگاؤ ہے اس کا اظہار ان کے افسانوں، شاعری اور نجی خط و کتابت سے بھی ہوتا ہے اس حوالے سے صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(الف) گو خاک پہ رہتے ہیں
لیکن دیکھو تو
افلاک پہ رہتے ہیں (۱۷۰)

(ب) اُلجھے جو فقیروں سے
یوں سمجھو اُلجھے
اپنی تقدیروں سے (۱۷۱)

شگفتہ الطاف نے حیدر قریشی کے ماہیوں میں موجود موضوعات پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' حیدر قریشی کے ماہیوں میں کائنات کی خوبصورتی کھلی کتاب کی طرح موجود ہے اور ہر نظر اس میں سے اپنی پسند کے منظر نامے کو ڈھونڈ سکتی ہے۔ اُن کی نگاہ کے مختلف زاویے اس کے ماہیوں میں موجود ہیں، کہیں وہ کائنات میں موجود حسن کا مطالعہ کرتا ہے اور کہیں اپنے فن میں بسے حسن و محبت کو الفاظ کی جامہ گیری میں ملفوف کیے ہوتے دکھائی دیتا ہے۔'' (۱۷۲)

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری واردات قلبی اور تاریخی صداقتوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔

(۵) بچپن اور اہل خانہ کا ذکر

حیدر قریشی نے زندگی کے لمحات کو امر کرنے کی خاطر اپنے بچپن اور اہل خانہ کو یادنگاری کے ذریعے محفوظ کر دیا ہے۔ ان کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' اپنی موضوعات کو تفصیلاً بیان کرتی ہے۔ شاعری میں غزل میں کہیں کہیں ایسے حوالے نظر آ جاتے ہیں لیکن ماہیے میں یادوں کا یہ سمندر رواں دواں بہتا چلا جاتا ہے۔

(الف) بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اسی ایک زمانے میں (۱۷۳)

(ب) دن تو وہی اچھے تھے
جب اسکول کے ہم
چھوٹے سے بچے تھے (۱۷۴)

اپنے بیٹوں پر حیدر قریشی کا ماہیا ملاحظہ ہو:

(ج) دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گزری جوانی ہے (۱۷۵)

زوجہ کے حوالے سے:

(د) اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے (۱۷۶)

اہل خانہ کے حوالے سے ان کے ماہیے خاندان کے تقریباً تمام اہم افراد پر مشتمل ہیں حتیٰ کہ نواسے اور نواسیوں کا ذکر بھی شامل ہے۔ان ماہیوں میں خلوص، محبت اور قربت کی فراوانی نظر آتی ہے۔

(۶) مظاہر فطرت سے دل چسپی

حیدر قریشی کے ماہیوں میں مظاہر فطرت کے حوالے سے خاص دل چسپی نظر آتی ہے۔اُن کی آنکھ جہاں کوئی اچھا منظر دیکھتی ہے، اُسے بعد ازاں احتیاط سے صفحۂ قرطاس پر منتقل بھی کر دیتی ہے۔چند مثالیں قابل توجہ ہیں:

(الف) کھیتوں کے کنارے ہیں
دور تلک پھیلے
فصلوں کے نظارے ہیں (۱۷۷)

(ب) پودے جو کپاس کے ہیں
منظر پھولوں کے
خوشیوں کی آس کے ہیں (۱۷۸)

(ج) شیشم کی قطاریں ہیں
لو کے تھپیڑوں میں
راحت کی بہاریں ہیں (۱۷۹)

فطرت پسندی کے عناصر ان کے ماہیوں میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ہر صفحے پر ایک دو مثالیں بآسانی مل جاتی ہیں۔

(۷) سماجی روایات کا شعور

حیدر قریشی نے اپنے ماہیوں میں سماجیات کے جیتے جاگتے تجربات اور مشاہدات کو نہایت سلیقے سے پیش کر کے کہ اس صنف کے موضوعاتی امکانات کو وسعت دی ہے۔رخصتی کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

(الف) یہی رسم زمانہ ہے
بابل کے گھر کو
اب چھوڑ کے جانا ہے (۱۸۰)

(ب) بارات کا منظر ہے
خوشیوں کا موسم
برسات کا منظر ہے (۱۸۱)

روایتی کھیلوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے:

(ج) کچھ یادیں اُترتی ہیں
بکھری ٹھیکریاں
''پٹھو'' کی سنورتی ہیں (۱۸۲)

(د) جب کھیلنے ''کھو'' بیٹھے
دیکھ کے اک ساتھی
ہم اس کے ہو بیٹھے (۱۸۳)

(ر) چاہت کی گواہی کا
کھیل لڑکپن کا
تھا ''چور سپاہی'' کا (کلیات:ص۱۵۳)

ماہیا اصلاً ثقافتی اقدار کی بنیادوں پر اُستوار ہوتا ہے۔حیدر قریشی نے اس صنف کے اصل تشخص کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے تجربات ماہیے میں پیش کیے ہیں۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

''حیدر قریشی ماہیے کی نغمانی ہیئت کو واضح اور اس کے ثقافتی رنگ کو نمایاں کر کے محبت کے پھول پر دل میں مہکنے کی دعا کرتے ہیں۔(۱۸۴)

خصوصاً پنجاب کی ثقافت کا عکس اُن کے ہاں زیادہ نمایاں ہے۔حیدر قریشی نے پنجابی ثقافت کو اُردو زبان کے توسط سے دیکھنے اور دکھانے کی جو سعی کی اس کی وجہ سے صنف ماہیا کا موضوعاتی کینوس وسعت پذیری کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔

۳(۸) لوک داستانوں کا ذکر:

علاقائی ثقافت کا ایک نمایاں حوالہ لوک داستانیں ہیں، حیدر قریشی نے اس ثقافتی مظہر پر خصوصی توجہ صرف کرتے

ہوئے اہم داستانوں کو ماہیوں میں محفوظ کر دیا ہے:

الف) اک دیو کا ہے پالا
ایک خزانے پر
اک سانپ ہے رکھوالا (۱۸۵)

(ب) گھبرا کے یا پھر ڈر کے
مڑ کے اگر دیکھا
ہو جاؤ گے پتھر کے (۱۸۶)

(ج) یُوں تھا کہ بادل تھا
آنکھ میں سسّی کی
صحرا کوئی جل تھل تھا (۱۸۷)

(د) اک بنسی نشانی تھی
کرشن کنہیا اور
رادھا کی کہانی تھی (۱۸۸)

(ر) ان ہونے کام ہوئے
سیتا کے ہاتھوں
پتھر بھی رام ہوئے (۱۸۹)

اس نوع کے ماہیے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ حیدر قریشی اس صنف پر مجتہدانہ دسترس رکھتے ہیں۔ اُن کا طرزِ فکر ماہیے میں چھپے امکانات ڈھونڈ نکالتا ہے۔

(۹) عمر گریزاں کا احساس

وقت اور عمر کے مسائل پر حیدر قریشی کا غور و فکر اُن کی تخلیقات میں کسی نہ کسی طور پر موجود رہتا ہے۔ ماہیے میں یہ دونوں مسائل قدرے نئے زاویوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

صرف ایک نمائندہ مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

☆ دو پہر جوانی تھی
پل میں بیت گئی
پھر شام سہانی تھی (۱۹۰)

حیدر قریشی کے ہاں فکری موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے اور اُن کا کلی احاطہ کرنے کے لیے کئی دفتر درکار ہوں گے

تاہم نمائندہ مثالوں پر بات کر دی گئی ہے، اب ان کے فنی محاسن پر توجہ کی جاتی ہے۔

(ب) اُسلوبیاتی اور فنی محاسن

حیدر قریشی کے ماہیے جہاں فکری محاسن سے مزین ہیں وہاں فنی اوصاف کے باعث جذبہ اور تصور کی تجسیم بھی کر رہے ہیں۔ فکر و فن کا یہ امتزاجی عمل خیال کی شیرازہ بندی میں حسن و جمال کے رنگ پیدا کرتا ہے۔ ان فنی محاسن کا مطالعہ اصل میں شاعر کے ذہنی اُفق اور جودتِ طبع کا مطالعہ بھی ہے۔ ذیل میں نمائندہ فنی اوصاف پر بات کی جائے گی۔

(الف) محاکات نگاری

محاکات سے مراد لفظی تصویر کشی ہے۔ یہ وصف نظم و نثر میں مشترک ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے ماہیوں میں محاکات نگاری کے ایسے عمدہ نمونے مہیا کیے ہیں جو پڑھنے والوں کی نگاہ میں متحرک ہو جاتے ہیں، سوہنی دھرتی یا وطن کے حوالے سے دو ماہیے لائق توجہ ہیں:

(الف) خوشبو احساس اس کا
رنگت سرخ، سفید
اور سبز لباس اس کا (۱۹۱)

(ب) مکھ دھرتی کا نورانی
جھومر پیڑ اس کے
کھیت اس کی ہیں پیشانی (۱۹۲)

یہ ماہیا ملاحظہ ہو جس میں صوتی اثرات بھی شامل ہیں:

(ج) پھر رقص میں بادل ہے
چھم چھم بجنے لگی
پھر بوندوں کی پائل ہے (۱۹۳)

محاکات کی دیگر مثالوں میں حیدر قریشی نے اردگرد کے ماحول اور خصوصاً فطری مناظر کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(۲) ماہیے کے اوزان

ماہیا اصل میں پنجابی سے اُردو میں آیا ہے اور اسے سہ مصرعی ترتیب یا ہیئت میں لکھا جاتا ہے۔ ماضی میں شعرائے کرام نے ثلاثی اور ہائیکو کے اوزان میں ماہیے لکھے جس کی وجہ سے ماہیے کی اپنی شناخت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ حیدر قریشی نے اس صنف کے اوزان اور مزاج کی وضاحت کے لیے جو تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے تھے، وہ بالآخر ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اُردو ادب میں ماہیے کو دوسری تمام اصناف سے الگ سمجھا

جاتا ہے اور اسے مخصوص اوزان کی مدد سے لکھا جا رہا ہے۔حیدر قریشی نے ماہیے کو اپنا اصل مقام دلانے میں کلیدی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔

حیدر قریشی نے اُردو ماہیوں میں پنجابی اوزان کی پابندی کرنے پر زور دیا ہے ماضی میں ساحر لدھیانوی اور قمر جلال آبادی نے بھی اسی روایت کی پیروی کی ہے۔حیدر قریشی نے اپنی ماہیوں میں جن اوزان کو برتا ہے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(الف) مولا کی عنایت تھی
اپنے مقدر میں
جرمن کی ولایت تھی (۱۹۴)

ارکان:

مفعول مفاعیلن
فاع مفاعیلن
مفعول مفاعیلن

(ب) کیا لطف رہائی کا
دل جب سہ نہ سکے
دکھ تیری جدائی کا (۱۹۵)

ارکان:

مفعول مفاعیلن
فعلن فاع فعل
مفعول مفاعیلن

محولہ بالا اوزان کا تنوع پنجابی ماہیے کے مطابق ہے۔حیدر قریشی نے شاعری کے متنوع اوزان استعمال کر کے ثابت کیا ہے کہ پنجابی ماہیے کی ہر صورت میں قائم رکھی جا سکتی ہے۔

(۳) لسانی شعور

صنف ماہیا کا ثقافتی پس منظر یہ واضح کرتا ہے کہ اس صنف نے فطری ماحول میں پرورش پائی ہے روزمرہ بولی جانے والی زبان کی سادگی ماہیے میں اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔حیدر قریشی نے اپنے اُردو ماہیوں میں کئی ایسے الفاظ نہایت سہولت کے ساتھ استعمال کیے جو عوامی محل استعمال تو رکھتے ہیں لیکن ادبی زمرے میں نہیں آتے تھے۔یہ

ان کا لسانی شعور ہے کہ اصل زبان کی چاشنی اور سادگی کو قائم رکھا ہے۔یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) تقدیر ہی پھوٹ گئی
''پینگ'' چڑھالی جب
تو رسی ٹوٹ گئی(۱۹۶)

''پینگ'' کا لفظ گاؤں میں عام استعمال ہوتا ہے، ماہیے میں اس کا استعمال خوب صورتی پیدا کر رہا ہے۔

(ب) دکھ درد سے ہاروں کے
دیکھتے آ کے کبھی
حال اپنے ''بماروں'' (۱۹۷)

''بیماروں'' کی جگہ خالص پنجابی تلفظ ''بماروں'' کو ترجیح دی گئی ہے جو ایک خاص ثقافتی پس منظر رکھتا ہے اور ماہیے کی اصل فضا کا لطف بڑھاتا ہے۔ان کے دیگر ماہیوں میں ''چن ماہی''، ''یادوں کے ہنیرے''، ''جانگلی''، ''اشٹاپو'' اور ''کوکلا'' جیسے خوبصورت پنجابی الفاظ اپنی پوری معنویت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

(۴) سراپا نگاری

حیدر قریشی کے ماہیوں میں سراپا نگاری کے عناصر عمدہ تشبیہات کی مدد سے جاذبِ توجہ ہیں۔اُنھوں نے تشبیہ کے استعمال میں بھی عوامی بولی اور گاؤں کی سادگی کو برقرار رکھا ہے:

(الف) ہونٹ اس کے اناری ہیں
گال ہیں اس کے یا
دو سیب قندھاری ہیں (۱۹۸)

(ب) اُن آنکھوں کی مغروری
ہوش اُڑا ڈالے
وہ شربتِ انگوری (۱۹۹)

اس موضوع کی کئی مثالیں موجود ہیں، بخوفِ طوالت انھی پر اکتفا جاتا ہے۔

(۵) جدتِ ادا

جدت ادا سے مراد یہ ہے کہ فرسودہ اور پامال مضامین کو نئے انداز سے بیان کرنا یا نئے نئے مضامین تلاشنا۔حیدر قریشی کے ہاں جدتِ ادا کی دوسری صورت عام ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہو:

(الف) سب ہی مجھے پیارے ہیں
پوتے، نواسے سب

دل کے سی پارے ہیں (۲۰۰)

(ب) جب پوتی ہوئی ماہم
باہم رشتے بھی
کچھ اور ہوئے باہم (۲۰۱)

حیدر قریشی نے جدتِ ادا کے عمومی اُصولوں کی پاسداری کی ہے اور معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ سادگی کو بھی برقرار رکھا ہے۔

(۶) مجاز کی صورتیں

شاعری میں معنی اور احساس کی ترسیل و تفہیم کی خاطر مجاز کے علاقے استعمال ہوتے ہیں۔ایک اچھا شاعر مجاز کی مدد سے ابلاغ و اظہار میں حائل رکاوٹیں دور کرتا چلا جاتا ہے۔مجاز کا ہر علاقہ کسی نہ کسی حوالے سے استعارے کے ساتھ بھی جڑا ہوتا ہے۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں مجاز کی حسبِ ذیل صورتیں توجہ طلب ہیں:

(الف) یورپ کا نگینہ ہے
اُبھرا ہوا دیکھو
اس دھرتی کا سینہ ہے (۲۰۲)

حیدر قریشی نے یہ ماہیا جرمنی کے حوالے سے کہا ہے۔اور مصرع اولیٰ میں ''نگینہ'' کا لفظ بطور مجاز ''جرمنی'' کے لیے استعمال ہوا ہے، یہ مثال ملاحظہ ہو:

(ب) سرسبز سماں ہوگا
جل گئے خواب اگر
آنکھوں میں دھواں ہوگا (۲۰۳)

آخری مصرعے میں لفظ ''دھواں'' مجاز کی صورت اپنے معنی ادا کر رہا ہے۔اس طرح کی مثالیں مزید بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

(۷) خیال بندی

شاعری کی نوعیت علمیاتی اور وجودیاتی ہوتی ہیں اس میں خیال بندی کا رشتہ علمیاتی سطحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔خیال بندی میں شعری مضامین اور مضمون آفرینی کے تمام مظاہر شامل ہیں۔کسی خاص تصور کو شعریت کے دائروں میں بند کرنا ہی شاعر کا اصل کمال ہے۔حیدر قریشی کے ہاں خیال بندی کی درج ذیل صورتیں نظر آتی ہیں:

(الف) قصوں کا بہانہ تھا
دو جے حوالوں سے

دکھ اپنا سنانا تھا (۲۰۴)

(ب) جب خامشی بولتی ہے
گرہیں محبت کی
آنکھوں سے کھولتی ہے (۲۰۵)

(ج) دُھن کتنی ہی پکی ہو
پیار نہیں چلتا
جب یار ہی شکی ہو (۲۰۶)

ان ماہیوں میں خیال بندی کا اہتمام بہت واضح اور متاثر کن ہے۔

(۸) تخیل

سید عابد علی عابد کا کہنا ہے:

''تخیل شعور کی معراجی صورت ہے اور شاعرانہی معنوں میں صاحبِ شعور ہوتا ہے۔''(۲۰۷)

شاعری میں فکر و نظر کے تقریباً تمام تشکیلی عناصر تخیل کی مدد سے اپنا جادو جگاتے ہیں،تخیل کی وجہ سے شاعر اور نثر نگاروں کو اَن دیکھی دنیاؤں کی سیر کا موقع ملتا ہے۔حیدر قریشی کی غزل،نظم اور ماہیا میں تخیل کی اُڑان دیدنی ہے۔
یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) اَن دیکھے جہانوں تک
دل نے پہنچنا ہے
چاہت کے خزانوں تک(۲۰۸)

(ب) کوئی وہم یا جادو تھا
رنگ ہَوا،اُس کا
جسم اُس کا خوشبو تھا (۲۰۹)

حیدر قریشی کے تخیل میں اَن دیکھے جہانوں کا مکالمہ بھی ہے اور محبوب کی پیکر تراشی اور زاویے بھی۔ان کا حرکی تخیل تمثال ہائے خیال پیدا کرتا ہے اور مجازی معنوں میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے۔مجاز کے نئے رنگ تخیل سے جلا پاتے ہیں۔ حیدر قریشی کے ماہیوں میں تخیل کے رنگ نکتہ آفرینی کا نیا جہان پیدا کرتے ہیں۔

(۹) مکالماتی انداز

حیدر قریشی نے اپنے ماہیوں میں جہاں اور نئے تجربات کیے وہاں اس صنف میں مکالماتی رنگ دکھانے کا کامیاب تجربہ بھی کیا ہے۔مثالیں دیکھئے:

مرد: کتنے بدنام ہوئے
پیار میں تیرے،ہم
پھر بھی ناکام ہوئے

عورت: ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

مرد: اس حالِ فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

عورت: زلفوں سے رہا ہو جا
رب تیری خیر کرے
جا ہم سے جدا ہو جا (۲۱۰)

حیدر قریشی کے تمام ماہیوں کا ایک اپنا خاص سیاق و سباق ہے اور علامت کے تلازمات اتنے گہرے، متنوع اور واضح مفاہیم کے حامل ہیں کہ قاری کو دورانِ مطالعہ بار بار خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ جدید ماہیے فنی، فکری اور اُسلوبیاتی حوالے سے لائق تحسین ہیں۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

(۲.۳) آزاد نظمیں

(۲.۳) حیدر قریشی کی آزاد نظموں کا فنی و فکری مطالعہ

حیدر قریشی کی فکر اور توانائی کا جو معیار اُن کی غزلوں اور ماہیوں میں نظر آتا ہے وہ آزاد نظم میں بھی اپنی پوری رعنائی اور توانائی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلیات ''عمر لا حاصل کا حاصل'' میں تیس (۳۰) نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں اُن کے شعری مجموعوں ''دعائے دل'' اور ''دردسمندر'' میں بھی شامل ہیں۔ اس دوران کوئی نیا اضافہ نہیں ہوا، اگر دیانت داری سے دیکھا جائے تو حیدر قریشی کے شعری سفر میں اِن نظموں کی تخلیقی حیثیت بااندازِ دگر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ اِن نظموں کا موضوعاتی کینوس خاصا وسیع ہے۔ یہ نظمیں شاعر نے محض ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں لکھیں بلکہ کئی ایسے موضوعات جو غزل یا ماہیے میں بیان نہیں ہو سکتے تھے اُن کی تفہیم، تعبیر اور ترسیل آزاد نظم کی صورت ممکن ہوئی ہے۔ اُن کی نظم نگاری کے نمائندہ پہلوؤں پر اجمالاً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(الف) آزاد نظموں کے فکری محاسن

(ا) فطرت پسندی

حیدر قریشی کی آزاد نظموں میں فطرت پسندی کے نقوش قدرے گہرے ہیں۔ کلیات میں شامل پہلی نظم ''خلا'' کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فطرت کے سب سے بڑے واقعے بگ بینگ (Big Bang) کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ اگرچہ ایک سائنسی تصور ہے لیکن حیدر قریشی کی فکر میں اسے قبولیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نظم شاعر کے ذاتی کرب کی عکاس ہے۔ اس نظم میں بظاہر قاری کو کائنات کے مظاہر میں گم کرنے کی کوشش ملتی ہے لیکن پھر یہ نظم گریز کرتے ہوئے بالآخر انسان کی تنہائی پر منتج ہو جاتی ہے۔ نظم کا آخری حصہ دعوت فکر دیتا ہے:

اور اب یہ عالم ہے
بہاریں کھو چکی ہیں
کہکشائیں بجھ گئی ہیں
اور مری آنکھوں میں
اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا جس میں۔۔۔

اک سفاک سناٹا
مسلسل رقص کرتا ہے (۲۱۱)

فطرت پسندی کے یہی عناصر ان کی دیگر نظموں مثلاً ایک ''اُداس کہانی''، ''صدا کا سمندر''، ''حاصلِ زندگی'' اور'' بہار کے پہلے دن'' میں بھی مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔

(۲) ثقافتی تصورات

حیدر قریشی کی نظموں میں ثقافتی مظاہر کا خاص مقام ہے۔ وہ اپنے آس پاس موجود سماجیاتی منظر نامے پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ معمولی مشاہدات کو بھی شعری تجربات کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اُن کی نظم ''منی پلانٹ'' میں وہ اُس پودے سے جڑے تمام اہم تصورات کا احاطہ کرتے ہیں جو نسل در نسل چلتے عام ہو چکے ہیں اور یوں ایک عام سا موضوع ثقافتی فکر کا اشاریہ بن جاتا ہے۔
نظم ''محبت کا خدا'' اسی نوعیت کے تصورات کے ترجمانی کرتی ہے۔ ایک اور نظم ''نئی شالاط'' میں کئی ثقافتی حوالوں کو مربوط کر دیا گیا ہے:

'' نہ اب وہ آریاؤں کے ہلاکت خیز حملے ہیں
نہ دشتِ قیس ہے، نہ خسرو پرویز کے حیلے
نہ اب تھل کا سفر درپیش، نہ تختِ ہزارہ ہے
نہ اب گجرات کی جانب رواں جانِ بخارا ہے
فقط میں ہوں!
فقط میں ہوں اکیلا، تنہا اپنے آپ سے بچھڑا ہوا''
(نئی شالاط، کلیات: ص۱۳۳)

(۳) فلسفیانہ تناظر

حیدر قریشی کی شعری جمالیات میں ایک بڑا حصہ فلسفیانہ پہلوداری کا بنتا ہے۔ اُن کی نظم ''تخلیق در تخلیق'' کائناتی سچائیوں کو کلیت کے دائرۂ میں رکھ کر سمجھا جا رہا ہے۔ اس فکری نظم میں کائنات کی قوتِ تخلیق کو انسان کی جمالیات، اخلاقیات اور تہذیبی و ثقافتی حوالوں کی مدد سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ حیدر قریشی خود بھی حسنِ ازل اور کائنات میں اُبھرنے والی صورتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور قاری کو اپنے ساتھ اس فلسفیانہ گہرائی میں اترنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ کائنات کے عملِ تخلیق میں چھپا ارتقا کا راز حیدر قریشی کے لیے باعث کشش ہے۔ وہ کُل کی معنویت کو ارتقا سے جوڑ کر فکری جمالیات کا تاثر گہرا دیتے ہیں:

''تخلیق در تخلیق کا کوئی انوکھا سلسلہ سا ہے

اسی تخلیق در تخلیق ہی میں ارتقا کی داستاں
جادو جگاتی ہے
کہانی ارتقا کی کیا فقط آگے کو ہی بڑھتی چلی جاتی ہے یا بس
اک دائرے میں گھومنا اس کا مقدر ہے؟ '' (۲۱۲)

فلسفیانہ اُسلوب اور برتاؤ کی مثالیں دوسری نظموں مثلاً ''ایک خواہش کی موت''، ''دعا گزیدہ'' اور ''حاصلِ زندگی'' میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۴) دینِ اسلام سے محبت

حیدر قریشی کا سفرنامہ ''سوئے حجاز'' (عمرہ اور حج کا سفر) جہاں ان کی انشا پردازی کا منہ بولتا ثبوت ہے وہاں دین اسلام سے لگاؤ بھی اس سفرنامے کا اہم حصہ ہے۔ یہی جذبۂ عشق ماہیوں میں نمایاں ہے اور آزاد نظموں میں اس جذبے کی شدت ایک بار پھر قاری کے فکر و نظر کو متحرک کرتی ہے۔
اُن کی نظم ''دعا'' کا پورا منظر نامہ دین اسلام کی انفرادیت اور قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نظم میں ''سورہ الفیل'' کی تلمیحات بھی اپنا جادو جگاتی ہیں چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

''الٰہی!
کعبۂ دل کی طرف نظرِ کرم فرما
کہ اس پر ابرہہ
اک لشکرِ جرار لے کر چڑھتا آتا ہے۔'' (۲۱۳)

نظم کا آخری حصہ دعائیہ ہے، جس میں شاعر نہایت دکھ کی حالت میں خدا سے مخاطب ہے:

''مرے مولا!
تجھے معلوم ہے یہ کعبۂ دل تو ترا گھر ہے
سواپنے گھر کے مالک اپنے گھر کی خود حفاظت کر
اس اندھے ظلم کے عفریت کو
اور جبر کی اس ریت کو پامال کرا یسے
کہ دنیا پھر ابابیلوں کے ہاتھوں
ہاتھی والوں کی ہلاکت کا نظارہ دیکھ لے مالک!'' (۲۱۴)

اُن کی ایک اور نظم ''دعا گزیدہ'' میں خدا سے شکوے کا عنصر نمایاں ہے لیکن در پردہ عشقِ خداوندی کا اعتراف ہے۔

(۵) رومانوی عناصر

حیدرقریشی کی کچھ نظموں کا رنگ خالصتاً رومانوی ہے اور اس میں نشاطیہ،طربیہ اور المیہ رویوں کا اظہار ملتا ہے۔مثلاً ''تمہارے لیے ایک نظم'' خالصتاً نشاطیہ اور طربیہ آہنگ کی مظہر ہے۔ایک اور رومانوی نظم ''فاصلوں میں ملاپ'' ذاتی کرب کی عکاسی کرتی ہے۔جبکہ نظم ''عجیب دشمن'' رومانوی کشمکش کی داستان ہے اور ''یہ دل'' کا منظر نامہ بھی ذاتی کرب کی آئینہ داری کرتا ہے:

'' میں ہنسنے اور رونے کا سبب
کیا جان پاؤں گا
تمہارے ہجر کی ساعت ہو چاہے وصل کا لمحہ
مگر یہ دل
یہ پاگل دل، سمجھ میں ہی نہیں آئے
یہ دل ہے یا کوئی کردار اگلی داستانوں کا!'' (یہ دل، کلیات: ص۱۲۳)

ان نظموں کی معنیاتی سطح تہہ دار ہے اور قاری ہر نئی قرأت میں ایک نئی کیفیت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

(ب) فنی اور اُسلوبیاتی محاسن

(۱) خودکلامی

حیدرقریشی کی نظموں میں خودکلامی کے عناصر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں ''تمھارے لیے ایک نظم'' کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

'' چلو آؤ۔۔۔مری آنکھوں میں تھوڑا جھانک کر دیکھو
کہ آنکھیں سچ ہی کہتی ہیں
تمہیں یہ خود بتائیں گی کہ میں نے تم کو پانے کی
دعائیں مانگنے کے جتنے اندھے کرب جھیلے ہیں
تمہاری ہی عطائیں ہیں
اور اُن کی آنے والی روشنی بھی تو
تمہیں پانے کی حیرت زا بشارت سے عبارت ہے'' (۲۱۵)

خودکلامی کی جھلکیاں ان کی دیگر نظموں خصوصاً ''ایک خواہش کی موت''، ''نئی شالاط''، ''چلو اک نظم لکھتے ہیں'' اور ''دعا'' میں بہت نمایاں ہیں۔

(۲) تجرید و تجسیم

حیدرقریشی کی نظموں میں تجرید و تجسیم کے بہترین حوالے موجود ہیں، اُنھوں فنی اور تکنیکی دونوں سطحوں پر کام لیا ہے۔کہیں تجریدی حوالے لفظ میں ظاہر ہوتے ہیں اور کہیں تجرید و تجسیم کا عمل خیال اور موضوع کی صورت نمو پذیر ہوتا ہے۔یہ اوصاف اُن کی نظموں کو اضافی خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔نظم ''تخلیق در تخلیق'' کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

'' یہ کہہ کر نظم نے اُس دائرے کو
ڈرائنگ کر کے ہی دکھایا تھا کہ اُس میں سے
کوئی الہامی نغمہ سا اُبھر آیا!'' (۲۱۶)

''ایک اداس کہانی'' کے یہ مصرعے اِنھی اوصاف کو مزید وضاحت سے سامنے لاتے ہیں:

''عجب سی دھند پھیلی ہے
سبھی منظر صدا کے روپ میں ہی مجھ سے ملتے ہیں
یہ دلکش دُھند
دو قطروں کی صورت
جب سے ان پلکوں پہ ٹھہری ہے!''(۲۱۷)

حیدرقریشی نے اپنے موضوع اور اُسلوب کو علامتی و تجریدی انداز سے برت کر اظہاریت کے نئے قرینوں کو فروغ دیا ہے۔

(۳) تلمیحات

حیدرقریشی کو تلمیحات سے جو لگاؤ ہے اس کی وجہ سے ان کی غزلیں اور ماہیے فکر و نظر کے نئے نئے رنگ متعارف کراتے ہیں اُن کی نظم ''نئی شالاط'' میں تلمیحات کے شوخ رنگ بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں:

''نہ دشتِ قیس ہے، نے خسرو پرویز کے حیلے
نہ اب تھل کا سفر در پیش، نے تختِ ہزارہ ہے
۔۔۔لیلیٰ، شیریں، سسی، ہیر اور سوہنی کے سب جلوے
۔۔۔مسیحائی کی بھی تاثیر رکھتے ہیں'' (۲۱۸)

نظم ''دعا'' کے آخری مصرعوں میں تلمیحی رنگ غالب ہے:

''کہ دُنیا پھر اَبابیلوں کے ہاتھوں
ہاتھی والوں کی ہلاکت کا نظارہ دیکھ لے مالک!'' (۲۱۹)

حیدرقریشی کی نظموں میں موضوع و مواد، فکر و احساس اور اُسلوب و اظہار کی متنوع جہتیں اِنھی تلمیحات سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) گداز کی کیفیت

انگریزی ادبیات میں ایک شعری اصطلاح ''Pathos'' عام مستعمل ہے اسی کا اُردو ترجمہ ''گداز'' کیا جاتا ہے۔ سید عابد علی عابد نے وایلڈ کے حوالے سے ''گداز'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''انسانی زندگی یا تجربات کی وہ صفت جو رحم اور ہمدردی کے جذبات
پیدا کرے یا خارجی حالات میں کوئی ایسا تغیر جس سے یہی ذہنی کیفیت
پیدا ہو۔''(۲۲۰)

گداز اصل میں جذباتی صفات کا زائیدہ ہے حیدر قریشی کے ہاں اس کی مثالیں عام ہیں۔ اُن کی نظم ''میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا'' جو اُنھوں نے اپنی بہن (زبیدہ) کی رُخصتی کے موقع پر لکھی ہے۔ اس میں گداز کی کیفیت دو چند ہے، ''ایک اور اُداس کہانی'' میں ''گداز'' کا رنگ گہرا ہے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

''یہ کیسی دھند ہے جس نے مجھے تقسیم کر کے رکھ دیا ہے
مرا دل میری جاں کی
اور مری جاں، میرے دل کی جستجو میں ہے
مگر دونوں میں کوئی ربطہ ہو پایا نہیں جیسے۔'' (۲۲۱)

(۵) امیجری

شاعری میں امیجری کا استعمال خاصا وسیع اور عمیق معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ انگریزی لفظ امیجری ہمارے ہاں اُردو اصطلاح کے مطابق ''محاکات'' سے قدرے وسیع ہے اور اس میں لفظی پیکر یا محاکات کے تمام تلازمات از خود شامل ہو جاتے ہیں، بلکہ تمثال کے تمام رنگ بھی اسی کی ذیل میں آتے ہیں۔ حیدر قریشی کے ہاں امیجری کا استعمال کئی نظموں میں ملتا ہے۔ نظم ''خلا'' کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

'' اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا جس میں
لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کو سجائے
چپ کھڑی ہے میری تنہائی
اور اس کے گرد
اک سفاک سناٹا
مسلسل رقص کرتا ہے۔'' (۲۲۲)

حیدر قریشی نے نظموں میں اُسلوبیاتی تنوع کی وہ روانی اور جوانی برقرار رکھی ہے جو غزل اور ماہیے میں نظر آتی ہے، البتہ چند نظموں کا کینوس قدرے وسیع ہے اور وہاں ان کی فکری اور فنی جمالیات تخلیقی ہیئت میں شدت پیدا کرتی ہیں۔ حیدر قریشی نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ شاعرانہ خیال کی ترتیب میں جذبہ اور متخیلہ برابر کے شریک ہوتے ہیں، ان کی شاعری میں جدت اور تازگی حقائق و تجربات کو ایک وحدت میں پروتی ہے۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر انور سدید، حیدر قریشی پس غزل (مضمون) مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات، مرتبہ پروفیسر نذر خلیق، میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور ۲۰۰۳ء، ص ۹۹
۲۔ حیدر قریشی، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷
۳۔ حیدر قریشی، عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۳۸
۴۔ عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۹۷
۵۔ عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۹۱
۶۔ ہر دیے بھانو پرتاپ (مرتب) حیدر قریشی بنام اُردو شاعری (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی کی شاعری، ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۵
۷۔ حیدر قریشی قفس کے اندر (شعری کلیات)، عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۸۱
۸۔ حیدر قریشی قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۷۷
۹۔ قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۵۵
۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا، حیدر قریشی کی غزلیں (مضمون) مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات، ص ۸۷
۱۱۔ قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۲۳
۱۲۔ عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۹۵
۱۳۔ عمر لا حاصل کا حاصل (کلیات) ص ۹۰
۱۴۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات ص ۸۷
۱۵۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات ص ۸۶
۱۶۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات، ص ۸۱
۱۷۔ عمر گریزاں (مجموعہ) مشمولہ کلیات، ص ۶۷
۱۸۔ منزہ یاسمین، حیدر قریشی شخصیت اور فن میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳ء، ص ۶۵

۱۹۔ قفس کے اندر،ص۲۲

۲۰۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۵۲

۲۱۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۳۴

۲۲۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۳۵

۲۳۔ قفس کے اندر،ص۸۲

۲۴۔ دعائے دل،مشمولہ قفس کے اندر ۷۶

۲۵۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات ،ص۵۳

۲۶۔ ڈاکٹر محمد عقیل،غزل کے نئے جہات،مکتبہ جدید،دہلی ۱۹۷۹ء،ص۱۴

۲۷۔ عمرلاحاصل کا حاصل،ص۶۱

۲۸۔ عمرلاحاصل کا حاصل،ص۶۹

۲۹۔ عمرلاحاصل کا حاصل،ص۶۸

۳۰۔ ڈاکٹر محبوب راہی،حیدر قریشی کی غزل بھیڑ سے الگ مشمولہ حیدر قریشی فن اور شخصیت،
مرتب نذیر،فتح پوری سنجے گوڑ بولے،اسباق پبلی کیشنز،پونہ ۲۰۰۲ئے (اپریل) ص۵۹

۳۱۔ حیدر قریشی،سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۵۵

۳۲۔ افتخار امام صدیقی،حیدر قریشی سے مکالمہ مشمولہ،حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز،مرتب سعید شباب
نظامیہ آرٹ اکیڈمی،ہالینڈ،۲۰۰۴ء ص۹۹

۳۳۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۹۷

۳۴۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۹۶

۳۵۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۹۶

۳۶۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۱۰۳

۳۷۔ عمر گریزاں (شعری مجموعہ) مشمولہ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات ،ص۶۹

۳۸۔ عمر گریزاں (شعری مجموعہ) مشمولہ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص ۸۰

۳۹ عمر گریزاں (شعری مجموعہ) مشمولہ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۸۲

۴۰۔ عمر گریزاں (شعری مجموعہ) مشمولہ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۹۱

۴۱۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۶۷

۴۲۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۶۷

۴۳۔ منزہ یاسمین،حیدر قریشی شخصیت اور فن،ص۶۵

۴۴۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۷۰

۴۵۔ اکبر حمیدی،حیدر قریشی کی غزل،مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات،ص۹۵

۴۶۔ عمرلاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۷۱

۴۷۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۸۲

۴۸۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۸۴

۴۹۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۸۵

۵۰۔ دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۸۴

۵۱۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص،۳۳

۵۲۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۳۵

۵۳۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۳۶

۵۴ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۳۷

۵۵۔ عمرلاحاصل کا حاصل،ص۵۳

۵۶۔ اکبر حمیدی،حیدر قریشی کی غزل (مضمون) مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات،ص۹۶

۵۷۔ عمرلاحاصل کا حاصل کلیات،ص۶۵

۵۸۔ حیدر قریشی،سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ،کلیات،ص۲۵

۵۹۔ حیدر قریشی،درد سمندر،مشمولہ کلیات،ص۲۶

۶۰۔ حیدر قریشی،محبت کی نمناک خوشبو (خاکہ) مشمولہ کلیات،ص۳۰۶

۶۱۔ حیدر قریشی،عمر گریزاں،مشمولہ کلیات،ص۴۷

۶۲۔ حیدر قریشی،دعائے دل،مشمولہ،کلیات،ص۸۳

۶۳۔ دعائے دل،کلیات،ص۹۴

۶۴۔ حیدر قریشی،سلگتے خواب (مجموعہ) کلیات ص۲۳

۶۵۔ ڈاکٹر صابر آفاقی،خواب بننے والا شاعر (مضمون) مشمولہ،حیدر قریشی کی ادبی خدمات،ص۱۲۰

۶۶۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۵۶

۶۷۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۵۶

۶۸۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۵۷

۶۹۔ سلگتے خواب (مجموعہ) مشمولہ کلیات، ص۴۷
۷۰۔ حیدر قریشی، قفس کے اندر، ص۴۸
۷۱ حیدر قریشی، قفس کے اندر، ص۸۵
۷۲ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۸۷
۷۳ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۹۷
۷۴۔ حیدر قریشی، سلگتے خواب کلیات، ص۵۷
۷۵۔ سلگتے خواب، ص۶۳
۷۶۔ حیدر قریشی، عمر گریزاں (مجموعہ) مشمولہ کلیات، ص۷۱
۷۷۔ حیدر قریشی، دعائے دل (مجموعہ) مشمولہ کلیات، ص۸۱
۷۸۔ دعائے دل، کلیات، ص۸۰
۷۹۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۶۵
۸۰۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۶۰
۸۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۹۵
۸۲۔ دعائے دل، مشمولہ، عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات ص۸۷
۸۳۔ سلگتے خواب، مشمولہ کلیات، ص۲۷
۸۴۔ دعائے دل، مشمولہ کلیات، ص۸۷
۸۵۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۱۰۵
۸۶۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۱۰۱
۸۷۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۵۷
۸۸۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۶۵
۸۹۔ سلگتے خواب، مشمولہ، کلیات ، ص۶۲
۹۰۔ ڈاکٹر شفیق احمد، حیدر قریشی کی شاعری (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی کی ادبی خدمات، ص۱۱۴
۹۱۔ قفس کے اندر، ص۶۷
۹۲۔ قفس کے اندر، ص۹۷
۹۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء ص۴۳
۹۴۔ دعائے دل، مشمولہ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۸۱
۹۵۔ دعائے دل، مشمولہ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۹۷
۹۶۔ دعائے دل، مشمولہ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات ص۷۰

۹۷۔ عمر گریزاں مشمولہ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات ص۶۶
۹۸۔ عمر گریزاں، کلیات، ص۶۷
۹۹۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۶۴
۱۰۰۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۵۸
۱۰۱۔ نجم الغنی (مولوی)، بحر الفصاحت (جلد ۷،۶) مرتبہ، سید قدرت نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۲۰۰۷ء (جنوری) ص۱۸۰
۱۰۲۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۲۷
۱۰۳۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۲۸
۱۰۴۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۲۹
۱۰۵۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۶۱
۱۰۶۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۶۵
۱۰۷۔ سلگتے خواب، کلیات، ص۴۳
۱۰۸۔ درد سمندر (مجموعہ) مشمولہ کلیات، ص۹۹
۱۰۹۔ درد سمندر (مجموعہ) مشمولہ کلیات ص۹۹
۱۱۰۔ نجم الغنی (مولوی)، بحر الفصاحت (جلد ۷،۶) مرتب، سید قدرت نقوی، ص۵۱
۱۱۱۔ نجم الغنی (مولوی)، بحر الفصاحت (جلد ۷،۶) ص۵۲،۵۲
۱۱۲۔ حیدر قریشی، قفس کے اندر، ص۲۲
۱۱۳۔ قفس کے اندر، ص۲۳
۱۱۴۔ قفس کے اندر، ص۳۶
۱۱۵۔ بحر الفصاحت (جلد ۷،۶) ص۵۳
۱۱۶۔ حیدر قریشی، دعائے دل، کلیات، ص۸۶
۱۱۷۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۱۰۶
۱۱۸۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۱۰۶
۱۱۹۔ عمر لاحاصل کا حاصل، کلیات، ص۵۴
۱۲۰۔ بحر الفصاحت (جلد، ۷،۶) ص۵۴
۱۲۱۔ بحر الفصاحت (جلد، ۷،۶) ص۵۴
۱۲۲۔ دعائے دل (مجموعہ)، کلیات ص۸۷
۱۲۳۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، اُردو اور تدریس اُردو، مرتبہ، ڈاکٹر نثار احمد قریشی،

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۲۰۰۴ء(طبع اول)ص ۹۸

۱۲۴۔ عمر گریزاں (مجموعہ)،کلیات،ص۷۰

۱۲۵۔ سلگتے خواب (مجموعہ) کلیات ،ص۶۱

۱۲۶۔ سلگتے خواب (مجموعہ) کلیات،ص۵۶

۱۲۷ سلگتے خواب (مجموعہ) کلیات،ص۳۱

۱۲۸۔ وارث سرہندی، علمی اُردو لغت (جامع) علمی کتب خانہ، لاہور،۱۹۹۰ء،ص۱۰۴

۱۲۹۔ سلگتے خواب،کلیات،ص۵۹

۱۳۰۔ سلگتے خواب،کلیات،ص۵۱

۱۳۱۔ سلگتے خواب،کلیات،ص۵۱

۱۳۲۔ قفس کے اندر،ص۴۳

۱۳۳۔ سلگتے خواب،کلیات،ص۸۷

۱۳۴۔ دررسمندر (مجموعہ)،کلیات،ص ۹۹

۱۳۵۔ غلام ربانی، الفاظ کا مزاج، رابعہ بک ہاؤس، لاہور، س ن، ص۵

۱۳۶۔ دردسمندر (مجموعہ)،کلیات،ص۱۰۱

۱۳۷۔ دردسمندر (مجموعہ)،کلیات،ص۹۹

۱۳۸۔ دعائے دل (مجموعہ)،کلیات،ص۹۵

۱۳۹۔ عمر گریزاں (مجموعہ) کلیات،ص۹۳

۱۴۰۔ عمر گریزاں (مجموعہ) کلیات،ص۹۹

۱۴۱۔ قفس کے اندر،ص۱۰۰

۱۴۲۔ عمر لاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۱۰۳

۱۴۳۔ دعائے دل،کلیات،ص۹۵

۱۴۴۔ عمر لاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۱۰۲

۱۴۵۔ عمر لاحاصل کا حاصل،ص۱۰۵

۱۴۶۔ عمر لاحاصل کا حاصل،ص۱۰۵

۱۴۷۔ عمر لاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۰۳

۱۴۸۔ سلگتے خواب، مشمولہ کلیات،ص۵۵

۱۴۹۔ دردسمندر،کلیات،ص۹۴

۱۵۰۔ عمر لاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۰۷

۱۵۱۔ عمر لاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۶۳

۱۵۲۔ عمر لاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۸۱

۱۵۳۔ قفس کے اندر (کلیات)ص۵۶

۱۵۴۔ قفس کے اندر،ص۵۴

۱۵۵۔ دعائے دل،کلیات،ص۹۹

۱۵۶۔ دردسمندر،کلیات،ص۹۷

۱۵۷۔ دردسمندر،کلیات،ص۹۷

۱۵۸۔ عمر گریزاں،کلیات،ص۷

۱۵۹۔ سلگتے خواب،کلیات،ص۳۹

۱۶۰۔ سلگتے خواب،کلیات،ص۶۳

۱۶۱۔ سلگتے خواب،کلیات کلیات،ص۱۰۶

۱۶۲۔ محبت کے پھول (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۱۳۷

۱۶۳۔ محبت کے پھول (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۱۳۷

۱۶۴۔ محبت کے پھول (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۱۳۷

۱۶۵۔ محبت کے پھول (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۱۵۷

۱۶۶۔ محبت کے پھول (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۱۵۷

۱۶۷۔ محبت کے پھول (مجموعہ) مشمولہ کلیات،ص۱۵۷

۱۶۸۔ عمر لاحاصل کا حاصل،ص۱۵۰

۱۶۹۔ عمر لاحاصل کا حاصل،ص۱۵۰

۱۷۰۔ قفس کے اندر،ص۱۴۴

۱۷۱۔ قفس کے اندر،ص۱۴۴

۱۷۲۔ شگفتہ الطاف، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری، مشمولہ، عکاس، اسلام آباد، شمارہ نمبر۴، ۲۰۰۵ء،ص۲۳

۱۷۳۔ عمر لاحاصل کا حاصل،کلیات،ص۱۵۲

۱۷۴۔ عمر لاحاصل کا حاصل،کلیات،ص،۱۵۳

۱۷۵۔ عمر لاحاصل کا حاصل کلیات،ص۱۳۹

۱۷۶۔ عمرلاحاصل کا حاصل کلیات،ص۱۳۹

۱۷۷۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۴۳

۱۷۸۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۹

۱۷۹۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۹

۱۸۰۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۱

۱۸۱۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۱

۱۸۲۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۳

۱۸۳۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۳

۱۸۴۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری، مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات، مرتبہ، پروفیسر، نذر خلیق، میاں محمد بخش پبلشرز خانپور، ۲۰۰۳ء، ص۱۴۷

۱۸۵۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۹

۱۸۶۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۹

۱۸۷۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۰

۱۸۸۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۰

۱۸۹۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۰

۱۹۰۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۵

۱۹۱۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۸

۱۹۲۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۸

۱۹۳۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۱

۱۹۴۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۶

۱۹۵۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۲

۱۹۶۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۳

۱۹۷ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۳

۱۹۸۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۲

۱۹۹۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۴۲

۲۰۰۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۹

۲۰۱۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۹

۲۰۲۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۵۶

۲۰۳۔ قفس کے اندر،ص۱۴۵

۲۰۴۔ قفس کے اندر،ص۱۴۵

۲۰۵۔ قفس کے اندر،ص۱۴۷

۲۰۶۔ قفس کے اندر،ص۱۴۰

۲۰۷۔ سید عابد علی عابد، اُسلوب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء (طبع دوم)ص۱۷۶

۲۰۸۔ قفس کے اندر،ص۱۴۳

۲۰۹۔ قفس کے اندر،ص۱۴۳

۲۱۰۔ قفس کے اندر،ص۱۳۸

۲۱۱۔ قفس کے اندر،ص۱۰۶

۲۱۲۔ قفس کے اندر،ص۱۲۶

۲۱۳۔ قفس کے اندر،ص۱۲۸

۲۱۴۔ قفس کے اندر،ص۱۲۸

۲۱۵۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۱۳

۲۱۶۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۲

۲۱۷۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۱۱

۲۱۸۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۳

۲۱۹۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۳۴

۲۲۰۔ سید عابد علی عابد، اُسلوب،ص۱۴۰

۲۲۱۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۱۱

۲۲۲۔ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات)ص۱۰۹

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

باب سوم

حیدر قریشی بحیثیت محقق

باب سوم

حیدر قریشی بحیثیت محقق

حیدر قریشی کی ادبی خدمات کا جامع احاطہ کرنے کے لیے ان کی تمام تخلیقات، تنقیدات اور تحقیقات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ صرف اِسی صورت میں اُن کے فکری نظام اور ادبی مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں استخراجی اور استقرائی طریق کار کی مدد سے مطلوبہ نتائج تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆حیدر قریشی کی تحقیقی تصانیف کا تعارف

حیدر قریشی بنیادی طور پر یک موضوعی محقق ہیں کیونکہ اُن کی تمام تر تحقیقات کا دائرہ کار صنف ماہیا تک محدود ہے۔ اِس حوالے سے وہ اب تک پانچ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جس میں اس صنف کا آغاز و ارتقا اور دوسرے اہم موضوعات پر سیر حاصل تحقیقی مباحث شامل ہیں۔ اس صنف پر ان کی تحقیق نے اُردو ادب میں جہاں کئی پرانے سوالوں کے تشفی بخش جوابات مہیا کیے وہاں نئے سوال بھی اُٹھائے ہیں۔ ماہیے کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ پانچوں کتابیں نئے اور تازہ حقائق منظرِ عام پر لاتی ہیں، ان میں تنقیدی، تشریحی اور توضیحی مطالعات معیاری تحقیق کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) اُردو میں ماہیا نگاری (تحقیق و تنقید)

فرہاد پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

(۲) اُردو میں ماہیے کی تحریک

فرہاد پبلی کیشنز، اسلام آباد ۱۹۹۹ء

(۳) اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

معیار پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۹۹ء

(۴) اُردو ماہیا

(یہ کتاب اپنی اولین شکل میں صرف انٹرنیٹ پر دستیاب تھی، جسے بعد میں ماہیے کے کلیات میں شامل کر لیا گیا تھا)

(۵) ماہیے کے مباحث

یہ کتاب بھی کلیات کا حصہ ہے۔ الگ سے شائع نہیں ہوئی۔

(۶) اردو ماہیا: تحقیق و تنقید (کلیات)

اس کلیات میں اُردو ماہیے کی پانچوں کتابیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب الوقار پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۱۰ء میں شائع کی تھی۔

حیدر قریشی کی ان پانچوں کتابوں میں جہاں تحقیقی مضامین و مقالات پڑھنے کو ملتے ہیں وہاں ان میں تنقیدی تحریریں بھی شامل ہیں لیکن زیرِ نظر باب میں صرف تحقیقی کام سے غرض رکھی جائے گی کیونکہ ان کی تنقیدی خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے الگ باب مختص کیا گیا ہے۔

(الف) حیدر قریشی کے تحقیقی موضوعات

حیدر قریشی کے ہاں نمائندہ تحقیقی موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) ماہیے کا آغاز و ارتقا

حیدر قریشی کی تمام تر تحقیقات کا مرکز و محور صنف ماہیا ہے وہ خود بھی ایک انٹرویو میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’میں نرا پُرا تخلیقی آدمی ہوں، تھوڑا بہت تحقیقی کام کیا بھی ہے تو ماہیے کے بارے میں‘‘ (۱)

یہ ’’تھوڑا بہت‘‘ کام پانچ کتابوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس موضوع کو آگے بڑھانے سے پہلے صنف ماہیا کی تعریف پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ’’ اظہارِ محبت (ماہی: محبوب) کے لیے تین مصرعوں پر مشتمل پنجابی اور سرائیکی کی مقبول صنفِ سخن اُردو میں بھی مستعمل ہے۔ کسی زمانہ میں، ماہیا لوگ ادب کا حصہ، اور ڈیڑھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اپنی اصلی صورت میں ماہیا صرف محبوب کے لیے وقف تھا۔ اور محبوب کے حوالے سے ہی دل کے معاملات کا بیان ہوتا تھا، مگر اب ماہیا ہر نوع کے موضوعات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔‘‘ (۲)

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کی ہیئت پر بھی روشنی ڈالی ہے:

''ڈیڑھ مصرعوں کے ماہیے میں پہلا مصرع بالعموم موضوع
سے غیر متعلق ہوتا تھا لیکن دوسرے مصرعے کے ساتھ
مل کر مفہوم اُجاگر کرتا تھا مگر تین مصرعوں پر مشتمل ماہیے
میں تینوں مصرعے ہی موضوع سے متعلق ہوتے ہیں''

(۳)

یہ تعریف بڑی حد تک صنف ماہیا کے خدوخال واضح کرتی ہے تاہم اس کی بہتر اور کلی تفہیم کے لیے حیدر قریشی کی طرف رجوع لازمی ہے کیونکہ وہ اس صنف کا اصل پس منظر سامنے لاتے ہوئے کئی پوشیدہ گوشوں کو منور کر رہے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے:

''ماہیا سرزمین پنجاب کا عوامی گیت ہے۔ ماہیا کا لفظ
''ماہی'' سے نکلا ہے لیکن یہ اُردو والا ماہی
نہیں۔۔۔پنجابی میں بھینس کو مہیں کہتے ہیں۔ بھینس
چرانے والے کو اسی نسبت سے ماہی کہا جاتا ہے۔''(۴)

''ماہی'' کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''جب محبت کے قصوں میں رانجھے اور مہینوال کو اپنے
اپنے محبوب تک رسائی حاصل کرنے کیے لیے چرواہا بننا
پڑا تو پھر ان کرداروں کی رومانوی کشش نے لفظ ماہی کو
چرواہے کی سطح سے اُٹھا کر نہ صرف ہیر اور سوہنی کا محبوب
بنا یا دیا بلکہ ہر محبت کرنے والی مٹیار کا محبوب ماہی قرار پایا
۔اسی ماہی کے ساتھ اپنے پیار کے اظہار کے لیے ماہیا
عوامی گیت بن کر سامنے آیا۔''(۵)

حیدر قریشی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ماضی میں ماہیے کے لیے ''بگڑو''، ''اور ٹپا'' کے نام بھی استعمال ہوتے تھے۔مگر ان کا چلن عام نہ ہوسکا اور رفتہ رفتہ ''ماہیا'' کا نام قبولِ عام کا درجہ حاصل کرتا چلا گیا۔

ماہیا پنجابی تہذیب وثقافت کا زائیدہ ہے اور اس میں گہرے فلسفیانہ اور فکری موضوعات کے برعکس جذبوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پنجابی میں ماہیے کی جو روایت چلی آرہی ہے، اُس میں پیار و محبت کا اظہار عورت کی طرف سے زیادہ ہوتا ہے، لیکن مرد کے اظہاریے بھی موجود ہیں۔ دورِ جدید میں عورتوں کی نسبت مردوں نے اس صنف پر خصوصی توجہ صرف کی جس کی وجہ سے یہ صنف اپنی انفرادیت اور اہمیت منوانے میں کامیاب رہی ہے۔

صنف ماہیا کے ساتھ عورت کی جو وابستگی رہی ہے۔اس ضمن میں حیدر قریشی نے اپنی تحقیقی کاوشوں کی بدولت کچھ نئے نکات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے:

''ماہیا بظاہر عورت کی زبان میں مرد سے محبت کا اظہار
ہے، اس حوالے سے ماہیے کو قدیم ہندوستانی گیت کے تنا
ظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔غور کیا جائے تو یہ صوفی شعرا کا با
لواسطہ اثر بھی محسوس ہوتا ہے کہ صوفیانہ شاعری میں محبوب
ہمیشہ مذکر کے صیغہ میں آیا ہے۔ ریختی سے بھی اس کے
سِرے ملائے جاسکتے ہیں، کیوں کہ ریختی میں عورت کی
زبان سے جذبات کا بے محابا اظہار کیا جاتا ہے۔''(٦)

عورت کی طرف سے کہے گئے ماہیوں کی دو پنجابی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) منجی دھپے چھانویں ڈائی ہوئی اے
غم ساہنوں سجناں دا
لوکاں مرض بنائی ہوئی اے (٧)

(ترجمہ) میں نے چارپائی دھوپ چھاؤں میں ڈال رکھی ہے، مجھے اپنے محبوب کا غم ہے لیکن لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں بیمار ہوں۔

(ب) چٹے رنگ دا بدام ہوسی
جیندیاں وی تیری آں
مویاں مٹی وی غلام ہوسی (٨)

(ترجمہ) سفید رنگ کا بادام ہوگا، اور جب تک زندہ ہوں تمہاری رہوں گی اور اگر مر گئی تو میری مٹی بھی تمہاری غلام بن کر رہے گی۔

ان دونوں ماہیوں میں عورت کا غیر مشروط جذبۂ محبت نہایت سادگی لیکن اپنی پوری تاثیر کے ساتھ اظہار پاتا ہے یہی سادگی اور فطری اُسلوب ماہیے کا جوہر ہے۔

حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''ماہیے میں پنجاب کے عوام کے جذبات، احساسات
اور خواہشات تک کا خوبصورت اور براہِ راست اظہار ملتا
ہے۔عوام نے اپنی اُمنگوں، آرزوں اور دعاؤں کو اس

شاعری کے ذریعے سینہ بہ سینہ آگے بڑھایا اور زندہ رکھا۔
اسی لیے یہ عوامی گیت اپنی ظاہری صورت میں انفرادی ہو
نے کے باوجود اپنی سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔''(۹)

ماہیے کا ارتقائی سفر کئی وسیلوں سے گزرتا ہوا دورِ جدید تک پہنچتا ہے، لیکن آج بھی اس میں قدیم مظاہر فطرت، معصومیت اور سادگی کا پرتو موجود ہے۔ یہ صنف اپنی شیرنی، معنی آفرینی، رنگینی اور نغمہ آفرینی کی بدولت اُردو زبان میں بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ماہیوں کے مجموعے جس تواتر سے سامنے آ رہے ہیں وہ بھی اس کی مقبولیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی رسائل و جرائد اور موسیقی کی بدولت بھی یہ صنف فطری نشو و نما کی منازل طے کر رہی ہے۔

(۲) ماہیے کے اصل اوزان کی دریافت

اُردو ادب کی کئی شعری اصناف ایسی ہیں جو اپنے مخصوص اوزان کی وجہ سے ہی شناخت حاصل کرتی ہیں، مثلاً رباعی، مثنوی اور ماہیا وغیرہ۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جبکہ قطعے کے بھی چار مصرعے ہو سکتے ہیں۔ اب اگر ان میں سے رباعی کی شناخت کرنا ہو تو اس کی مخصوص بحروں اور اوزان کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جائے گا، ورنہ اپنی ظاہری صورت میں دونوں ایک ہیں۔ مثنوی بھی مخصوص بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں ماہیا، ثلاثی اور ہائیکو تین تین مصرعوں میں لکھی جانے والی مختلف اصناف ہیں، بظاہر ان کی تحریری ساخت میں کوئی نمایاں فرق نہیں کیونکہ تینوں عروضی آہنگ کی پابند ہیں البتہ ہر صنف کی جداگانہ شناخت قائم کرنے کے لیے صرف وزن ہی کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ موجود نہیں ہے۔

ماہیے کی اصل پنجابی ہے اور اُردو میں اس کا ورود ایک خوش آئند امر ہے۔ پنجابی زبان میں ماہیا اپنی خاص دھن میں گایا جاتا رہا ہے۔ یہ مخصوص دھن زمانۂ قدیم سے متوارث چلی آ رہی ہے، ہر دور میں اسی دُھن کی پابندی گانے والوں کے فرائض میں شامل رہی ہے۔ یہی پنجابی ماہیا جب اُردو میں آیا تو اکثر شاعروں نے اپنی سہولت اور پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے مختلف بحروں میں لکھنا شروع کر دیا۔ البتہ ابتدا میں چند ایک شاعروں نے پنجابی دھن کا احترام کرتے ہوئے ماہیے کے اصلی اوزان میں بھی ماہیے لکھے ہیں لیکن تعجب ہے کہ یہ روایت آگے نہ چل سکی اور ماہیے کی صنف غفلت اور سہل انگاری کی بدولت عروضی اعتبار سے انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس کا بڑا نقصان یہ سامنے آیا کہ ثلاثی، ہائیکو اور ماہیے کا باہمی فرق نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جس شاعر نے جو کہہ دیا وہی حرفِ آخر بن گیا۔ حیدر قریشی نے صنفِ ماہیا کے درست اوزان کے سلسلے میں جو راست قدم اٹھایا تھا وہ رفتہ رفتہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور بالآخر وہ وقت آ گیا جب حیدر قریشی کا پیش کردہ نقطۂ نظر درست تسلیم کر لیا گیا اور تا حال اس کی پابندی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ ماہیے کے وزن پر حیدر قریشی کی تحقیقات کا اصل موقف یہ ہے:

''میرا موقف ہے کہ ماہیا اصلاً لوک گیت ہے جس کی اپنی
مخصوص دُھن ہے بس اسی دُھن میں ہی اس کا اصل وزن
موجود ہے۔''(۱۰)

حیدر قریشی نے نہ صرف اصل وزن کی نشاندہی کی بلکہ خود بھی اسی وزن میں ماہیے لکھ کر اس صنف کی بنیادیں مضبوط کی ہیں۔ ان کے نزدیک اُردو ماہیے کے درج ذیل ارکان پنجابی دُھن کے عین مطابق ہیں:

	(ماہیا)	(وزن)
(ا)	مستی سے بھری پپلی	فعلن فعلن فعلن
	الہر مٹیاریں	فعلن فعلن فع
	جب کھیل گیئں ککلی (۱۱)	فعلن فعلن فعلن
(ب)	تختی کو سکھاتے تھے	مفعول مفاعیلن
	خواب سہانے تھے	فعل مفاعیلن
	پر دل کو دکھاتے تھے (۱۲)	مفعول فعاعیلن
(ج)	کتنے بدنام ہوئے	فعلن مفعول فعل
	پیار میں تیرے ہم	فاع مفاعیلن
	پھر بھی ناکام ہوئے (۱۳)	فعلن مفعول فعل
(د)	ناکامی سے ڈرتے ہو	مفعول فعاعیلن
	عشق بھی کرتے ہو	فاع فعاعیلن
	بدنامی سے ڈرتے ہو (۱۴)	مفعول فعاعیلن
(ر)	اس حال فقیری میں	مفعول مفاعیلن
	عمریں بیت گئیں	فعلن فاع فعل
	زلفوں کی اسیری میں (۱۵)	مفعول فعاعیلن

ان ماہیوں کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مصرعِ ثانی میں ایک سبب کم ہے اور اس کی یہی خوبی اصل پہچان کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر تینوں مصرعوں کو مساوی اوزان میں لکھا جائے تو وہ ثلاثی بن جائے گی یا اسے سہ مصرعی نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ اُردو میں سہ مصرعی نظمیں لکھنے کا رواج عام ہے ہائیکو کا وزن ۵۔۷۔۵ ہے جبکہ ماہیا خواہ کسی بھی وزن میں ہو اس کے ارکان ۱۲۔۱۰۔۱۲ ہی رہیں گے۔ اگر ان اوزان کی پابندی نہیں کی جائے گی تو پھر ثلاثی، ہائیکو اور ماہیے کا باہمی فرق ختم ہو جائے گا۔

شگفتہ الطاف نے درست لکھا ہے:

''اُردو ماہیے پر عروضی اعتبار سے تنقیدی کام کی ضرورت
اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ یہ صنف بھی ہائیکو اور ثلا
ثی کی طرح عمومی ساخت کے مطابق بظاہر تین مصرعوں
کی ایک نظم ہے لیکن اس کا عروضی اعتبار ہی اسے ثلاثی اور
جاپان سے درآمدہ صنف ہائیکو سے جدا قرار دیتا ہے۔
''(۱۶)

حیدر قریشی کی اولیت اس حوالے سے نہیں بنتی کہ اُنھوں نے سب سے پہلے ماہیے کے مذکورہ بالا اوزان متعارف کرائے، کیونکہ ان اوزان میں ہمت رائے شرما، حسرت موہانی، ساحر لدھیانوی اور قمر جلال آبادی پہلے ہی ماہیے لکھ چکے تھے، حیدر قریشی کے تحقیقی کام کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اُنھوں نے ماہیے کے اصل اوزان پر اصرار کیا اور تاریخی شواہد کی روشنی میں دیگر اوزان کو مسترد کر دیا، ورنہ صورتِ حال یہ بنی ہوئی تھی ہر شاعر اپنی سہ مصری نظموں کو ماہیا ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ حیدر قریشی نے اس صنف کو شناخت دلائی ہے۔

ماہیے کے وزن، موضوع اور ہیئت پر حیدر قریشی کے ابتدائی مضامین اور مباحث ''ادب لطیف''، ''تجدید نو'' اور ''ابلاغ'' میں دیکھے جا سکتے ہیں اس کے علاوہ اوراق (لاہور)، نیرنگ خیال (راولپنڈی) صریر (کراچی) بھنگڑا (گوجرانوالہ) ایوان اردو (دہلی) اور گلبن (انڈیا) میں ماہیے کے موضوع پر اُنھوں نے مسلسل اس موضوع پر لکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دیگر ادیبوں نے گرم جوشی سے اس بحث میں حصہ لینا شروع کر دیا، کچھ عرصہ بعد یہ موضوع تحریک کی شکل اختیار کر گیا و راس تحریک کے بانی اور پر جوش لکھاری حیدر قریشی قرار پاتے ہیں۔

شگفتہ الطاف رقمطراز ہیں:

''گذشتہ چند دہائیوں میں جو تحریک اُردو ماہیے کے حوالے سے پروان چڑھی
ہے اس میں اُردو ماہیے کو فروغ دینے والوں میں اہم ترین اور نمایاں نام

حیدر قریشی کا ہے''(۱۷)

یہ تحریک پاک و ہند کے ادبی رسائل کے علاوہ انٹرنیٹ پر موجود اردو جرائد اور یورپی ممالک سے نکلنے والے اردو رسائل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ حیدر قریشی نے جس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی وہ آخر کار کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور ان کے پیش کردہ اوزان کو قبولِ عام کی سند ملنا شروع ہو گئی۔

عارف فرہاد کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

''۱۹۹۲ء میں حیدر قریشی نے نہ صرف مختلف ادبی پرچوں
اور موقر ادبی جرائد کے ذریعے ماہیے کے وزن پر اربابِ
دانش کی توجہ مرکوز کی بلکہ اردو ماہیے کے اصل اوزان کی
نشاندہی بھی کی ہے رفتہ رفتہ ان کا یہ اصلاحی عمل ایک اہم
تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور آج لگ بھگ سو سے زائد
شعرائے کرام درست اوزان میں ماہیے تخلیق کر رہے
ہیں۔''(۱۸)

ہر تحریک اپنے حاصل شدہ ثمرات، نتائج اور اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ حیدر قریشی کی تحریک اپنے اثرات کے اعتبار سے خاصی ہمہ گیر اور دور رس نتائج کی حامل ہے اس تحریک نے ایک عوامی گیت جو ہماری تہذیبی روایت کا مضبوط حصہ تھا از سر نو زندہ کر دیا۔

شگفتہ الطاف کے بقول:

''یوں لگتا ہے کہ حیدر قریشی اس عوامی صنف کو اردو زبان
کی رنگت اوڑھے اسالیب اور نئے رنگ و آہنگ کے
ساتھ عوام الناس میں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے
ہیں۔''(۱۹)

حیدر قریشی کا موقف حق پر مبنی تھا اور منطقی طور پر اسے رد کرنا محال تھا اس کے باوجود ابتدا میں ان کی خاصی مخالفت ہوئی۔ جن لوگوں کے پاس عقلی و نقلی دلائل نہیں تھے اُنھوں نے ذاتی اور شخصی تنقید کا سہارا لیا لیکن جلد ہی اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اگر اس مخلصانہ تنقید کو جمع کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ جناب قریشی کو کتنے سخت امتحانوں سے گزرنا پڑا تھا، جب کہ موجودہ صورتِ حال کے بارے میں اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

''آج حیدر قریشی کے موقف کو اس قدر پذیرائی مل چکی
ہے کہ ماہیا نگار شعرا میں سے اسی (۸۰) فیصد سے زاہد

شعرانہ صرف ان کے ہم خیال ہیں بلکہ اُنھیں ماہیے میں
بطور اتھارٹی تسلیم کرتے ہیں۔'' (۲۰)

حیدر قریشی کا ذوقِ تحقیق حقائق کی تلاش وجستجو اور تفہیم وتحلیل کا ایک مثالی نمونہ ہے، جو کئی حوالوں سے قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید ہے۔ اُنھوں نے حقائق کی بازیافت میں ہر ممکن ذریعے کو کام میں لایا اور اُردو دنیا کو ماہیے کی فہم کا راست طریقہ سمجھایا۔

(۳) ماہیے کی تحریری صورت کا مسئلہ

اُردو اور پنجابی ادب میں یہ مسئلہ عرصہ دراز تک نزاعی مباحث کا موضوع بنا رہا کہ ماہیے کی اصل تحریری صورت کیا ہے؟ محققین کے پیش کردہ قیاسات اور مفروضات کے مطابق اس صنف کی مندرجہ ذیل تین تحریری صورتیں ممکن ہیں:

(ا) یک مصرعی ہیئت

نہروں میں نہاتے تھے، پاس کے مندر سے، پرشاد چراتے تھے'' (۲۱)

(ب) ڈیڑھ مصرعی ہیئت

نہروں میں نہاتے تھے
پاس کے مندر سے، پرشاد چراتے تھے

(ج) سہ مصرعی ہیئت

نہروں میں نہاتے تھے
پاس کے مندر سے
پرشاد چراتے تھے

حیدر قریشی جہاں معروضی حقائق کی بنیاد پر ماہیے کے اصل اوزان کو سامنے لائے وہاں اس کی تحریری صورت اور ہیئت پر بھی قابلِ قدر تحقیقات متعارف کرائی ہیں۔ اس مسئلے کی بہتر جانچ پڑتال کی خاطر اُنھوں نے پاک وہند کے اردو اور پنجابی تخلیق کاروں اور ناقدین محققین کی آرا کو بھی اہمیت دی ہے۔ ماہیے کی تحریری صورت متعین کرانے میں جن احباب نے اختلافی امور میں حصہ لیا، ان میں پروفیسر شارب، تنویر بخاری، امین خیال، ڈاکٹر روشن لال اہوجا، علامہ غلام یعقوب، اسلم جدون، ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری اور شفقت تنویر مرزا کے نام زیادہ اہم ہیں۔ حیدر قریشی کے ساتھ ادبی مباحث میں جن ادیبوں نے حصہ لیا اس میں اور نام بھی شامل ہیں لیکن بخوف طوالت اور اہمیت کے پیشِ نظر انھی ناموں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ماہیا اصل میں عوامی گیت یا لوک ادب کا حصہ ہے اور صدیوں تک یہ صرف گانے تک محدود رہا اسی لیے جب اسے

تحریری صورت میں محفوظ کرنے کا مرحلہ آیا تو ہر شخص نے اپنی صوابدید کے مطابق اسے لکھنے کی کوشش کی، اسی ذاتی پسند و ناپسند کی وجہ سے ماہیے کی تحریری شکل اشکال وانتشار کا شکار ہو گئی۔

ابتدا میں جن پنجابی لکھاریوں نے اسے محفوظ کرنے کی بنیاد رکھی وہ بھی اسے یک مصرعی، ڈیڑھ مصرعی اور سہ مصرعی صورتوں میں لکھ لیتے تھے۔ اسی روایت کو اُردو والوں نے بھی اپنایا، لہٰذا کسی ایک شکل پر کوئی واضح لائحہ عمل نہ طے پا سکا۔ حیدر قریشی نے اس ادبی تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور پاک وہند کے ادبی رسائل وجرائد میں اپنا نقطۂ نظر ممکنہ شواہد کی روشنی میں پیش کر دیا۔ اگر ان کے موقف کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تدریجاً آگے بڑھتے رہے اور اپنے دلائل کی ہر اینٹ کو مضبوطی سے اُستوار کرتے رہے۔ اُن کی پہلی دلیل یہ ہے:

'' ماہیا بنیادی طور پر لوک شاعری ہے۔ پنجاب کے
دیہات میں شادی بیاہ کے مواقع پر آج بھی ماہیے بڑے
شوق سے گائے جاتے ہیں، ماہیا کی اپنی ایک مخصوص
دھن ہے۔ مسرت نذیر کے گائے ہوئے ماہیے'' چٹا ککڑ
بنیرے تے'' اسی مخصوص دھن میں گائے گئے ہیں۔
متعدد پاکستان اور بھارتی فلموں میں بھی ماہیے بطور گیت
گائے گئے ہیں (۲۲)

محولہ بالا اقتباس میں ماہیے کی جس مخصوص دھن کا ذکر ملتا ہے۔ آگے چل کر یہی دھن اس صنف کی تحریری صورت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے ایک اور مضمون ''ماہیا پابندِ نے ہے'' میں اسی اہم نکتے کو دہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ماہیا پنجابی لوک گیت ہے۔ اس کی مخصوص لے ہے اور ماہیا اپنی لے کا پابند ہے۔'' (۲۳)

حیدر قریشی اس خدشے کا اظہار بھی کرتے ہیں:

'' ہیئت کو چور دروازہ بنا کر ماہیے کی لوک لے سے الگ نہ کیا جائے۔'' (۲۴)

ماہیے کی مخصوص دھن اور لے والا موقف اس اعتبار سے خاصا وزنی ہے کہ مصرعوں کی اصل مقدار کا تعین سانس کے ٹوٹنے سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ موسیقی کے عام اُصول کے مطابق تقریباً ہر گلوکار ایک مصرع ایک سانس میں گاتا ہے اور مصرعِ اُولیٰ عموماً دو مرتبہ گایا جاتا ہے اور کبھی کبھی ٹیپ کے مصرعے کی تکرار بھی ہوتی ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا شادی بیاہ میں جو ماہیے خواہ وہ مساوی الوزن ہوں یا مصرع ثانی میں ایک سبب کم، گائے جاتے ہیں، کیا گانے والا ایک ہی سانس میں پورا ماہیا گا کر فارغ ہو جاتا ہے؟ یا ڈھول اور تالیوں کی تھاپ پر ہر مصرعے کو الگ الگ کر کے دکھایا جاتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں اصل حقائق پوشیدہ ہیں۔

مزید یہ کہ آیا ماہیے کی تحریری صورت کا تعلق یک مصرعی، ڈیڑھ مصرعی یا سہ مصرعی ہیئت کے ساتھ ہے یا نہیں۔ اس قضیے کا فیصلہ کسی شخص کی ذاتی پسند اور ناپسند پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف معروضی اور اُصولی بنیادوں پر کرنا ہو گا۔ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ماہیا اصل میں گائی جانے والی صنف ہے، اور تحریر سے اس کا بظاہر کوئی رشتہ نہیں نکلتا۔ جب اس کی تحریری صورت پر بات ہو گی تو لامحالہ ہمیں اس کی دُھن اور لے کی جانب رجوع کرنا ہو گا اور جو بات دُھن سے ثابت ہو گی وہی حتمی ہو گی۔ اس کے علاوہ باقی سب مفروضات کی ذیل میں آئے گا۔ ایسے مفروضات جن کی بنیاد محض ذاتی سہولت اور ذاتی پسند پر اُستوار ہوتی ہے اور اُصولی مباحث سے اُن کا تعلق نہیں بنتا۔

ماہیے کی دُھن اور لے کوئی نئی چیز نہیں ہے اس روایت کو صدیوں سے نبھایا جا رہا ہے۔ ہر مصرعے پر سانس کا ٹوٹنا اور پھر نئے مصرع کا پہلے مصرع سے مل کر تاثر گہرا کرنا ہمارے عام مشاہدے کی بات ہے یہی عام مشاہدہ آگے چل کر اس کی تحریری ہیئت کے نقوش متعین کرتا ہے۔

ماہیے کی تحریری اور صوتی ہیئت میں جو گہری مناسبت ہے اُسے بیان کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ معمولی سی توجہ معاملے کو صاف کر سکتی ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ ہر صنف اپنی تکنیک، ہیئت، ساخت یا صورت سے پہچانی جاتی ہے۔ جب دُھن کی بنیاد پر اس کے تین مصرعوں کا جواز ثابت ہو جاتا ہے، تو پھر لاحاصل قیاس آرائیوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ماہیا ڈیڑھ مصرعی اور یک مصرعی ہیئت دونوں میں لکھا جا سکتا ہے، لیکن ان کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی جسے کافی و شافی قرار دیا جا سکے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تصنیف ''تنقیدی اصطلاحات'' میں لکھتے ہیں:

''تکنیک سے ہی صنف صورت پذیر ہو کر نام حاصل کرتی ہے۔ (۲۵)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تکنیک مخصوص حد بندیوں کا نام ہے اور اس کی چار دیواری کو قبولنے کے بعد ہی کوئی صنف اپنی منفرد شناخت قائم کرتی ہے۔ حیدر قریشی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جب تک ماہیا کی تحریری صورت واضح نہیں تھی تو ماہیے سے وابستہ اولین لوگ تینوں طرح سے ماہیے لکھ لیتے تھے اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ اس بات کا اضافہ بھی کرتے ہیں:

''بظاہر ان تینوں ہیئتوں میں سے کوئی ہیئت بھی پنجاب
کے دیہاتی عوام کی ایجاد نہیں ہے کیونکہ وہ ماہیے لکھتے ہی
نہیں تھے وہ تو صرف گاتے تھے۔'' (۲۶)

اب یہ ماہیے جمع کرنے والوں کی غلطی تھی کہ وہ ماہیے کی زبانی روایت کو مکمل صحت کے ساتھ تحریری شکل میں محفوظ نہیں کر سکے اور بعد میں آنے والوں نے روایت و درایت کے تمام اُصول پسِ پشت ڈالتے ہوئے محض اندھی تقلید پر انحصار کیا، جس کے باعث یہ صنف تحریری حوالے سے اپنی شناخت قائم کرنے میں غفلت کا شکار

ہو گئی۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ دورِ اول کے ماہیا نگاروں میں کہیں کہیں سہ مصرعی ماہیا لکھنے کا سراغ ملتا ہے لیکن یہ لاشعوری کاوش اپنے اثرات مرتب کرنے میں ناکام رہی۔ سہ مصرعی ماہیے لکھنے کی روایت صرف اسی صورت میں آگے چل سکتی تھی جب تخلیق کار اور محققین حضرات دونوں شعوری، منطقی اور تاریخی شعور کے ساتھ ماہیے کو فروغ دیتے۔ یہ سعادت حیدر قریشی کے حصے میں آئی کہ اُنھوں نے اس صنف کے اوزان اور تحریری ہیئت کو دریافت کرنے کے سلسلے میں جو فرہادی کاوشیں کیں وہ رفتہ رفتہ تحریک کا درجہ حاصل کر گئیں اور لوگوں کو یقین آ گیا کہ حیدر قریشی کا موقف تاریخی اور منطقی حقائق کے عین مطابق ہے، باقی سب بتان آزری۔

(۴) ماہیے کے موضوعات

ادب کی ہر صنف دوہری ہیئت کی حامل ہوتی ہے۔ پہلی کا تعلق وجودی ہیئت کے ساتھ ہے اور دوسری کو ہم جوہری یا صفتی ہیئت کہہ سکتے ہیں۔ وجودی ہیئت ٹھوس ہوتی ہے۔ اسے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے جبکہ جوہری ہیئت قدرے تجریدی صفات کی حامل ہوتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ادبی صنف سے وابستہ ہر موضوع، وجود اور جوہر کے باہمی رشتوں کو بھی خوبصورتی سے واضح کرتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہر صنف کچھ مخصوص اور نمائندہ موضوعات کی بدولت جانی پہچانی جاتی ہے لیکن اپنے خصوص سے ہٹ کر دوسرے موضوعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی سعی کرتی ہے۔ ماہیے کے عمومی موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے یہ ہے:

''اپنی اصلی صورت میں ماہیا صرف محبوب کے لیے وقف
تھا اور محبوب کے حوالے سے ہی دل کے معاملات کا بیان
ہوتا تھا مگر اب ماہیا ہر نوع کے موضوعات کے لیے
استعمال کیا جاتا ہے'' (۲۷)

ماہیے کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ اس صنف کا خمیر چونکہ زرعی معاشرے سے اُٹھا ہے اور ماہیے کے اولین نمونوں میں اظہارِ محبت بھی عورت کی جانب سے ملتا ہے لہٰذا بعد میں مردوں نے بھی اسے اظہارِ عشق کا وسیلہ بنا لیا تھا۔

حیدر قریشی کی تحقیقات نے اُردو ماہیوں کے موضوعات کو ذرا تفصیل سے دکھایا ہے:

''ماہیے کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ اس موضوع کے
تحت محبوب کے حسن کی تعریف، پیار کے اظہار اور اقرار،
محبت میں تکرار، عہد و پیمانی ملن اور جدائی، گلے شکوے
اور کھلی ڈُلی قسم کی چھیڑ چھاڑ کے مضامین آ جاتے ہیں۔
شادی بیاہ کے مختلف جذبات، دیہاتی ماحول اور دھرتی

سے وابستگی بھی ماہیے کے اہم موضوع ہیں۔‘‘(۲۸)

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں:

’’ان موضوعات کے علاوہ حمد،نعت،منقبت، میلے ٹھیلے،روزمرہ زندگی کے معاملات
اور زندگی کے مسائل بھی ماہیے میں بیان ہوتے رہے ہیں۔‘‘(۲۹)

موضوعاتی تنوع کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سلطان کھاروی کے دو ماہیے:

☆ گاگر میں پانی ہے
لفظ محبت کا
دنیا کی کہانی ہے

☆ ہے ناؤ روانی پہ
یاد تیری آئی
چاند آیا جوانی پہ (۳۰)

حیدر قریشی نے خود جو ماہیے تخلیق کیے اُن میں زندگی کے بے شمار روپے اُبھرتے نظر آتے ہیں،اِن کا موضوعاتی کینوس خاصا وسیع ہے۔

چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

☆ ملنا ہو تو ملتے ہیں
پُھول محبت کے
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں (۳۱)

☆ تو خالق اعلیٰ ہے
جو ہر نام سے اور
ہر روپ سے بالا ہے (۳۲)

☆ لیپ ٹاپ تک آ پہنچے
اپنے ہی کمرے میں
ہم آپ تک آ پہنچے (۳۳)

☆ خوشیوں کی گھڑی آئی

آنکھ کے صحرا میں
یادوں کی جھڑی آئی (۳۴)

حیدر قریشی نے اُردو ماہیے میں جن اہم موضوعات کی نشاندہی کی ہے ان کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل موضوعات کی فہرست بندی کی جا سکتی ہے:

(۱) حمدیہ
(۲) نعتیہ
(۳) منقبت
(۴) عشق و محبت
(۵) دعائیہ اور فقیری مزاج کے ماہیے
(۶) رشتے ناتوں پر مشمل ماہیے
(۷) دھرتی سے محبت
(۸) ثقافتی مظاہر
(۹) موسموں کے بدلتے رنگ
(۱۰) میلے ٹھیلے
(۱۱) شادی بیاہ
(۱۲) جبر و ناانصافی
(۱۳) نفسیاتی کیفیات پر مشتمل ماہیے
(۱۴) جنسی خواہشات یا تجربات پر مبنی ماہیے
(۱۵) مناظر فطرت

ماہیا اگرچہ تین مصرعوں کی ایک مختصر سی نظم ہے لیکن اس میں حیات و کائنات کے تمام چھوٹے بڑے موضوعات بآسانی سما سکتے ہیں۔اس صنف کی یہی خوبی بقا کی ضمانت بنی ہے۔حیدر قریشی بڑے اعتماد سے یہ پیش بینی کرتے ہیں:

’’مجھے امید ہے کہ آنے والے برسوں میں ماہیا اپنے
خدوخال اور مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے
موضوعات میں وسعت پیدا کرے گا اور پنجاب کا یہ لوک

گیت اپنے رس اور مٹھاس کے باعث اردو شاعری کی
ایک مقبول صنف قرار پائے گا۔''(۳۵)

حیدر قریشی کے پیش کردہ تحقیقی نتائج سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ ماہیا اپنے ابتدائی دور میں یک موضوعی وصف کا حامل رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ اپنے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد اب ہر قسم کے تہذیبی و ثقافتی موضوع کو جذب کر نے کے قابل ہو چکا ہے۔ ماہیا تخلیقی امکانات رکھتا ہے اور ہر عہد میں لوگوں کی پسندیدگی کا مظہر رہا ہے۔

(۵) ماہیے کے مزاج کا مسئلہ

اُردو ادب میں ہر شعری صنف اپنا مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ غزل، قصیدہ، پابند نظم، آزاد نظم، مثنوی، مرثیہ، رباعی، گیت، شہر آشوب اور ریختی میں جہاں موضوعاتی وسعت اور تنوع کے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں وہاں ان اصناف کے بدلتے مزاج بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ یہ موضوع خاصی دلچسپی اور وسعت کا حامل ہے اور سنجیدہ ناقدین اور محققین نے اس پر قابلِ قدر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس موضوع کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اُردو شاعری کے مزاج سے آشنا ہونے کے لیے اس بر
صغیر کے سارے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو ملحوظ رکھنے کی
ضرورت ہے یہ اس لیے کہ شعر کا مزاج دراصل دھرتی
کے مزاج سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔''(۳۶)

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک دھرتی کا یہ مزاج دو نمایاں رخ رکھتا ہے:

''ایک وہ جو اس کے بنیادی اوصاف سے عبارت ہے،
جس میں اس کی باس، ذائقہ خنکی یا گرمی از خود مستقل
ہوتی اور ہمیشہ قائم رہتی ہے دوسرا وہ رخ جو بیرونی
اثرات کے تحت اُبھرتا ہے اور دھرتی کے مزاج میں ایک
نئی سطح کا اضافہ کر دیتا ہے۔ کسی ملک کی شاعری نہ صرف
دھرتی کے بنیادی اوصاف کی عکاسی ہوتی ہے، بلکہ باہر
سے آئی ہوئی کروٹوں کو بھی خود میں سمولیتی ہے۔''(۳۷)

اُردو شاعری کے حوالے سے یہ جامع رائے ہے۔ یہ رائے جہاں ہر ادبی صنف کی فہم میں بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے وہاں اُردو اصناف کے پس منظری مطالعے کو بھی اہمیت دیتی ہے، ماہیے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیدر قریشی نے صنفِ ماہیا پر تنقیدی اور تحقیقی حوالے سے جو موضوعات متعارف کرائے ان میں

ماہیے کے مزاج کو بطور خاص اُجاگر کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک:

''وزن ماہیے کے لیے جسم کا اور مزاج اس کے لیے روح کا درجہ رکھتا ہے۔''(۳۸)

حیدر قریشی ماہیے کو زرعی معاشرے کی پیداوار خیال کرتے ہوئے اس میں سادگی اور خالص جذبے کی گہرائی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک رمز وایما اور ابہام بھی خاص تخلیقی رکھ رکھاؤ کے ساتھ قابل قبول ہے اور عورت کی فطری محبت اور رومان کا انداز بھی ماہیے کی تشکیلی جہت کا لازمی جزو ہے۔ ماہیے میں انھی عناصر کی موجودگی کے باعث حیدر قریشی کا وہ تجزیہ قابلِ غور ہے جس میں ماہیے کی وسعت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

''اُردو شاعری کی تین بڑی روایات، گیت، غزل اور نظم مجھے
ماہیے میں یکجا ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔'' (۳۹)

ماہیے کی روایت اور تاریخی ارتقا کو سامنے رکھا جائے تو مذکورہ بیان میں سچائی صاف نظر آجاتی ہے۔ ماہیا واقعتاً ایک پر اسرار صنفِ سخن ہے، کیونکہ اس میں تعقل، تخیل، مسرت اور صداقت کی لہریں بیک وقت موجزن رہتی ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی اس میں توازن پایا جاتا ہے۔ ماہیے میں جہاں گیت کی طرح شدید جذبات جلوہ دکھاتے ہیں وہاں غزل کی ایمائیت اور اختصار کے رنگ و آہنگ بھی خاصے نمایاں ہیں نیز آزاد نظم کی وسعت اور موضوعاتی پھیلاؤ کا علاقہ بھی قاری کے فکر و نظر کو متحرک کرتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ماہیے کے مزاج پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''سہ مصرعی اصناف سخن میں اردو ماہیا کو گذشتہ چند برسوں
کے دوران اس لیے زیادہ اہمیت ملی کہ اس میں مقامی
ثقافت کی باس نمایاں ہے دوم یہ صنف سخن لوک مزاج اور
موسیقی طراز ہے تیسری بات یہ کہ اس میں گیت کی طرح
عورت کی کوک بھی زیادہ سنائی دیتی ہے۔(۴۰)

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے اس بیان میں ماہیے کے فنی اور تخلیقی اظہاریے کو گیت سے منسوب کر کے حیدر قریشی کے نقطۂ نظر کو تقویت فراہم کی ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ بات سننے میں آئی ہے کہ ماہیے کے پنجابی تخلیق کار چونکہ اس صنف کے مزاج کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں لہٰذا وہ عمدہ ماہیے تخلیق کر رہے ہیں۔ اس نوع کے دعووں میں جزوی سچائی تو بے شک موجود ہے لیکن اس کا اطلاق ہر کسی پر کرنا درست نہیں ہے۔ حیدر قریشی نے معروضی حقائق کے تناظر میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے:

''جہاں تک ماہیے کے مزاج کا مسئلہ ہے اس سلسلے میں کوئی حتمی بات
کرنا اس لیے مشکل ہے کہ یہ زیادہ تر اپنے اپنے ذوق پر منحصر ہے۔

خود پنجابی میں ایسے ماہیے موجود ہیں جنہیں مزاج کی کس خاص حد
میں لانا مشکل ہے، مثلاً:

باگے وچ دریاں نیں
اللہ میاں پاس کرے
اَساں فیساں بھریاں نیں۔'' (۴۱)

حیدر قریشی اپنے موقف کی وضاحت میں مزید لکھتے ہیں:

''حمد، نعت، منقبت والے ماہیے اور زندگی کے تلخ مسائل
والے پنجابی ماہیے بھی اس مزاج سے خاصے مختلف ہیں
جو پنجابی ماہیے کی عمومی پہچان ہے۔'' (۴۲)

حیدر قریشی نے کس کی دل آزاری کیے بغیر اور کسی شاعر کا نام لیے بغیر یہ اُصولی بات کہہ دی ہے کہ بہت سے پنجابی شعرا پنجاب کا ثقافتی ورثہ ذہین میں تازہ رکھنے کے باوجود ماہیے کے عمومی مزاج کو یکسر نظر انداز کر کے ماہیے لکھتے رہے ہیں اور دوسری جانب یہ صورت حال سامنے آتی ہے:

''غیر پنجابی ہونے کے باوجود بعض ماہیے کہنے والے بھی
ایسے ماہیے کہہ سکتے ہیں جو بڑی حد تک پنجابی مزاج کے
مطابق ہوں۔'' (۴۳)

اس تجزیے کے حوالے سے درج ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) اَمواج کے دھاروں تک
اپنی کہانی ہے
طوفاں سے کناروں تک (نذیر فتح پوری) (۴۴)

(ب) لفظوں پہ نہ جا بابا
عقل کی باتیں کیا
سن دل کی صدا بابا (رشید اعجاز، مہاراشٹر) (۴۵)

حیدر قریشی کا ذہن تحقیقی اور تجزیاتی ہے وہ اپنا ہر تحقیقی دعویٰ مستند دلیل کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ شگفتہ الطاف اُن کی خدمات سراہتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جہاں حیدر قریشی کی موزوں شعری طبیعت نے بہت
سے خوبصورت ماہیے تخلیق کیے وہاں فکری اعتبار سے

ماہیے کی ہیئت، مزاج اور عروضی پیمانے پر نقد و نظر کا کام
بھی کیا ہے۔ (۴۶)

حیدر قریشی کے تحقیقی کام کی نوعیت اجتہادی ہے، اُن کی مسلسل مساعیٔ جمیلہ کی وجہ سے ماہیے کو اس کا اپنا مقام مل گیا ہے۔ شاعری کی تمدنی تاریخ میں ماہیے کا خاص مقام بنتا ہے لیکن منتشر مفروضات اور قیاس آرائیوں کی وجہ سے یہ خواب پریشان ہو گیا تھا۔ یہ بات بذات خود حیرت انگیز ہے کہ صدیوں سے رائج صنف کے خدوخال واضح نہیں تھے اور جب اسے واضح کرنے کے لیے درست اقدامات کیے گئے تو یار لوگوں نے ہر ممکن طریقے سے راستے میں روڑے اٹکانا شروع کر دیے۔ حیدر قریشی نے تمام مشکلات کا دانش مندانہ مقابلہ کیا اور خلوص نیت کے ساتھ ماہیے کی وضاحت وصراحت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کام میں ریاضت زیادہ تھی اور صلہ وستائش کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔

اب وہ دن آ چکا ہے کہ اُردو ادب میں ایک موہنی صنف اپنا مستقل وجود قائم کر چکی ہے۔ دورِ جدید میں ماہیا کی مقبولیت کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو دنیا کے ادبی رسائل وجرائد میں اس کی شمولیت عام سی بات بن چکی ہے اور شعرا کے مجموعے بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ حیدر قریشی ماہیے کو ترقی اور نشوونما کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

''اُردو ماہیے کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے
ماہیے کے دامن کو وسیع کرنے کے عمل میں رکاوٹ ڈالے
بغیر ماہیے کے مزاج کو برقرار رکھنے کی مثبت تلقین ساتھ
ساتھ جاری رہنی چاہیے۔'' (۴۷)

حیدر قریشی کی اسی رجائیت نے ماہیے کی بنیادوں کو مضبوط بنایا ہے اگر وہ ابتدائی مشکلات سے گھبرا کر اس موضوع سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے تو شاید ماہیے کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکتا جو آج اُردو دنیا میں اسے مل چکا ہے۔ فردِ واحد کی کاوشوں نے تحریک کی صورت ڈھل کر ماہیے کی بجھتی شمع کو از سر نو زندگی عطا کر دی ہے۔

حیدر قریشی ماہیے کے روشن مستقبل سے ہمیشہ پُر اُمید رہے ہیں اُن کی مخلصانہ کوششوں کا فیضان ہے کہ آج ماہیے کو درست وزن اور اصل مزاج کی پابندی کے ساتھ لکھا جاتا ہے، اور اس صنف سے وابستہ تخلیق کاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''وزن اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہیے کے
موضوعات میں تدریج وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ الفاظ

کے برتاؤ صورتِ حال خوش کن ہے۔'' (۴۸)

جیسا کہ پہلے بھی بات ہو چکی ہے کہ ماہیے پر دوسری اصناف، مثلاً غزل اور گیت کے اثرات بھی واضح ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماہیے کے مجموعی مزاج یا خدو خال ان اثرات سے کس حد تک متاثر ہوں گئے؟ حیدر قریشی نے اس اہم سوال کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔ ان کے مطابق:

''نظم، غزل اور گیت کے اثرات اردو ماہیے کے تشخص کو
ختم نہیں کریں گے بلکہ اسے تازہ خون فراہم کریں گے۔
ان اثرات سے ماہیے کا مزاج مزید بہتر ہوگا۔ (۴۹)

گویا مذکورہ بالا تینوں اصناف ماہیے کے فطری میلانات میں مثبت کردار ادا کریں گے۔ ماہیے کی اصل دل کشی یہی ہے کہ وہ اپنی اصل ہیئت، اُسلوب اور مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے دیگر اصناف سے استفادے کا عمل جاری رکھے۔

حیدر قریشی کا یہ مشورہ بھی صائب ہے:

''ماہیے کے مزاج کے نام پر اس کے موضوعات کو محدود کر
کے اسے تکرار کا شکار بنانے سے بہتر ہے کہ اس کے
موضوعات میں وسعت پیدا کی جائے۔ موضوعات میں
وسعت کے باعث اگر بعض نئے تجربے کچے رہ جائیں یا
نامانوس لگیں تو اُنہیں اس لیے برداشت کر لینا چاہیے کہ
آگے چل کر ان ادھورے یا کچے تجربات سے نئے اور
کامیاب تجربات کی راہیں نکلیں گی۔'' (۵۰)

انھی معتدل رویوں کے باعث ماہیے کی تحریک پروان چڑھی اور بالآخر کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ اگر ابتدا ہی میں ماہیے کے ارد گرد تقدس کی جھوٹی چادر تان لی جاتی تو ابھی تک یہ صنف محدود سطح پر ہی فعال رہتی اور ممکن ہے اُردو زبان میں آتے ہی اپنی موت آپ مرجاتی۔ حیدر قریشی اس صنف کے بانی تو نہیں ہیں لیکن جب کبھی اور جہاں کہیں ماہیے کا ذکر چلتا ہے تو ان کی تحقیقات کا حوالہ لازماً آتا ہے، یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ لوگوں نے اُن کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا ہے۔

(۶) اردو میں ماہیے کا اصل بانی

ڈاکٹر خلیق انجم نے ادبی محقق کے تین اہم فرائض بیان کیے ہیں:

''ا۔ نئے حقائق کی تلاش

۲۔ حقائق کی تصدیق یا تردید
۳۔ حقائق کی تشریح و تعبیر۔'' (۵۱)

ایک سنجیدہ اور ذمہ دار محقق ان فرائض کی ادائیگی کے بعد پوشیدہ ادبی خزانوں کی بازیافت کرتا ہے۔ تحقیق کا اصل کام ہی سچائی کی تلاش ہے۔ جو تحقیق داخلی اور خارجی حوالوں سے خود مکتفی ہو وہی قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے اور علم و ادب کے نئے نئے پہلو سامنے لاتی ہے۔ معروضیت اور حقیقت پسندی کی بدولت تحقیقی اُمور کی قدر بڑھتی ہے۔ یہ تمہیدی سطور لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ حیدر قریشی کے خالص تحقیقی کاموں کو بھی اُنھی اُصول وضوابط کی روشنی میں پرکھا جائے تاکہ ان کی تحقیقی کاوشوں کی اصل قدر و قیمت سامنے آسکے۔

اُردو ادب میں یہ مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُردو زبان و ادب میں ماہیے کا آغاز سب سے پہلے کس نے کیا تھا؟ اس ضمن میں تین نام بار بار سامنے آرہے تھے، مثلاً قمر جلال آبادی، چراغ حسن حسرت اور ساحر لدھیانوی۔ حیدر قریشی کے ابتدائی مضامین دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی تحقیقات میں وہ خود بھی کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ پائے تھے، تاہم اُنھوں نے اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا اور تمام ضروری شواہد جمع کرنے کے بعد ایک بھرپور مضمون لکھا جس کا عنوان ہے ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' یہ مضمون اُن کی کتاب ''اردو ماہیے کی تحریک'' میں دیکھا جا سکتا ہے، بعد ازاں اس مضمون کا یہی عنوان ان کی تیسری کتاب کا سرِ عنوان بھی بن گیا تھا۔ اُن کی اب تک پیش کی جانے والی تحقیق کے مطابق ہمت رائے شرما اُردو کے پہلے ماہیا نگار ہیں ذیل میں اُن کے تحقیقی نتائج کو متعارف کرایا جا رہا ہے۔

حیدر قریشی ماہیے کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے جب اپنے تحقیقی نتائج مرتب کر رہے تھے تو انھوں نے فلم ''پھاگن'' میں چند ماہیے سنے جو پنجابی وزن کے عین مطابق تھے۔ اس فلم کے پروڈیوسر اُردو ادب کے معروف ادیب راجندر سنگھ بیدی تھے اور ماہیوں کی صدا بندی اس عہد کے مقبول گلوکاروں محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے کی تھی۔ گائے جانے والے تمام ماہیے قمر جلال آبادی کے لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف دو ماہیے بطور مثال درج کیے جاتے ہیں:

(الف) تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ (۵۲)

(ب) فرصت ہو تو آجانا
اپنے ہی ہاتھوں سے
مری دنیا مٹا جانا (۵۳)

ان جیسے اور ماہیوں کی بنیاد پر حیدر قریشی نے یہ نتیجہ اخذ کیا :

''اب تک کی معلومات کے مطابق یہ ماہیے اُردو کے
سب سے پہلے ماہیے ہیں جو پنجابی ماہیے کے وزن پر
پورے اُترتے ہیں اس لحاظ سے قمر جلال آبادی اُردو کے
سب سے پہلے ماہیا نگار قرار پاتے ہیں۔''(۵۴)

کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جب تازہ تاریخی شواہد اور حقائق منظرِ عام پر آنا شروع ہوئے تو اُن کے محولہ بالا موقف میں بھی واضح تبدیلی آ گئی۔حیدر قریشی نے اپنی کتاب ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' کے پیش لفظ میں کھلے دل سے اپنی گزشتہ تحقیقی غلطی کا اعتراف کیا اور نیا موقف ان الفاظ میں پیش کیا:

''اُردو ماہیے کی تحریک ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے،کل تک
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ صرف فلم ''پھاگن'' اور نیادور میں قمر جلال آبادی
اور ساحر لدھیانوی نے اُردو ماہیے لکھے تھے۔لیکن اب تک یہ حقیقت
سامنے آ چکی ہے کہ اُن سے پہلے ہمت رائے شرما اور قتیل شفائی
نے فلم ''خاموشی'' (انڈیا) اور فلم ''حسرت'' (پاکستان) میں
اُردو ماہیے پیش کیے ہیں۔''(۵۵)

اپنی تحقیقی غلطی مان لینا معمولی بات نہیں ہے۔لیکن وہ جانتے ہیں:

''تحقیقی معاملات میں حقائق مقدس ہوتے ہیں۔''(۵۶)

اس تحقیقی رائے کو قائم کرنے میں اُنھیں جن نشیب وفراز سے گزرنا پڑا اُس کا مکمل بیان ''اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے ''کوہسار جرنل'' (انڈیا) کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۷ میں ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں حمید نسیم کی خود نوشت سوانح ''ناممکن کی جستجو'' کو بنیاد بنا کر حیدر قریشی کے اس دعوے کو رد کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہمت رائے شرما کو اُردو ماہیا نگاری میں اولیت کا درجہ حاصل ہے،اس کے برعکس سرور صاحب نے یہ بیان دیا کہ جنوری ۱۹۳۶ء میں چراغ حسن حسرت نے مشاعرے میں جو ماہیے سنائے تھے اس کی وجہ سے اولیت کا سہرا حسرت کے سر جاتا ہے۔اس بحث کے دوران حیدر قریشی جرمنی میں تھے لیکن انھوں نے جب سرور صاحب کے بیان کو جانچنے کے لئے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کی تو معاملہ کچھ اور نکلا۔اصل صورتِ حال حیدر قریشی کی زبانی سنیئے :

''مضمون کی اشاعت کے بعد اب مجھے ''ناممکن کی جستجو''

کے متعلقہ صفحات ملے ہیں تو اندازہ ہوا کہ آل احمد سرور
صاحب کو سہو ہوا تھا،کیونکہ حمید نسیم نے اس میں حسرت
کے ثلاثی قسم کے گیت کو ماہیا لکھا ہے۔''(۵۷)

حمید نسیم کا بیان یادداشت پر مبنی تھا اور وہ جس مشاعرے کا ذکر کر رہے تھے اس کا کوئی اور دستاویزی ثبوت تا حال دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔دوسرا اہم نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ چراغ حسن حسرت کے ثلاثی کو غلطی سے ماہیا فرض کر لیا گیا ہے،البتہ حمید نسیم کے بیان سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے:

''حسرت کے ثلاثی اور ہمت رائے شرما کے ماہیوں کی تخلیق کا وقت
تقریباً ایک سا ہی بنتا ہے۔شرما جی کے ماہیے ۱۹۳۶ء میں چھپے تھے۔''(۵۸)

حیدر قریشی نے اپنے نئے موقف کی وضاحت کے لیے مضامین و مقالات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اُس میں پاک و ہند کے علاوہ جرمنی کے رسائل میں بھی اُن کی تحریریں تواتر کے ساتھ چھپتی رہی ہیں۔اہم رسائل و جرائد کے نام یہ ہیں ''اوراق'' (لاہور)، ''انشا'' (کلکتہ)، ''جدید ادب'' (جرمنی) ''شعر و سخن'' (مانسہرہ، پاکستان) ''گل کدہ'' (سہسوان) ''روزنامہ منصف'' (حیدرآباد) اور ''ویکلی صدائے پوٹھوہار'' (راولپنڈی) وغیرہ۔

حیدر قریشی کی کتاب ''اُردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما'' میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں چھپتے رہے اور پھر کتابی صورت میں جمع کر دیے گئے ہیں۔اس کتاب میں دستاویزی تحقیق کی مدد سے اُنھوں نے اپنا نقطۂ نظر اتنا مضبوط بنا لیا ہے کہ اب سرِ دست اس پر اضافہ دشوار ہے۔ممکن ہے مستقبل میں آنے والی کوئی نئی تحقیق اولیت کا یہ تاج کسی اور کے سر سجا دے۔اس کتاب کے پہلے مضمون ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' میں اُنھوں نے شرما صاحب کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا ہے:

''ہمت رائے شرما جی ممتاز فلم میکر کیدار شرما کے چھوٹے
بھائی ہیں۔جنھوں نے اپنے زمانے کے کتنے ہی مقبول
فنکاروں اور ممتاز ٹیک نی شنز (Technicions) کو
متعارف کرایا۔ ہمت رائے شرما جی بھی فلمی دنیا سے
وابستہ رہے۔نغمہ نگار،کہانی کار،آرٹ ڈائریکٹر اور ڈائر
یکٹر تک اُن کا اپنا طویل فلمی کیریئر ہے۔'' (۵۹)

شرما جی نے ۱۹۳۶ء میں ایک فلم ڈائریکٹ کی تھی جس کا نام ''خاموشی'' اُنھوں نے نہ صرف ماہیے خود تخلیق کیے بلکہ فلم میں خود گانے کا بھی ایک منفرد ریکارڈ قائم کیا۔انڈیا کے معروف نقاد ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کا ماہیا:

ایک بار تو مل ساجن

آ کر دیکھ ذرا

ٹوٹا ہوا دل ساجن (فلم: خاموشی)

جب سنا تو شرما کی ماہیا نگاری پر مضمون لکھا جو سہ ماہی ''کوہسار جرنل'' بھاگل پور، شمارہ اگست ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا اور اس میں شرما جی کو ماہیے کے اولین بنیاد گزاروں میں شامل کر کے تحقیقی مسئلے کو نیا زاویہ عطا کیا، لیکن یہ تحقیق محض مفروضات پر مبنی تھی اور وہ اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل یا دستاویزی ثبوت فراہم نہیں کر سکے تھے۔ یہ فریضہ بعد میں حیدر قریشی نے ادا کیا اور ایک تحقیقی مفروضے کو مضبوط تحقیقی دلائل پر استوار کر کے دکھا دیا۔

ہمت رائے شرما کی اولیت صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی تھی جب یہ ثابت ہو جاتا کہ انھوں نے اپنی فلم ''خاموشی'' میں جو ماہیے پیش کیے ان کا عرصۂ تحریر ۱۹۳۶ء کا زمانہ بنتا ہے۔ اس ضمن میں حیدر قریشی دو اہم حوالہ جات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا ذکر ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' میں موجود ہے۔ پہلا حوالہ رئیس الدین فریدی، مدیر ''روزنامہ ہند'' (کلکتہ) کا ہے جن کا مضمون ماہنامہ ''انشا'' (کلکتہ) شمارہ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۱ء میں طبع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اُنھوں نے جو کلیدی جملہ لکھا اس کی وجہ سے تحقیقی بحث کو راست سمت نصیب ہوئی۔ جملہ ملاحظہ ہو:

''ہمت رائے شرما ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے مردم خیز ضلع
سیالکوٹ کے مشہور قصبے نارووال میں پیدا ہوئے۔ صرف
۱۷ سال کی عمر میں ''خاموشی'' نامی فلم کے گیت لکھ
ڈالے۔'' (۶۰)

۱۹۸۴ء میں ہمت رائے شرما کا شعری مجموعہ ''شہابِ ثاقب'' سامنے آتا ہے اس کے فلیپ پر بقول حیدر قریشی یہ رائے درج تھی:

''ہمت رائے شرما ایک باکمال فنکار ہیں۔۔۔۱۷ سال
کی عمر میں فلم ''خاموشی'' کے گیت لکھے۔'' (۶۱)

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں حیدر قریشی نے یہ منطقی نتیجہ اخذ کیا:

''ان دونوں شواہد کی روشنی میں جو خود ایک دوسرے کی
تصدیق کرتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں ۱۷ سال جمع کیے جائیں
تو فلم ''خاموشی'' کے ماہیے لکھنے کا سال ۱۹۳۶ء ثابت
ہے۔'' (۶۲)

حیدر قریشی نے مفروضات کی جانچ پڑتال کی خاطر تحقیقی عمل کے تمام تقاضے پورے کیے ہیں۔ ان

کے پیش کردہ شواہد، دلائل اور نتائج سے صرف اسی صورت اختلاف ممکن ہے جب مستقبل میں کوئی ایسا شاعر دریافت ہو جائے جس نے ۱۹۳۶ء سے قبل اُردو زبان میں ماہیے کہے ہوں۔ ورنہ اُصولی اور تحقیقی حوالوں کی روشنی میں موجودہ نتائج ہر اعتبار سے کافی وشافی ہیں۔

محققین کا عمومی رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُنھیں مطلوبہ شواہد مل جائیں تو وہ پھر مزید ثبوت حاصل کرنے کی سعی نہیں کرتے۔ حیدر قریشی نے اپنی تحقیق مستحکم کرنے کے لیے فلم ''خاموشی'' کا وہ کتابچہ بھی ڈھونڈ نکالا جس میں فلم ریلیز ہونے کا زمانہ درج تھا۔ یہ کتابچہ شرما جی نے بڑی محنت سے تلاش کر کے اس کی فوٹو کاپی حیدر قریشی کو ارسال کی تھی، اس پر اُردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں فلم کی پروڈکشن کے حوالے سے تمام ضروری معلومات لکھی ہوئی تھی اس میں انگریزی کی درج ذیل عبارت خاص اہمیت رکھتی ہے:

Producer under the banner of talwar productions (under new managemant) May , 1936(63)

حیدر قریشی کی تحقیقی جستجو نئے شواہد کی جمع آوری میں بڑی معاون ثابت ہوئی، مسلسل غور وفکر اور ماہیے سے بے پناہ محبت کی بدولت اس اہم صنف پر ان کی آراء کو اب ساری اُردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسماعیل گوہر لکھتے ہیں:

''حیدر قریشی نے تخلیقی وتنقیدی دونوں لحاظ سے ماہیے کی تحریک کو آگے بڑھانے
میں اہم کردار ادا کیا ہے، وہ اپنے مؤقف کو ہر فورم پر مضبوط ثابت کرنے کی
انفرادی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنے مؤقف کے حامی ماہیا نگاروں اور نقادوں
کو منظّم رکھنے میں بھی بڑے سرگرم رہے ہیں۔'' (۶۴)

یہ بیان صداقت پر مبنی ہے۔ حیدر قریشی نے ماہیے کی تحریک میں جو نمایاں کردار ادا کیا اس کی وجہ سے جہاں اُن کے نئے دوستوں میں اضافہ ہوا وہاں نئی دشمنی کے محاذ بھی کھل گئے لیکن حیدر قریشی نے کسی مقام پر ذاتی عناد کا رویہ نہیں دیکھایا۔ اگر کسی نے ذاتیات پر اُتر کر کوئی بات کہی بھی تو اس کا جواب ہر ممکنہ شائستگی سے دیا ہے۔ ماہیے کی تحریک میں حیدر قریشی چوں کہ نمایاں حیثیت میں سامنے آئے تھے لہٰذا ہر کسی کا روئے سخن اُنھی کی جانب تھا۔ پروفیسر نذر خلیق اسی حوالے سے بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اردو ماہیے کے بارے میں اب تک جتنے مباحث ہو
چکے ہیں، وہ مباحث اختلاف کو اُبھارنے والے ہوں یا
اتفاق رکھنے والے ہوں حیدر قریشی ان تمام مباحث میں
مرکزی کردار رہے ہیں (۶۵)

حیدر قریشی نے اپنی مرکزی حیثیت کو محنت، اُصول پسندی اور اعلیٰ تحقیقی روایات کی بدولت مستحکم بنالیا تھا۔

(۷) ماہیے کے فروغ میں خواتین کا حصہ

پروفیسر عبدالستار دلوی، محقق کے اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محقق کے کام کی ابتدا تجسس سے ہوتی ہے۔ پیچیدہ
حالات اور انسانی زندگی میں رُونما ہونے والے مسائل
کے بارے میں وہ ایک پُر تجسس اشتباہ کا احساس کرتا
ہے۔ اس سے ایک ذہنی کش مکش پیدا ہوتی ہے، اسی مقام
پر حالات کے متعلق ایک متعینہ نتیجے تک پہنچنے کی زبر
دست ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی چیز اس کے
لیے باعثِ تحریک بنتی ہے۔''(۶۶)

حیدر قریشی کی تحقیقات میں یہ مثبت عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ماہیے کی تحریک میں جہاں ان کا ذوقِ تکمیل خضرِ راہ کا فریضہ انجام دے رہا تھا وہاں اُن کی قوتِ استدلال، خود اعتمادی اور توضیحِ فکر، حقائق کی فراہمی میں ہمدرد معاون ثابت ہوئے۔ یہ ان کی ذہنی فعالیت اور وسیع النظری کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اُنھوں نے جہاں مرد ماہیا نگاروں کی تخلیقی کاوشوں کو متعارف کرایا، وہاں خواتین کی ادبی خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ صنفِ ماہیا میں صنفِ نازک کے اہم قدیمی کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''پنجابی ثقافت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ماہیے میں
عورت کی آواز مرد کے مقابلے میں زیادہ اُبھری ہے اس
کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے
کہ شادی بیاہ اور دوسری گھریلو تقریبات میں رنگ
جمانے کے لیے خواتین ماہیے گاتی ہیں اسی لیے پنجابی
ماہیے میں عورت کی آواز زیادہ طاقتور محسوس ہوتی ہے۔''
(۶۷)

آپ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں:

'' اردو ماہیے کے فروغ میں ماہیا نگار خواتین کا قابلِ قدر حصہ ہے۔''(۶۸)

خواتین ماہیا نگاروں کے حوالے سے حیدر قریشی کی تحقیقات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی اُنھوں نے ایک طرف تو تنقید نگار خواتین کو متعارف کرایا اور دوسری جانب تخلیق کار خواتین کی کاوشوں کو بڑے ادبی حلقے تک پہنچایا۔ جن خواتین کے تنقیدی کام کو حیدر قریشی نے اہمیت دی اُن کے نام مع مضامین کچھ یوں ہیں۔(۱)

شاہدہ ناز ''ماہیے کی بحث کا منظر نامہ'' (مضمون) (۲) غزالہ طلعت ''ماہیے کی ہیئت اور وزن'' (مضمون) (۳) ثریا شہاب، گلبن کا ماہیا نمبر (احمد آباد، انڈیا)، (۴) ڈاکٹر جمیلہ ہاشمی ''عالمی تناظر میں اردو ماہیے پر ایک طاہرانہ نظر'' (۵) نصرت یاسمین ''ماہیا اُردو ماہیا اور ضمیر اظہر''، (۶) شگفتہ الطاف ''حیدر قریشی کی ماہیا نگاری'' (۷) صبا خورشید ''اُردو میں ماہیا نگاری'' مذکورہ تمام لکھاریوں کی تحریریں کتابی صورت میں محفوظ ہونے کے علاوہ پاک وہند کے اہم ادبی رسائل مثلاً ''اوراق''، ''صریر''، ''گلبن''، ''بھنگڑا''، ''قرطاس''، ''نیرنگ خیال'' اور سہ ماہی ''علم وفن'' میں اشاعت پذیر ہوتی رہی ہیں۔

تخلیق کار خواتین کے زمرے میں دو طرح کی خواتین سامنے آتی ہیں یعنی کم لکھنے والی خواتین اور مسلسل لکھنے والی خواتین۔ حیدر قریشی کی تحقیقی روش اور وسیع القلمی کی بدولت ان دونوں کا ذکر ملتا ہے: یہ مثال ملاحظہ ہو:

'' میں ایسی چند شاعرات کے نام ضرور درج کروں گا
جنھوں نے تھوڑے ماہیے کہے لیکن جتنے کہے اس سے
ماہیے میں خوبصورت اضافہ ہی کیا۔''(۶۹)

اس تقسیم کے تحت پاک وہند کی درج ذیل خواتین کا ذکر اہم ہے۔

''پربھا ماتھر، صابرہ خاتون حنا، کامنی دیوی، انیتا مروندی، رقیہ منیر، زبیدہ صبا
، عفرا قریشی، نزہت سمن، انیلا سحر، شگفتہ یاسمین غزل، مصباح مرزا، یاسمین مبارک،
رخسانہ نور، شاہد لطیف، عظمیٰ ناز، فرحت نسیم ہاشمی، کوثر صدیقی اور نینا جوگن۔''(۷۰)

اگر حیدر قریشی ان خواتین کا ذکر نہ بھی کرتے تب بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا لیکن ان کی تحقیقی دیانت داری اس بات کو گوارا نہ کر سکی کہ خواتین کے اس چھوٹے گروہ کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔

ایسی خواتین جو مسلسل ماہیے کے ساتھ منسلک رہیں، اُن کی تعداد بھی خاصی ہے لہٰذا صرف ضروری نام درج کرنے پر اکتفا جائے گا۔ اس حوالے سے حیدر قریشی کی پیش کردہ تحقیقات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ابتدائی ماہیا نگار خواتین میں غزالہ طلعت، فرحت نواز اور منزہ اختر شاد، اس کے بعد شاہدہ ناز، صدف جعفری اور بسمہ طاہر اُبھرتی ہوئی ماہیا نگار نظر آتی ہیں، ثریا شہاب، سلطانہ مہر، اور عذرا اصغر کی تخلیقی کاوشوں نے رنگ جمانا شروع کر دیا۔ یاسمین سحر اور پر ذوق صنم نے اردو ماہیوں میں پنجابی ثقافت کو آمیز کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ شبہ طراز، کوثر بلوچ، ناز یہ رحمان، اختر بانو ناز، اور مطلوب بی بی نے ماہیے کی تحریک آگے بڑھانے میں خاصی جد وجہد کی تھی۔ معروف افسانہ نگار اور ناول نگار بشریٰ رحمٰن نے بیسیوں اُردو ماہیے لکھے۔ برطانیہ سے رضیہ اسماعیل، سری نگر سے نسرین نقاش، گوجرانوالہ ریحانہ سرور اور اسلام آباد سے ثروت محی الدین نے تواتر کے ساتھ ماہیے تخلیق کیے اور اپنے مجموعے بھی مرتب کیے۔ جن خواتین نے ماہیے لکھنے کا سلسلہ کم یا ترک کر دیا تھا اس کی وجہ ان کی گھریلو

مصروفیات ہوسکتی ہیں، بقول غزالہ طلعت:

شادی کے جھمیلے میں
شعروادب چُھوٹا
بس ایک ہی ریلے میں (۷۱)

خواتین ماہیا نگاروں نے جن موضوعات سے تعرض کیا اس پر حیدر قریشی نے جامعیت سے بات کی ہے ان کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ خواتین نے اپنی پسند کے مطابق کچھ اس قسم کے موضوعات کو زیادہ برتا ہے: کراچی کے حالات، بابری مسجد کی شہادت، فرقہ پرستی، ملکی بدامنی، مسئلہ کشمیر، ترقی پسندی، ایٹمی جنگ کے خدشات، شہری زندگی، عشق ومحبت، شادی بیاہ کے مسائل اور سماج کی بدلتی اقدار وغیرہ۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ ہم سب کو دُکھایا ہے
توڑ کے مسجد کو
دل مندر ڈھایا ہے (اختر بانو ناز) (۷۲)

☆ دھرتی ہے چناروں کی
ہولی نہیں کھیلو
اس میں انگاروں کی (شاہدہ ناز) (۷۳)

☆ آنکھوں میں ستارے تھے
تم نے کبھی سمجھا
جو من کے اشارے تھے (نگار سجاد ظہیر) (۷۴)

☆ بستی ہے کسانوں کی
پھولی ہوئی سرسوں
اور فصل ہے دھانوں کی (عذرا اصغر) (۷۵)

☆ پازیب چھنکتی تھی
اس کی ہنسی تھی یا
کوئی دھنک چمکتی تھی (فرحت نواز) (۷۶)

حیدر قریشی نے خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں موضوعاتی تنوع دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''خواتین ماہیا نگاروں کے ہاں عصری حیثیت کتنی توانا
ہے تاہم ماہیے کا وہ عمومی مزاج جو غنایت سے لبریز ہے
خواتین ماہیا نگار اُس سے بھی بے خبر یا بے تعلق نہیں
ہیں۔ جہاں سیاسی وسماجی شعور رکھنے والے ماہیوں میں
ماہیا نگار خواتین کی ترقی پسند سوچ اپنا اثر دکھاتی ہے وہیں
محبت کے مضمون سے جڑے ہوئے ماہیوں میں پنجابی
لوک رس کا جادو متاثر کرتا''(۷۷)

اگر غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو خواتین کی تخلیقی اور تنقیدی کاوشوں کی بدولت ماہیے کی صنف راست سمت میں نشوونما پاتی رہی ہے۔ ماہیے کی روایت میں نئے اور اہم موضوعات کا داخلہ بھی خواتین کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ حیدر قریشی نے اپنی تصانیف میں خواتین کی گراں قدر خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے یہ ایک کامیاب محقق کی نشانی بھی کہ وہ ہر قسم کے مواد کو سامنے رکھ کر نتائج مرتب کرے، فکر ونظر کی یہی صفت معتبر تحقیق کا راستہ ہموار کرتی ہے۔

(۸) ماہیا اور ادبی رسائل

حیدر قریشی نے صنفِ ماہیا کی ترویج، ترقی، نشوونما اور مقبولیت پر نظر رکھنے کے لے معاصر ادبی رسائل کو اپنی تحقیقات کا لازمی حصہ بنایا ہے۔ ماہیے پر ہونے والا تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کام کا بڑا ذریعہ ادبی رسائل وجرائد ہی تھے، اگرچہ جامعات میں اس موضوع پر کام ہورہا تھا لیکن اس کی رفتار خاصی سُست تھی۔ حیدر قریشی نے اپنے مکاتیب اور مضامین ومقالات کی مدد سے ادبی مباحث کو آگے بڑھایا۔ اگر ماہیے کی تحریک کے اولین دور پر نظر کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۹۰ء میں شروع ہوگیا تھا اور اپنے عہد کے معروف رسائل مثلاً سہ ماہی ''ابلاغ''، ماہنامہ ''تجدید نو''، سہ ماہی ''اوراق''، ماہنامہ ''صریر''، ماہنامہ شاہین (گوپن ہیگن) ''تخلیق''، ''ارتکاز''، ''الفاظ''، ''کوہسار''، ''تیر نیم کش'' (مرادآباد)، ''جدید اسلوب''، ''کتاب نما'' (دہلی)، ''عوامی منشور''، ''اردو ادب''، ''اقدار'' (کراچی)، دوماہی ''گلبن'' (احمد آباد) ''ادب لطیف''، ''ایوان اردو'' (دہلی)، ماہنامہ ''سخنور'' (کراچی) اور سہ ماہی ''اسباق'' (پونہ) وغیرہ میں ادبی معرکہ فکر ونظر کے نئے چراغ روشن کررہا تھا۔ حیدر قریشی کی تصنیف ''اُردو ماہیے کی تحریک'' میں کئی مضامین ایسے ہیں جن میں معاصر ادبی رسائل کی خدمات کا ذکر کیا ہے، اور ماہیے کے فروغ میں ان کے مثبت کردار کو سراہا گیا ہے، اس نوع کی تمام تفصیلات کے لیے درج ذیل مضامین کا مطالعہ سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ تمام مضامین ''اُردو ماہیے کی تحریک'' طبع ۱۹۹۹ء میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۔خط بنام ایڈیٹر تجدید نو، لاہور

۲۔اُردو ماہیا۔۔۔کل اور آج

۳۔خط بنام، ایڈیٹر، ماہنامہ، صریر، کراچی

۴۔اردو ماہیا ۱۹۹۷ء میں

۵۔خط بنام، ایڈیٹر ''اوراق''، لاہور

۶۔ایڈیٹر، ایوان اردو، دہلی کے نام

۷۔اردو ماہیا ۱۹۹۸ء میں

ان کے علاوہ ماہیے کے مباحث (مشمولہ کلیات) میں بھی چار ایسے کلیدی مضامین موجود ہیں جن میں ادبی رسائل کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ان مضامین کے نام یہ ہیں:

۱۔اُردو ماہیے کے دس سال

۲۔''اوراق'' اور ماہیا

۳۔اُردو ماہیا ۱۹۹۹ء میں

۴۔''نیرنگ خیال'' کا ماہیا نمبر

ان مضامین میں تحقیق اور بحث مباحثے کا رنگ ایک ساتھ نظر آتا ہے۔ایک مثال ملاحظہ ہو:

''سہ ماہی ''اوراق'' کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ء میں میرے خط
میں ممتاز عارف کے موقف کی بھرپور تائید کی گئی اور ساتھ
ہی جملہ 'ماہیا نگاروں' کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ وہ مل کر
طے کرلیں کہ اُردو ماہیے کو اصل پنجابی ماہیے کی طرح رکھنا
ہے یا اس کا حشر بھی ہائیکو جیسا کرانا ہے۔'' (۷۸)

حیدر قریشی کے ان مضامین کا نمایاں پہلو اختصار، وضاحت اور قطعیت ہے، یہ مثال دیکھیے:

ماہیا نگاری کے مختلف رویوں میں پنجابی مزاج اور پنجابی
لفظیات سے مزین اُردو ماہیے کہنے کا رویہ مقبول رہا تاہم
پنجابی لفظیات سے ہٹ کر بھی بے حد عمدہ ماہیے کہے گئے
پنجاب سے جغرافیائی لحاظ سے دور دراز کے علاقوں میں
ایک طرف نامانوس قسم کے ماہیے سامنے آئے تو دوسری

طرف بعض ماہیے حیرت انگیز طور پر ماہیے کی مانوس فضا
لیے ہوئے تھے۔'' (۷۹)

کسی ایک موضوع کے متعلقات کو معاصر اور ادبی رسائل میں تلاش کرنا اور مطلوبہ مواد کو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا آسان بات نہیں لیکن حیدر قریشی نہایت صبر وضبط اور تمام تحقیقی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔رشید حسن خان نے معیاری تحقیق کے جو اصول وضع کیے حیدر قریشی کا تحقیقی کام اس کا عملی ثبوت ہے۔انھوں نے کہا تھا:

'' تحقیق بے حد صبر آزما کام ہے عجلت اور خفیف الحرکاتی اس کو
راس نہیں آتی اور بل ہوسی سے اسے بیر ہے۔'' (۸۰)

تحقیق کے حقیقی مقاصد صرف اسی صورت میں سامنے آسکتے ہیں جب جمع شدہ مواد سے کوئی واضح اور منطقی نتیجہ بھی اخذ کیا جائے کیونکہ:

''جب تک محقق خام مواد سے کوئی نقطہ نظر نہ بنا سکے گا۔
اس وقت تک خام مواد بے کار رہے گا۔''(۸۱)

حیدر قریشی نے ادبی رسائل کے مندرجات کو بطور تحقیقی آلات استعمال کیا ہے اور دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کے علاوہ اپنا زاویۂ نظر بھی سامنے لایا ہے، ادبی رسائل نے ان کے مؤقف کو عام کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۹) حیدر قریشی کے مصاحبے اور تحقیقی زاویے

حیدر قریشی کی ادبی مصروفیات کا بڑا حصہ ماہیے کی تحقیق و تنقید پر صرف ہوا ہے اور اس ضمن میں جہاں نجی خطوط، مضامین، مقالات اور کتابوں میں اظہار خیال کیا گیا وہاں مصاحبوں (Interviews) کے توسط سے بھی اپنے من پسند موضوع کے تانے بانے جوڑنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ان تمام مصاحبوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔حصہ اول میں وہ تمام مصاحبے شامل کیے جاسکتے ہیں جو براہِ راست حیدر قریشی سے لیے گئے تھے جبکہ حصہ دوم میں وہ مصاحبے آجاتے ہیں جو حیدر قریشی کے بارے میں ان کے قریبی احباب سے لیے گئے تھے۔اس کی مکمل تفصیل کچھ یوں ہے:

(الف) حصہ اول: (حیدر قریشی سے لیے گئے مصاحبے)

حیدر قریشی سے جن احباب نے انٹرویوز لیے ان میں جوگندر پال، ڈاکٹر صابر آفاقی، سلطانہ مہر، ثریا شہاب، محمد وسیم انجم، اختر رضا سلیمی، جواز جعفری، افتخار امام صدیقی اور نذر خلیق شامل ہیں۔

(ب) حصہ دوم: (حیدر قریشی کے بارے میں ادبی احباب کے مصاحبے)

اس میں ڈاکٹر سعادت سعید (انقرہ، ترکی) پروفیسر فرحت نواز (رحیم یار خان) احمد سہیل (امریکہ) خورشید

اقبال (انڈیا) رضیہ اسماعیل (برطانیہ) کاشف الہدیٰ (امریکہ) اور محمد آصف خواجہ (ڈنمارک) خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

حیدر قریشی کے قریبی دوست سعید شہاب نے ان تمام انٹرویوز کو کتابی صورت میں بعنوان ''حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز'' شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ہالینڈ، ۲۰۰۴ء میں شائع کر دی تھی۔ ان انٹرویوز میں سر راہے بہت سے ایسی باتیں آ گئی ہیں جو گذشتہ تحقیقات کی یا تو توثیق کرتی ہیں یا نئے انداز سے روشنی ڈالتی ہیں مثلاً، ڈاکٹر صابر آفاقی نے حیدر قریشی سے دورانِ گفتگو یہ سوال پوچھتے ہیں:

> ''اُردو ماہیے کے حوالے سے آپ اب سند کا مقام رکھتے ہیں۔ اُردو ماہیے کی بعض خصوصیات بتائیں گے۔''
>
> (۸۲)

حیدر قریشی نے اس کے جواب میں دو اہم اور بلیغ اشارے کیے ہیں:

> (الف) ایک اہم ترین خصوصیات ماہیے کی یہ ہے کہ یہ تخلیق کار کو خلا سے اُتار کر زمین پر لاتا ہے۔ ماہیے میں زندگی اور دھرتی سے گہری وابستگی ہے۔ پھر اس میں ژولیدہ ابہام گوئی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔''
>
> (۸۳)
>
> (ب) '' جب جدید شاعری کے نام پر انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لایعنیت سے جوڑ لیا تھا، ادب دھرتی سے کٹ کر خلا میں معلق ہو گیا تھا۔ ایسے حالات میں ماہیے نے نہ صرف اپنی دھرتی کی اہمیت کا احساس دلا یا ہے بلکہ بامعنی تخلیق کے لیے لفظ و معنی کے ہم رشتہ ہونے کی ضرورت کا احساس بھی دلا یا ہے۔''
>
> (۸۴)

حیدر قریشی ایک سچے اور کھرے محقق ہیں۔ انھوں نے جہاں معروضی حوالے سے ماہیے کی نمایاں خصوصیات کو اُجاگر کیا وہاں عہد حاضر کی لایعنی ادبی اقدار پر بھی چوٹ کی ہے۔ وہ کسی شئے کی بے جا مدح سرائی کے برعکس مثبت تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ وہ خود بھی ماہیے کے فروغ اور امکانات پر مسلسل سوچ

بچار کر رہے ہیں لہٰذا ان کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے۔ ماہیے کی شناخت قائم کرنے کے لیے اُنھوں نے میں طویل جد و جہد، لگن اور محنت کو مشعل راہ بنایا ہے۔

محمد وسیم انجم کے انٹرویوز میں حیدر قریشی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اُردو ماہیے کو میری وجہ سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی پہنچا ہے فائدہ تو یہی کہ ماہیا ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ نقصان یہ ہوا کہ مجھ سے کسی کو کوئی ناراضگی تھی کوئی برہمی تھی تو اس کا بدلہ لینے کے لیے ماہیے کو زد پر رکھ لیا گیا۔''(۸۵)

علمی اور ادبی مباحث میں اس نوع کے غیر اخلاقی رویے دل آزادی کا باعث بنتے ہیں، لیکن حاسدین کی باتوں نے کبھی ان کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی بلکہ وہ ہر قسم کی مخالفت سے بے نیاز اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے رہے۔ انھی کاوشوں کی وجہ سے آج اُردو دنیا میں ماہیا اپنی اصلی شناخت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سینکڑوں شعرائے کرام نے ماہیے کو اپنایا جس کا ثبوت ادبی رسائل میں بکھرا نظر آتا ہے۔ اب تو دوسری ادبی اصناف کی مانند ماہیے کے مکمل مجموعے بھی تواتر سے اشاعت پذیر ہو کر اہلِ سخن سے داد وصول کر رہے ہیں۔

(۱۰) ماہیے کے سالانہ تحقیقی جائزے

حیدر قریشی ایک اَن تھک محقق ہیں اور وہ ماہیے کی نشو و نما اور ارتقائی مراحل پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں، اس ضمن میں وہ سالانہ جائزوں کے ذریعے صنفِ ماہیے کے بدلتے رجحانات کا تجزیہ بھی پیش کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایسے کئی مضامین اور جائزے شائع ہو چکے ہیں جس میں ماہیا کی عہد بہ عہد ترقی کا احوال ملتا ہے تاہم درج ذیل جائزے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ اُردو ماہیا ۱۹۹۶ء میں (مشمولہ اُردو ماہیے کی تحریک)

۲۔ اُردو ماہیا ۱۹۹۷ء میں (مشمولہ اُردو ماہیے کی تحریک)

۳۔ اُردو ماہیا ۱۹۹۸ء میں (مشمولہ اُردو ماہیے کی تحریک)

۴۔ اُردو ماہیا ۱۹۹۹ء میں (مشمولہ اُردو ماہیے کے مباحث)

۵۔ اُردو ماہیا کے دس سال (مشمولہ اُردو ماہیے کے مباحث)

محولہ بالا سالانہ جائزوں میں ہر قسم کی اہم معلومات مل جاتی ہے۔ حیدر قریشی نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ صنف ماہیا کے حوالے سے ایسے تمام پہلوؤں کا احاطہ کریں جس کا فائدہ نہ صرف نئے لکھنے والوں کو پہنچے بلکہ آنے والا محقق بھی ان اعداد و شمار سے استفادہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جائزوں میں نئے لکھنے والوں کا ذکر، تازہ شعری

مجموعوں کا احوال، ماہیے کے حوالے سے شعرا اور تقریبات کی روداد، نئے تجربات و اسالیب، ادبی رسائل و جرائد میں ماہیے کی پذیرائی، ماہیے کے موضوع پر لکھے جانے والے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا حوالہ، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ماہیے کی مقبولیت اور آخر میں ماہیے کے مخالفین کا ذکرِ خیر غرض سبھی کچھ اس میں سبھی کچھ شامل ہوتا ہے وہ اپنے مضمون ''اُردو ماہیا ۱۹۹۶ء میں'' یہ خوش سناتے ہیں:

''۱۹۹۶ء کا سال پہلے پانچ برسوں کے مقابلے میں اُردو ماہیے کے لیے کئی
پہلوؤں سے زیادہ متحرک، فعال اور اہم سال ثابت ہوا.....اس برس درست
وزن کی ماہیا نگاری کے فروغ کے ساتھ ماہیے کے مزاج کا مسئلہ نمایاں ہوا
بعض دوستوں نے بجا طور پر اس طرف توجہ مبذول کرائی۔''(۸۶)

اس مضمون میں نثار ترابی اور ارشد نعیم کے اُن رویوں کی مذمت بھی کی گئی ہے جس کی وجہ سے ماہیے کی بحث غلط سمیت میں گامزن ہوتی جا رہی تھی۔ نئے ماہیے لکھنے والوں میں مشتاق احمد، ذوالفقار احسن، شاہدہ ناز، ڈاکٹر صابر آفاقی، احمد حسین مجاہد، شوکت مہدی، قاضی اعجاز محور، اجمل پاشا اور آل عمران کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ یہ تمام شعرا درست وزن کے ساتھ ماہیے لکھ رہے ہیں۔ ادبی رسائل کے حوالے سے بالخصوص ''اوراق''، ''اقدار''، ''تخلیق''، ''ارتکاز''، ''تجدیدِ نو''، ''صریر''، ''گلبن''، ''تکمیل'' اور ''عوامی منشور'' کا ذکر کیا ہے کیوں کہ ان کی بدولت ماہیے پر معیاری کام سامنے آنے لگا ہے۔ اس سالانہ جائزے کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اس مختصر سے جائزے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ
پنجابی لوک گیت ماہیا اُردو ادب میں آ کر اپنے وزن اور
مزاج، جسم اور روح کے ساتھ اُردو کی ایک نئی شعری
صنف کے طور پر مسلسل مستحکم ہو رہا ہے.....مجھے اُمید ہے
کہ اُردو ماہیا اپنے پنجابی خدوخال اور مزاج کے ساتھ
نئے تخلیقی اظہار سے اُردو شاعری کے وقار میں اضافے کا
موجب بنے گا۔''(۸۷)

حیدر قریشی کا یہ رجائی نقطۂ نظر ہر جگہ فعال دکھائی دیتا ہے محولہ بالا اقتباس میں ان کی رجائیت اور اُمید کا انداز غالب ہے بعد ازاں یہی انداز نئے سالانہ جائزے کا نقطۂ آغاز بنتا ہے:

''یہ ۱۹۹۷ء کا سال اردو ماہیے کے لیے استحکام کا سال
ثابت ہوا ہے۔ شعرائے کرام نے اس نئی شعری صنف کو
محبت کی نظر سے دیکھا اور اپنی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے

مطابق اس کے امکانات کو آزمایا، تحقیق و تنقید کے میدان
میں اہم اور بنیادی نوعیت کے کام ہوئے۔''(۸۸)

حیدر قریشی کے ۱۹۹۷ء کے جائزے میں جہاں درجنوں نئے نام سامنے آئے وہاں یہ اطلاع بھی ملی ہے:

''اُردو ماہیے کے سلسلے میں انڈیا میں بھاگلپور کے حلقہ
ادب کے زیرِ اہتمام ماہیا مشاعرہ کیا گیا۔ یہ مشاعرہ بہار
ایگریکلچر کے آڈیٹوریم میں ہوا جس میں ہندوستان کے
متعدد ماہیا نگاروں نے شرکت کی۔''(۸۹)

اسی مضمون کے توسط سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستانی فلم ''اف یہ محبت'' میں وپن ہانڈا نے اُردو ماہیے پیش کیے جبکہ پاکستانی فلم ''کانٹا'' کے لیے شاعر نذیر قیصر نے ماہیے لکھے جو ترنم ناز اور حامد علی خان نے گائے تھے۔ حیدر قریشی کا ایک اور مضمون ''اردو ماہیا ۱۹۹۸ء میں'' اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس ایک سال میں ماہیے کی حیران کن پیش رفت سامنے آئی تھی۔ مضمون کے ابتدائیے میں ہی کامیابی اور کامرانی کی نوید سنائی گئی ہے:

''یہ ۱۹۹۸ء کا سال اُردو ماہیے کے فروغ کے سلسلے میں
گزشتہ تمام برسوں سے زیادہ اہم سال ثابت
ہوا.....۱۹۹۷ء تک ماہیا نگاروں کی تعداد ایک سو تک
پہنچتی تھی۔ اس برس اس تعداد میں تقریباً دوگنا اضافہ
ہوا۔(۹۰)

ماہیے کے معترضین کے حوالے سے یہ دل چسپ جملہ ملاحظہ ہو:

''ماہیے کی مخالفت کے لحاظ سے بھی یہ سال خاصا اہم رہا
۔مخالفین نے بہتان طرازی سے لے کر کردار کُشی تک کے
سارے حربے آزما لیے۔''(۹۱)

حیدر قریشی نے مخالفین کی باتوں پر جوابی وار کرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ اُنھیں ماہیے کی تیز رفتار ترقی اور مقبولیت سے آگاہ کر دیا جائے اس حوالے سے وہ ہمیں بتاتے ہیں:

''ریڈیو پاکستان راولپنڈی، آکاش وانی بھاگلپور، ریڈیو
ڈوئچے ویلے اور افنر کنال ٹی وی چینل (جرمنی) پر اس
برس اُردو ماہیے کا تھوڑا بہت چرچا رہا۔ راولپنڈی ریڈیو
سے عارف فرہاد اور مسعود ہاشمی متحرک رہے۔ راشد حمید

کے ایک ریڈیائی انٹرویو میں بھی ماہیے کا ذکر آیا۔ زی ٹی
وی کے مقبول ترین ڈرامہ ،''امانت'' کی سال بھر کی
ساری قسطوں میں ماہیے کی خوبصورت دُھن سنائی دیتی
رہی۔''(۹۲)

اُردو ماہیے کی بڑھتی مقبولیت کی ایک اور دلیل یہ پیش کی گئی کہ پاک و ہند اور دیگر ممالک کے ادبی رسائل وجرائد اور اخبارات میں پہلی مرتبہ اُردو ماہیے شائع کے گئے تھے۔ان میں درج ذیل نام اہم ہیں:

''ماہنامہ''کتاب نما''(دہلی) ماہنامہ''شاعر''(ممبئی)
ماہنامہ''ایوان اردو''(دہلی) دوماہی''پرواز''،''ادب پٹیا
لہ''،روزنامہ''پاکستان''(لندن)''احساسِ نو''(لاہور)
اور''پاکستان لنک''(امریکہ)۔''(۹۳)

یہ سال اس حوالے سے مزید اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ:

''اس برس اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما جی نے
سات زبانوں میں ماہیے کہے۔ان میں اُردو، پنجابی،
بنگالی ، ہندی ، گجراتی ، مراٹھی اور فارسی شامل
ہے۔''(۹۴)

اُردو اور فارسی کی مثالیں پیش خدمت ہیں:

(الف) کچھ کر کے دکھاتی ہے۔
رحمت مولا کی
جب جوش میں آتی ہے

(ب) ایں محفلِ یاراں است
گلبن گل می کند
چہ فصلِ بہاراں است (۹۵)

حیدر قریشی نے ان سالانہ جائزوں میں جو معلومات اور تازہ ترین اعداد و شمار پیش کیے اگر ان سب کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر لیا جائے تو ماہیے کی ادبی تاریخ اپنے تمام رنگوں کے ساتھ محفوظ ہو سکتی ہے۔ان سالانہ جائزوں میں جہاں حیدر قریشی کا تجزیاتی انداز سامنے آتا ہے وہاں ان کا طرزِ تحقیق بھی اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہر بات ٹھوس تحقیقی حوالوں سے کرتے ہیں۔سالانہ جائزوں میں عموماً ایک تاثراتی سا انداز ہوتا ہے جو

رسمیاتِ تحقیق کے بنیادی لوازم سے بھی عاری ہوتا ہے لیکن حیدر قریشی کے تمام جائزے تحقیقی آداب کے ساتھ پیش ہوئے ہیں اور پڑھنے والوں پر گہرے نقوش ثبت کرتے ہیں۔

پروفیسر نذر خلیق لکھتے ہیں:

''حیدر قریشی اُردو ماہیے کا ایک ایسا مستند نام ہے کہ کل کو ماہیا ادب
کا مستقل حصہ بنے نہ بنے اس کے لیے حیدر قریشی کی خدمات ادب
کا مستقل حصہ رہیں گی۔'' (۹۶)

اس بات کو مان لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ماہیے کی صنف پر جن ناقدین اور محققین نے اصل سازی کا فریضہ انجام دیا اُن میں حیدر قریشی کا نام سرفہرست ہے اور اس حوالے سے اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جاتا رہے گا۔

(ب) حیدر قریشی کے محققانہ اوصاف

حیدر قریشی اگرچہ ڈاکٹر جمیل جالبی ، رشید حسن خان ، حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر وحید قریشی کی طرح ثقہ بند محقق تو نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان کی تحقیقی تصانیف میں ایسے تمام اہم اوصاف نمایاں ہیں جن کی توقع سنجیدہ محققین سے رکھی جا سکتی ہے،ذیل میں ان اِنھی محققانہ اوصاف پر اجمالاً بات ہوگی۔

(ا) توازن

حیدر قریشی ایک متوازن محقق ہیں۔جلد بازی یا عجلت سے وہ کوسوں دور رہتے ہیں۔ پاک و ہند کے ادبی رسائل وجرائد میں جب ماہیے کی تحریک عروج پر پہنچی تو جہاں موافقین کا ایک بڑا حلقہ اُن کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کو تحسین کی نظر سے دیکھ رہا تھا وہاں مخالفین کا ایک بڑا گروہ اُن کی مخالفت پر کمر بستہ دکھائی دیتا ہے۔حیدر قریشی نے آزمائش کی اس نازک گھڑی میں بھی تہذیب،شائستگی اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور صرف تاریخی،ادبی اور منطقی دلائل کی روشنی میں اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے رہے۔مخالفین کے ضمن میں ان کا شیوہ یہی رہا ہے:

''تحقیقی مطالعہ تب منصفانہ ہوتا ہے۔ جب فریقین کے
مؤقف سامنے لا کر کوئی نتیجہ نکالا جائے، یک طرفہ
مؤقف پیش کر کے تحقیق کے تقاضے پورے نہیں ہوتے
۔''(۹۷)

یہ توازن اصل میں حیدر قریشی کے کرداری اور ذہنی پختگی کا غماز ہے۔ یہی توازن حق گوئی اور معروضیت کو فروغ دیتا ہے۔

(۲) غیر جانب داری

محقق کے لیے غیر جانب داری پہلے شرط ہے۔حیدر قریشی کی تحقیقات میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ماہیے کی بحث میں جہاں پاک و ہند کے نئے اور پرانے اُدبا شریک ہوئے وہاں اُن کے قریبی احباب نے بھی اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔دوستوں کی آرا نے اختلافی مباحث کو جنم دیا اور بات آگے بڑھتی چلی گئی۔حیدر قریشی نے دوستوں کی تحقیقات میں موجود کمزوریوں اور کوتاہیوں کو برملا سامنے لایا اور محض دوستی کی وجہ سے اپنے کسی تحقیقی موقف پر سمجھوتہ نہیں کیا۔اُن کے لیے تحقیقی حقائق اہمیت رکھتے تھے لہٰذا کسی خاص جانب اُن کا جھکاؤ نظر نہیں آتا۔

(۳) معتدل تحقیقی روش

تحقیق میں حقائق اہم ہوتے ہیں اور ہر محقق اپنی ضرورت، فہم ا،ستعداد اور دل چسپی کی بدولت حقائق کی بازیافت کرتا ہے۔محقق کا ذہنی رویہ ہر قسم کے عقائد، توہمات اور نظریات سے بچ کر اپنی اہمیت منواتا ہے۔محقق کی ذاتی پسند اور ناپسند بھی اصل تحقیقی روش کو متاثر کرتی ہے۔اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم حیدر قریشی کے درج ذیل بیانات پر توجہ کریں تو ان کی معتدل تحقیقی روش سامنے آجاتی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''علمی اور تحقیقی معاملات میں مناسب سنجیدگی اختیار کرنا
> اور غیر ضروری تلخ کلامی سے بچنا بہتر ہوتا ہے۔''(۹۸)

تحقیقی روش کے حوالے سے ان کا یہ علمی رویہ لائق توجہ ہے:

> ''مجھے آج بھی کسی کج بحثی کی ضرورت نہیں ہے۔ ماہیے
> کے بارے میں اپنے بنیادی اور اُصولی موٴقف کی سچائی کا
> مجھے پکا یقین ہے اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ
> میرے لکھے میں بھی خامیاں ہوسکتی ہیں۔ان کی نشاندہی
> کیجیے میں فراخ دلی سے غلطی تسلیم بھی کروں گا اور پوری
> وضاحت کے ساتھ درستی بھی کرلوں گا۔''(۹۹)

تحقیقی رویے کی ایک اور عمدہ مثال ملاحظہ ہو:

> ''میں ادب میں کسی قول اور نظریے کو حرفِ آخر نہیں
> سمجھتا۔ ماہیے کے سلسلے میں میرا ایک موٴقف ہے جسے
> میں نے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔میرے دلائل کو ان
> سے بہتر دلائل کے ساتھ توڑا جا سکتا ہے۔لیکن پتھر کے
> ساتھ نہیں۔''(۱۰۰)

اسے صحت مند تحقیقی رویہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ رویے تحقیقی مفروضات اور نظریات کو درست سمت پر گامزن رکھتے ہیں تحقیقی اُمور میں اگر محقق دیانت اور صداقت کا رویہ پیدا نہ کر سکے تو اس کے مشاہدات اور نتائج غلط فہمی کو ہوا دینے لگتے ہیں۔حیدر قریشی نے ادب کے مادی فوائد کی خاطر خالص انسانی اور اخلاقی اقدار کو فراموش نہیں کیا۔

(۴) عروض سے واقفیت

حیدر قریشی نے ماہیے کی شناخت ثابت کرنے کے لیے جہاں اس کی تحریری ہیئت، مزاج، موضوعات، روایت اور نشو و نما پر یادگار تصانیف متعارف کرائیں وہاں اس صنف کے عروضی پہلو کو بھی بطورِ خاص نمایاں کیا۔اُن کے مضامین، خصوصاً ''ماہیے کے وزن کا مسئلہ''، ''ماہیے کے وزن اور مزاج کی بحث''، ''پنجابی لوک گیت''، اور ''ماہیے کی تحریری شکل'' وغیرہ میں عروضی پیمانوں کو بنیاد بنا کر اس صنف کے خدوخال واضح کیے گئے ہیں۔ یہ عروضی واقفیت ان کے تحقیقی کاموں میں بڑی معاونت کرتی ہے۔ ماہیے کے وزن پر بحث کرتے ہوئے وہ یہ تکنیکی نکتے بھی قاری کے سامنے رکھتے ہیں تا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی معروضی رائے قائم کر سکے۔ایک مثال ملاحظہ ہو:

> '' اُردو زبان میں زحافات کا تعین ہے جن حروف کو
> گرانے کی اجازت ہے اُن کی وضاحت موجود ہے لیکن
> پنجابی زبان میں ایسا کوئی ضابطہ یا اُصول نہیں ہے
> ضرورت شعری کے مطابق اس کے حروف کو کھینچ کر لمبا
> بھی کرلیا جاتا ہے اور گرا کر مختصر بھی کرلیا جاتا ہے اس عمل
> کے دوران ملفوظی یا غیر ملفوظی حروف کا کوئی لحاظ نہیں رکھا
> جاتا ہے۔ پنجابی زبان میں اس رعایت کا فائدہ ماہیے
> میں بھی اُٹھایا گیا ہے۔(۱۰۱)

اسی عروضی واقفیت نے اُن کے موٴقف کو پائیداری اور مضبوطی فراہم کی تھی۔حیدر قریشی اگر ماہیے کی بحث میں عروضی دلائل بروقت استعمال نہ کرتے تو پھر اس کی دوسری ہم شکل اصناف، مثلاً ثلاثی اور ہائیکو کے درمیان فرق کرنا محال ہوجاتا اور ماہیے کی تحریک اور تمام متعلقہ علمی و ادبی مباحث مغالطّوں کا شکار ہوکر رہ جاتے۔

(۵) حوالہ درج کرنے میں احتیاط

حیدر قریشی اپنی تمام تحقیقات میں رسمیاتِ تحقیق کا شعوری سطح پر التزام کرتے ہیں۔اگرچہ اُن کی ذاتی دل چسپی کا مرکز و محور تخلیقی ادب ہے تاہم تحقیق میں بھی وہ تمام اُصول و ضوابط کی پابندی لازم خیال کرتے ہیں ۔وہ خیالی اور بے بنیاد باتوں پر دھیان نہیں دیتے بلکہ اپنی ہر بات اور نقطۂ نظر کو ضروری حوالوں کے ساتھ پیش کر

نے کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کے ہاں حوالہ نگاری کا اہتمام خاصا سلجھا ہوا اور تحقیقی روایات کے عین مطابق ہے۔ادبی مباحث کے دوران جہاں کہیں بھی حوالہ درج کرنے کی ضرورت پیش آئی وہاں حوالہ نقل کرنے کا پورا ضابطہ استعمال کیا جس میں مصنف کا نام، کتاب کا نام، سنِ اشاعت، پبلشر اور صفحہ نمبر کا اندراج وضاحت کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔سالانہ جائزوں میں بھی حوالہ نگاری کا مکمل ضابطہ استعمال کرتے ہیں۔موضوع زیرِ بحث کے خارجی اور داخلی شواہد کا اندراج بھی حوالوں کے ساتھ نظر آتا ہے،غرض اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ تواریخ اور سنین کا ذکر جہاں ضروری ہے وہاں اس کا حوالہ لازماً آنا چاہیے۔ایک بحث کے دوران جب انھیں معروف موسیقی کار نوشاد کا خط ملا تو اس پر تاریخ درج نہیں تھی لیکن داخلی شہادت کی بنیاد پر وہ اس کی تاریخ متعین کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں نوشاد کا خط ملنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''اس خط پر نوشاد نے تاریخ درج نہیں کی لیکن لفافے پر
باندرہ پوسٹ آفس کی مہر پر ۷ اپریل ۱۹۹۸ء کی تاریخ
آسانی سے پڑھی جاسکتی ہے۔(۱۰۲)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا ایک بیان درج کرنے کے بعد قوسین میں حوالہ اس طرح نقل کرتے ہیں۔

''حرف اول، کتاب ''رم جھم رم جھم'' ص ۱۸ مطبوعہ ۱۹۹۶ء ناشر معیار پبلی کیشنز، دہلی۔'' (۱۰۳)

اس نوع کی بیسیوں مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں۔حیدر قریشی دوٹوک اور کھری بات کہنے کے عادی ہیں اسی لیے وہ اپنے جملہ دلائل ضروری حوالوں سے مزین کر کے ادبی عدالت میں پیش کرتے ہیں اور عموماً جیت بھی اُنھی کی ہوتی ہے۔

(۶) اپنی غلطی کا اعتراف

تحقیقی اور تنقیدی اُمور میں غلطی کا سرزد ہو جانا عام سی بات ہے۔سنجیدہ اور ذمہ دار لکھاری اپنی غلطی کی اصلاح کرتا ہے، جبکہ غیر ذمہ دار ادیب اپنی غلطیوں کی تاویل کر کے اُن پر دہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔کچھ ادیب اپنی غلطی کا اعتراف کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔بہر حال کامل تحقیق ادبی دیانت کا تقاضا کرتی ہے۔

حیدر قریشی جس عرصے میں یہ غور وفکر کر رہے تھے اُردو زبان وادب میں ماہیے کا بانی کون ہے، اُس دوران وہ موجود تحقیقی وسائل کی بنیاد پر قمر جلال آبادی (یہ اُستاد قمر جلالوی سے مختلف شخصیت ہے) کو پہلا ماہیا نگار قرار دے رہے تھے، لیکن نئی تحقیق سامنے آنے پر اُنھیں نے پرانا نظریہ ترک کرنا پڑا کیوں کہ نئے شواہد اب ہمت رائے شرما کو بانی ماہیا نگار ثابت کر رہے تھے۔اس موضوع پر ان کی پوری کتاب بھی آ چکی ہے اور تا حال شرما جی کو ہی بانی ماہیا نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے حیدر قریشی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

''میں نے اپنے مضمون مطبوعہ ''صریر'' دسمبر ۹۲ء میں قمر

جلال آبادی کو ماہیا نگار لکھا تھا۔اب ایک کرم فرمانے
''اوراق'' جنوری، فروری ۹۸ء، صفحہ ۲۷۲ پر اصرار کے
ساتھ قمر جلال آبادی کو پہلا ماہیا نگار قرار دیا ہے، حالانکہ
مجھے بھی مغالطہ ہوا تھا اور مذکورہ کرم فرما کو بھی مغالطہ ہوا
ہے۔تو کیا محض اس بنیاد پر کہ حیدر قریشی نے بھی اور اس
کے مخالفین نے بھی قمر جلال آبادی کو پہلا ماہیا نگار تسلیم
کیا ہے۔تو قمر جلال آبادی کو پہلا ماہیا نگار مان لیا
جائے!''(۱۰۴)

یہ بیان پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حیدر قریشی نے جو بات کہی تھی:

''تحقیقی معاملات میں حقائق مقدس ہوتے ہیں۔''
(۱۰۵)

تو اس پر خود بھی عمل کر دکھایا ہے۔

(۷) دستاویزی تحقیق سے استفادہ

سید جمیل احمد رضوی رقمطراز ہیں:

''تحقیق کے اس طریقے میں دستاویزت اور ریکارڈ کا
استعمال کیا جاتا اس لیے اس کو دستاویزی تحقیق کہتے ہیں۔(۱۰۶)

اس طریقِ تحقیق کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔اس میں ہر قسم کے لفظی یا ہندسی مواد سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ اخبارات سرکاری ریکارڈز، رسائل، خطوط، سوانح عمریاں، ذاتی ڈائریاں، یادداشتیں، تصاویر، متحرک فلمیں، تصویریں، سکے، مجسمے، کتابچے ڈرائنگ کے نمونے اور مخطوطات سے متعلقہ تحقیقی مواد اخذ کیا جاسکتا ہے۔

حیدر قریشی کے ہاں دستاویزی طریقِ تحقیق حاوی نظر آتی ہے وہ ماہیے کی شناخت دریافت کرنے کی خاطر خطوط، مائیکروفلمیں، اخبارات رسائل اور پرانے کتابچوں کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں۔ہمت رائے شرما کی فلم ''خاموشی'' کا وہ کتابچہ جو ۱۹۳۶ء میں فلم کے ساتھ ہی شائع ہو کر بعد میں نایاب ہو گیا تھا، اس کی تلاش میں حیدر قریشی نے کئی ماہ صرف کر دیے تھے کیونکہ اُس دستاویزی ثبوت کی بدولت ہی وہ کوئی حتمی رائے قائم کر سکتے تھے۔آخر یہ کتابچہ ہمت رائے شرما نے خود تلاش کر کے انھیں جرمنی روانہ کر دیا۔شرما جی ۲۱ دسمبر ۱۹۹۸ء کے تحریر کردہ خط میں حیدر قریشی کو لکھتے ہیں:

'' آج سے ساٹھ باسٹھ سال پرانی فلم'' خاموشی'' کی

Booklet جو پرانے گودام کے ایک سٹور سے پھٹی پرانی
حالت میں مل گئی ہے۔اس میں وہ سب کچھ درج ہے
جس کی تلاش تھی یہ بے حد اہم اور نایاب ہے۔اسے
حاصل کرنے کے لیے خاص آدمی کو کلکتے
بھیجنا پڑا۔‘‘(۱۰۷)

اس کتابچے کی مدد سے حیدر قریشی کو یہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔

’’فلم خاموشی‘‘ کی بک لیٹ پر مئی ۱۹۳۶ءکا اندراج یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمت رائے
شرما جی نے ۱۹۳۶ء میں پہلی بار اس فلم کے لیے اُردو ماہیے لکھے۔‘‘(۱۰۸)

اُردو ماہیے کی تحریک میں یہ حوالہ اصل میں برہان قاطع ثابت ہوا اور دستاویزی تحقیق نے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ اس طرح کی کئی اور مثالیں بآسانی پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۸) مستقل مزاجی

حیدر قریشی کے تحقیقی اوصاف میں مستقل مزاجی کا کردار اہم ہے۔ جب ماہیے کی تحریک کا آغاز ہوا تو وہ پاکستان میں تھے لیکن جیسے ہی ان نزاعی مباحث نے طول پکڑا، وہ ہجرت کر کے جرمنی جا چکے تھے، چنانچہ ہر قسم کے ادبی مراکز سے دور ہونے کے باعث مطلوبہ مواد تک رسائی خاصی مشکل ہو گئی تھی۔ ایسی آزمائشی صورتِ حال میں بذریعہ انٹرنیٹ اور فون ان کا رابطہ ادبی دنیا سے بحال ہوا اور رفتہ رفتہ ادبی رسائل و جرائد بھی ملنا شروع ہو گئے۔ جرمنی میں بیٹھ کر اُنھوں نے جس ہمت، لگن، خلوص، مستقل مزاجی اور تحقیقی دیانت سے ماہیے کی تحریک چلائی وہ بذاتِ خود ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ حیدر قریشی نے پوری دل جمعی سے اپنے مؤقف کو واضح کرتے رہے اور تقریباً ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ صرف اسی ایک موضوع کو نبھاتے رہے۔ اگر اُن میں مستقل مزاجی کی صفت نہ ہوتی تو وہ بہت جلد ہار مان کر منظر سے اوجھل ہو جاتے لیکن وہ وسائل کی کمی کے باوجود اس صنف کی شناخت پر وہ بات کرتے رہے۔ ان کی مستقل مزاجی کی یہی صفت تحقیقی کاموں میں خاصی معاون ثابت ہوئی اور وہ اطمینان سے اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔

(۹) تجزیاتی اور وضاحتی اُسلوب

حیدر قریشی کی تمام تحقیقی تحریروں میں تجزیات اور تشریحات کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ سائنسی اور وضاحتی اُسلوب ان کی تحقیقات میں قطعیت پیدا کرتا ہے صنف ماہیا پر ان کا مؤقف جہاں تاریخ کی روشنی میں استدلال قائم کرتا نظر آتا ہے وہاں مسائل کو استخراجی اور استقرائی طریقوں سے واضح کرنے کا عام رجحان بھی ملتا ہے۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:

’’ماہیا بظاہر عورت کی زبان میں مرد سے محبت کا اظہار
ہے۔اس حوالے سے ماہیے کو قدیم ہندوستانی گیت کے
تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔غور کیا جائے تو یہ صوفی شعرا
کا بالواسطہ اثر بھی محسوس ہوتا ہے کہ صوفیانہ شاعری میں
محبوب ہمیشہ مذکر کے صیغہ میں آیا ہے ریختی سے بھی اس
کے سرے ملائے جا سکتے ہیں کہ ریختی میں عورت کی زبان
سے جذبات کا بے محابا اظہار کیا جاتا ہے۔‘‘(۱۰۹)

تجزیے اور وضاحت کا اثر وہاں زیادہ نمایاں ہوتا ہے جہاں حیدر قریشی ماہیوں کی تشریح، تعبیر اور تفسیر کا فریضہ انجام دیتے ہیں تحقیقی مقالات میں کئی مقام پر وضاحتی اُسلوب اپنایا گیا ہے جس سے قاری کو سہولت رہتی ہے۔

(۱۰) سادہ اُسلوب نگارش

حیدر قریشی کے تمام تحقیقی مضامین سادہ اُسلوب نگارش کا مظہر ہیں۔ جملے سادہ اور رواں ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ استعمال کر کے دوسروں پر اپنی علمیت کا رعب نہیں ڈالتے۔ یہ سادہ اندازِ تحریر پر اثر اور پرشکوہ ہے۔ رشید حسن خان بھی ایسے تحقیقی اُسلوب کی تحسین کرتے ہیں:

’’تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے
سے پاک ہونا چاہیئے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں
بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔‘‘(۱۱۰)

حیدر قریشی کے ہاں زبان کا یہی سلجھا ہوا اور محتاط انداز ملتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات ممکنہ سادگی کے ساتھ کہہ ڈالنے کا ہنر جانتے ہیں یہ انداز ملاحظہ ہو:

’’جو ماہیا سہولت کے ساتھ اپنے فطری بہاؤ میں ماہیے کی پنجابی
دھن پر گایا، گنگنایا جا سکتا ہے وہ ماہیا ہے جو اس معیار پر پورا نہیں
اُترتا وہ کلاسیکل موسیقی کا شاہکار تو ہو سکتا ہے، اعلیٰ ادبی فن پارہ
ہو سکتا ہے، لیکن ماہیا نہیں ہو سکتا۔‘‘(۱۱۱)

سادگی کی ایسی کئی روشن مثالیں اُن کی تحریروں سے پیش کی جا سکتی ہیں یہاں بخوفِ طوالت مزید مثالوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے تمام تحقیقی مضامین میں معیاری اُصولوں کی پاسداری کی ہے۔

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

حوالہ جات

۱۔ جواز جعفری، حیدر قریشی سے انٹرویو، مشمولہ حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز، مرتبہ سعید شباب، نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ایمسٹرڈیم ہالینڈ،۲۰۰۴ء، ص ۹۷

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۱ء، ص ۲۳۱، ۲۳۰

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات، ص ۲۳۰

۴۔ حیدر قریشی، پنجابی لوک گیت... ماہیا (مضمون) مشمولہ اُردو میں ماہیا نگاری، فرہاد پبلی کیشنز اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۴

۵۔ حیدر قریشی، پنجابی لوک گیت... ماہیا (مضمون) مشمولہ اُردو میں ماہیا نگاری، ص ۴

۶۔ پنجابی لوک گیت... ماہیا، ص ۳۰

۷۔ پنجابی لوک گیت... ماہیا، ص ۳۰

۸۔ پنجابی لوک گیت... ماہیا، ص ۳۰

۹۔ پنجابی لوک گیت... ماہیا، ص ۲۸

۱۰۔ حیدر قریشی، ماہیے کے وزن کا مسئلہ (مضمون) مشمولہ اُردو میں ماہیا نگاری، ص ۱۴

۱۱۔ حیدر قریشی، قفس کے اندر (شعری کلیات) عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد،۲۰۱۳ء ص ۱۴۷

۱۲۔ حیدر قریشی، قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۱۴۷

۱۳۔ قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۱۳۸

۱۴۔ قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۱۳۸

۱۵۔ قفس کے اندر (شعری کلیات) ص ۱۳۸

۱۶۔ شگفتہ الطاف، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد ۲۰۰۵ء ص ۶۰

۱۷۔ شگفتہ الطاف، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری (مضمون) ص ۲۰

۱۸۔ عارف فرہاد، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ، حیدر قریشی کی شاعری، مرتبہ ہردے بھانو پرتاپ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۱۳ء، ص ۷۷

۱۹۔ شگفتہ الطاف، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری (مضمون) ص ۲۰

۲۰۔ اختر رضا سلیمی، اُردو میں ماہیا نگاری اور حیدر قریشی (مضمون)

مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات مرتبہ، پروفیسر نذر خلیق، میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور،۲۰۰۳ء، ص ۲۶۴

۲۱۔ افضل چوہان (ماہیے) مشمولہ، عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد شمارہ نمبر ۱۳، ۲۰۰۱ء مارچ، ص ۱۵۸

۲۲۔ حیدر قریشی، اردو میں ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، فرہاد پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴

۲۳۔ حیدر قریشی، ماہیا پابند لے ہے (مضمون) مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، ص ۹۴

۲۴۔ حیدر قریشی سے بذریعہ انٹرنیٹ انٹرویو، از اختر رضا سلیمی، مشمولہ حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز ، مرتبہ، سعید شباب، نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ہالینڈ،۲۰۰۴ء ص ۷۵

۲۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۱ء، ص ۹۳

۲۶۔ حیدر قریشی، پنجابی لوک گیت... ماہیے کی تحریری ہیت (مضمون)، مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، ص ۱۴۱

۲۷۔ تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت) ص ۲۳۱، ۲۳۰

۲۸۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے موضوعات (مضمون) مشمولہ، اردو میں ماہیا نگاری، ص ۸۷

۲۹۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے موضوعات (مضمون) مشمولہ، اردو میں ماہیا نگاری، ص ۸۷

۳۰۔ سلطان کھاروی (ماہیے) مشمولہ، سہ ماہی تسطیر ، لاہور، مدیر نصیر احمد ناصر ، شمارہ ۱۸،

۳۱۔ قفس کے اندر، ص ۱۳۸

۳۲۔ قفس کے اندر، ص ۱۳۵

۳۳۔ قفس کے اندار ، ص ۱۵۲

۳۴۔ قفس کے اندر، ص ۱۴۱

۳۵۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے موضوعات، ص ۹۶

۳۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، مکتبہ، عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۱

۳۷۔ ڈاکٹر، وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، ص ۱۷۱

۳۸۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا تحقیق و تنقید، (کلیات) الوقار پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۰ء، ص ۵۸

۳۹۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا تحقیق و تنقید (کلیات)، ص ۵۸

۴۰۔ ڈاکٹر انور سدید، سالانہ ادبی جائزہ ۱۹۹۵ء ، مشمولہ، اردو ماہیا تحقیق و تنقید، ص ۳۷ یہ جائزہ سب سے پہلے ماہنامہ ''صریر'' کراچی کے شمارہ مارچ ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ حیدر قریشی نے اسی کا اقتباس اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔

۴۱۔ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۷۹

۴۲۔ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۷۹

۴۳۔ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۸۰،۸۱

۴۴۔ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۸۱

۴۵۔ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۸۱

۴۶۔ شگفتہ الطاف، حیدر قریشی کی ماہیا نگاری، ص۲۰

۴۷۔ اردو میں ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، ص۵۷

۴۸۔ اردو میں ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، ص۵۸

۴۹۔ اردو میں ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، ص۶۱

۵۰۔ اردو میں ماہیا نگاری (مضمون) مشمولہ اردو ماہیے کی تحریک، ص۸۶،۸۷

۵۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ادبی تحقیق اور حقائق (مضمون) مشمولہ تحقیق شناسی، ترتیب وحواشی رفاقت علی شاہد، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۷۳

۵۲۔ حیدر قریشی، اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا (مضمون) مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۳۹

۵۳۔ حیدر قریشی، اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا (مضمون) ص۴۰

۵۴۔ حیدر قریشی، اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا، ص۴۰

۵۵۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (پیش لفظ)، مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص، ۳۳۵

۵۶۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (پیش لفظ)، مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۳۳۶

۵۷۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص۳۳۶

۵۸۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص۳۳۶

۵۹۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص۳۴۰

۶۰۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص۳۴۲

۶۱۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص، ۳۴۲

۶۲۔ حیدر قریشی، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص، ۳۴۲، ۳۴۳

۶۳۔ حیدر قریشی، فلم خاموشی اور تحقیق مزید (مضمون) مشمولہ اُردو ماہیا تحقیق وتنقید، ص۳۵۲

۶۴۔ اسماعیل گوہر، اُردو ماہیے کی تحریک، مشمولہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات (مضمون)، میاں محمد بخش پبلشرز، خان پور، ۲۰۰۳ء، ص۲۶۸

۶۵۔ نذر خلیق، اُردو ماہیا اور حیدر قریشی مشمولہ، عکاس انٹرنیشنل (حیدر قریشی نمبر)، شمارہ، ۲۰۰۵ء، اسلام آباد، ص۷۹

۶۶۔ پروفیسر، عبدالستار دلوی، تحقیقی عمل کے مراحل (مضمون)، مشمولہ اردو میں اصول تحقیق (جلد اول) مرتبہ، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ورڈ ویژن پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص۷۸

۶۷۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۴۷۳

۶۸۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۷۳

۶۹۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۷۳

۷۰۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۸۳

۷۱۔ ماہیے کے مباحث، ص۴۷۴

۷۲۔ ماہیے کے مباحث، ۴۷۶

۷۳۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۷۴

۷۴۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۷۷

۷۵۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۷۸

۷۶۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۸۰

۷۷۔ حیدر قریشی، ماہیے کے مباحث، ص۴۷۸

۷۸۔ حیدر قریشی، اوراق اور ماہیا (مضمون) مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید (کلیات) ص۴۸۹

۷۹۔ حیدر قریشی، اردو ماہیا ۱۹۹۹ء میں (مضمون) مشمولہ، اردو ماہیا تحقیق وتنقید، کلیات، ص۵۰۳

۸۰۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء، ص۷۷

۸۱۔ تبسم کاشمیری، ادبی تحقیق کے اصول مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص۱۴

۸۲۔ حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز، ص۳۰

۸۳۔ حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز، ص۳۰

۸۴۔ حیدرقریشی سے لیے گئے انٹرویوز،ص۳۰

۸۵۔ محمد وسیم انجم،حیدرقریشی سے ایک مکالمہ(مصاحبہ)مشمولہ حیدرقریشی سے لیے گئے انٹرویوز، ص۲۴،۲۳

۸۶۔ حیدرقریشی،اردو ماہیا۱۹۹۶ء میں(مضمون)مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید ص۲۴۱

۸۷۔ اردو ماہیا۱۹۹۶ء میں(مضمون)ص۲۴۴

۸۸۔ حیدرقریشی،اردو ماہیا۱۹۹۷ء(مضمون) میں مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۲۵۲

۸۹۔ حیدرقریشی اردو ماہیا ،۱۹۹۷ء میں(مضمون)ص۲۵۵

۹۰۔ حیدرقریشی اردو ماہیا۱۹۹۸ء میں(مضمون)مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۳۱۲

۹۱۔ حیدرقریشی اردو ماہیا،۱۹۹۸ء میں(مضمون)،ص۳۱۴

۹۲۔ حیدرقریشی اردو ماہیا،۱۹۹۸ء میں(مضمون)ص۳۱۵

۹۳۔ حیدرقریشی اردو ماہیا،۱۹۹۸ء میں(مضمون)،ص۳۱۷

۹۴۔ حیدرقریشی اردو ماہیا،۱۹۹۸ء میں(مضمون)ص۳۱۶،۳۱۵

۹۵۔ حیدرقریشی اردو ماہیا،۱۹۹۸ء میں(مضمون)ص۳۱۶

۹۶۔ پروفیسر نذر خلیق،اردو ماہیا اور حیدرقریشی مشمولہ،عکاس(حیدرقریشی نمبر)،ص۸۳

۹۷۔ حیدرقریشی،ماہیے کے وزن اور مزاج کی بحث مشمولہ،اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۷۵

۹۸۔ حیدرقریشی،اردو میں ماہیا نگاری،مشمولہ،اردو ماہیا تحقیق وتنقید ،ص۱۶

۹۹۔ حیدرقریشی،اردو میں ماہیا نگاری،مشمولہ،اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۱۷

۱۰۰۔ حیدرقریشی(ابتدائیہ)مشمولہ،اردو میں ماہیا نگاری،ص۲۵

۱۰۱۔ حیدرقریشی(ابتدائیہ)مشمولہ،اردو میں ماہیا نگاری،ص۳۴

۱۰۲۔ حیدرقریشی،اردو ماہیے کے بانی،ہمت رائے شرما فلم،خاموشی اور تحقیق مزید(مضمون) مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۳۵۰

۱۰۳۔ حیدرقریشی،اردو ماہیے کے بانی،ہمت رائے شرما(مضمون)مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۳۴۱

۱۰۴۔ حیدرقریشی،اردو ماہیے کے بانی،ہمت رائے شرما(مضمون)مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۳۴۵

۱۰۵۔ حیدرقریشی،اردو ماہیے کے بانی،ہمت رائے شرما(مضمون)مشمولہ اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۳۳۶

۱۰۶۔ جمیل احمد رضوی،لائبریری سائنس اور اصول تحقیق،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۱۹۸۷ء،ص۱۱۹

۱۰۷۔ حیدرقریشی فلم''خاموشی''اور تحقیق مزید(مضمون)ص۳۵۱

۱۰۸۔ حیدرقریشی فلم''خاموشی''اور تحقیق مزید(مضمون)ص۳۵۲

۱۰۹۔ حیدرقریشی،پنجابی لوک گیت...ماہیا(مضمون)مشمولہ،اردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۳۰

۱۱۰۔ رشید حسن خان،ادبی،تحقیق مسائل اور تجزیہ ص۱۴

۱۱۱۔ اُردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما ص۳۴۵

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

باب چہارم

حیدر قریشی بحیثیت نقاد

باب چہارم

حیدرقریشی بحیثیت نقاد

حیدرقریشی کی ادبی زندگی کا ایک اہم حوالہ تنقید نگاری بھی ہے۔ یہ پہلو جہاں اُن کی شخصیت اور ادبی سفر کے متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے وہاں معیاری اور متوازن تنقید کے نمونے بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں منصف مزاج اور معقولیت پسند نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ تہذیبی رکھ رکھاؤ اور اثر آفرینی اُن کے تنقیدی اُسلوب کے مضبوط ستون ہیں۔ حیدرقریشی کے تنقیدی سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے خطوط، تقاریر اور مستقل تنقیدی مضامین کے ذریعے تجزیاتی عمل کو آگے بڑھایا ہے، نیز تبصرے اور کتابوں کے دیباچے بھی اسی عمل کا لازمی حصہ ہیں۔ جس دور میں ماہیے کی تحریک مختلف نشیب وفراز سے گزر رہی تھی اُس دوران حیدرقریشی نے صنفِ ماہیا کے کئی مسائل تنقیدی زاویوں سے واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا ماہیے کے حوالے سے اُن کی تنقیدات کو دیکھنا لازمی ہے۔

حیدرقریشی کی تنقید کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اُن کے طریقِ کار پر جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات یا ترقی پسندی وغیرہ کا کوئی لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تنقید کے عمومی اور روایتی اُصولوں کو جدید طرزِ اظہار کی بدولت وقیع بناتے ہیں اور حق گوئی کے راستے اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتے ہیں۔ اُن کے تمام تنقیدی سرمائے پر بات کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تنقید کی تعریف، موضوع اور حدود پر اجمالی نظر ڈال لی جائے تاکہ آنے والے تمام موضوعات اور مسائل کو درست تناظر میں پرکھا جا سکے۔

(الف) تنقید کی تعریف، موضوع اور حدود

حامد اللہ افسر تنقید کے لغوی اور اصطلاحی معنوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''تنقید کے لغوی معنی ہیں پرکھنا، بُرے بھلے اور کھوٹے کھرے کا فرق معلوم کرنا۔ بطور ادبی اصطلاح کے بھی اس لفظ کے استعمال میں اس کے لغوی معانی کا اثر موجود ہے۔ ادب کے محاسن اور مصائب کا صحیح اندازہ کرنا اور اس پر رائے قائم کرنا اصطلاح میں تنقید کہلاتا ہے، تخلیقی ادب حیاتِ انسان کی ترجمانی کرتا ہے اور تنقید تخلیقی ادب

> کی ترجمانی کرتی ہے۔'' (۱)

جے۔اے گڈن (J.A Cuddon) نے تنقید کے اصلاحی پہلو میں قدرے وسعت پیدا کر دی ہے، اُس کے مطابق:

"The art or science of literary criticism is deveted to the comparison and analysis,to the interpretation and evaluation of works of literature"(2)

اِن دونوں بیانات کی روشنی میں جو صورتحالِ حال سامنے آتی ہے اُس کے تحت تنقیدی عمل میں جانچ، پرکھ، محاسن ومصائب کی نشاندہی کے ساتھ موازنہ، تجزیہ، توضیح، تشریح اور ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی شامل ہو جاتا ہے۔ دنیا کے تمام علوم وفنون میں تنقید کا عمل دخل واضح نظر آتا ہے لیکن زیرِ نظر بحث میں صرف ادبی تنقید سے سروکار رکھا گیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی لفظ ''تنقید'' کے اشتقاقی اور صرفی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لفظ ''تنقید'' عربی فارسی میں نہیں ہے اور تفعیل کے وزن پر یہ لفظ اُردو والوں کا ایجاد کیا ہوا ہے لیکن ''نقد''، ''مناقدہ''، ''انتقاد''، اور ''نقاد'' تو عربی میں موجود ہیں۔'' (۳)

اس لفظ کے اولین استعمال کے بارے میں اُن کی رائے یہ ہے:

> '''تنقید'' کا لفظ ہمارے یہاں سب سے پہلے مہدی افادی نے ۱۹۱۰ء میں استعمال کیا۔'' (۴)

فاروقی صاحب کی یہ رائے بھی قابلِ توجہ ہے:

> ''مقدمہ شعروشاعری'' میں بھی تنقید، انتقاد یا نقاد جیسا کوئی لفظ نہیں برتا گیا ہے۔'' (۵)

اِن تمام باتوں کے باوجود تنقید کا لفظ اُردو ادب میں رائج ہو گیا ہے اور اس کے عمومی اور اصطلاحی مفہوم میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہیں پایا جاتا۔ البتہ سید عابد علی عابد ''تنقید'' کا لفظ استعمال کرنے میں خاص احتیاط برتتے تھے اور اس کی جگہ ''انتقاد'' کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن کی کتاب کا نام بھی ''اُصولِ انتقادِ ادبیات'' ہے۔ ماسوائے چند استثنائی صورتوں کے یہ لفظ اُردو ادب میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا ہے اور عوام وخواص کی زبان پر رواں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا جدید اُردو تنقید کے اُفقی، عمودی اور امتزاجی خصوصیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''تنقید کا کام ادب کی تقویم اور تشریح ہے۔ وہ نہ صرف ادبی تحریر کو غیر ادبی تحریر سے متمیز کرنے پر قادر ہے بلکہ ادبی تحریر کے معیار، ساخت اور مزاج کا تجزیہ بھی کرتی

ہے۔"(۶)

ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید کے اصطلاحی معنوں میں مزید گہرائی پیدا کر دی ہے۔ اس تعریف کی رُو سے فن پارے کے خصائص اور اُس کی نوعیت کا تعین کرنا بھی تنقید کی ذمہ داری کا لازمی جز ہے، نیز فن پارے کی مدلل توضیح اور جمالیاتی قدروں کا سراغ لگانا اس اہم عمل کا ناگزیر حصہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اُصولِ تنقید کے بنیادی مباحث کو سمیٹتے ہوئے درج ذیل سادہ تعریف متعارف کرائی ہے:

"ادبی تخلیقات کے حسن و قبح کی میزان کو تنقید قرار دیا جاسکتا ہے،
اسی لیے تنقید کے عمل میں غیر جانب داری، غیر جذباتیت کے ساتھ
ساتھ علم و مطالعہ بھی لازم ہے۔" (۷)

تنقید نگاری کا عمل خاصا پیچیدہ ہوتا ہے۔ کسی ادب پارے کی تفہیم، تعبیر، توضیح اور تشریح کا عمل جہاں پوشیدہ باریکیوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے وہاں فن پارے کی جمالیاتی جہات اور دیگر محاسن و مصائب کی گرہ کشائی بھی کرتا ہے۔

دنیائے ادب میں تنقید کے مختلف دبستان رائج چلے آ رہے ہیں، ذیل میں صرف اُن دبستانوں کے نام لکھنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے جو اُردو ادب میں کسی نہ کسی حوالے سے اپنے اثرات مرتسم کر چکے ہیں:

(ب) تنقیدی دبستان

(۱) تاثراتی دبستان (۲) جمالیاتی دبستان (۳) مارکسی دبستان (۴) ترقی پسند دبستان (۵) عمرانی دبستان (۶) نفسیاتی دبستان (۷) سائنسی دبستان (۸) اُسلوبیاتی دبستان (۹) ساختیاتی دبستان

اُردو ادب میں تنقید کو مزید دو بڑے گرہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یعنی مشرقی تنقید اور مغربی تنقید۔ تاہم اگر معروضی سطح پر ان دونوں کی گہرائی میں اُتر کر دیکھا جائے تو اشتراک کی کئی صورتیں نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مشرقی اور مغربی اُصول تنقید میں درج ذیل نکات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں:

۱۔ فن پارے کا تجزیہ
۲۔ تشریح و توضیح
۳۔ قدر و قیمت کا تعین
۴۔ تعبیر و تحلیل
۵۔ ادبی مقام کا فیصلہ
۶۔ جمالیاتی تجزیہ
۷۔ ترکیب و تشکیل

۸۔ خلوص
۹۔ معروضیت
۱۰۔ تخیل اور تفکر کی ہم آہنگی
۱۱۔ جدید علوم و فنون سے استفادہ
۱۲۔ وسعتِ مطالعہ اور وسیع النظری

ادب کی ترجمانی اور تشریح و تجزیہ کا کام تنقید کی اولین ذمہ داری ہے اس کا یہی منصب تخلیقی اصناف کو سندِ دوام عطا کرتا ہے۔

☆ حیدر قریشی کے تنقیدی سرمائے کا تعارفی مطالعہ

حیدر قریشی کے دو تنقیدی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ **حاصل مطالعہ** (تنقیدی و تاثراتی مضامین)
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع ۲۰۰۸ء
۲۔ **تاثرات** (مضامین اور تبصرے)
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع ۲۰۱۲ء

ان دونوں کتابوں کے مندرجات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(الف) **حاصلِ مطالعہ** (تنقیدی و تاثراتی مضامین)

اس کتاب کے چھ ذیلی عنوانات ہیں:

۱۔ ابتدائیہ
۲۔ مابعد جدیدیت: اور عالمی صورتِ حال (مکالمہ)
۳۔ ماہیے پر مکالمہ (لوک گیت سے ادبی صنف تک)
۴۔ مختصر تبصرے، تاثرات
۵۔ ادب میں سرقہ اور جعلسازی
۶۔ چند وضاحتیں اور اصل ادبی مسئلہ

اس کتاب میں اڑتیس (۳۸) مضامین، دو مکالمے، سات تبصرے اور تاثرات، سرقہ اور جعلسازی پر تین مضامین اور ایک ادبی مسئلے کی وضاحت ملتی ہے۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر نذر خلیق کے نام ہے۔ کُل صفحات کی تعداد ۲۵۶ ہے۔ "حاصل مطالعہ" کے تمام مضامین اور تاثرات پاک و ہند اور دیگر ممالک کے ادبی رسائل و جرائد میں طبع ہو چکے تھے۔ اِن ادبی پرچوں کے نام یہ ہیں:

ماہنامہ ''کتاب نُما'' (دہلی)، مجلّہ ''ملینئیم اُردو کانفرنس'' (انگلینڈ)، ''اخبارِ اُردو'' (اسلام آباد) ''عکاس انٹرنیشنل'' (اسلام آباد) ماہنامہ ''تخلیق'' (لاہور) '' جدید ادب'' (جرمنی) ''اوراق'' (لاہور) ''شعروسخن'' (مانسہرہ) '' رابطہ'' (دہلی) ماہنامہ ''محفل'' (لاہور) سہ ماہی '' آواز'' (نیویارک) ماہنانہ ''پروازِ ادب'' (پٹیالہ) سہ ماہی '' تشکیل'' (کراچی) اور ماہنامہ ''شاہین'' (ڈنمارک) شامل ہیں۔

(۲) تاثرات (مضامین اور تبصرے)

یہ کتاب بھی چھ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے:

۱۔ عرض حال (دیباچہ)

۲۔ اپنی تخلیقات کے حوالے سے

۳۔ مختصر تبصرے اور تاثرات

۴۔ فیض احمد فیض

۵۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند

۶۔ ادب میں دراندازی

اس کتاب میں تئیس (۲۳) متفرق مضامین، اپنی تخلیقات کے حوالے سے تین وضاحتی مضامین، ۲۳ تبصرے اور تاثرات، فیض احمد فیض کے حوالے سے ۴ مضامین بشمول ایک تقریر، ڈاکٹر ستیہ پال آنند پر پانچ مضامین اور ادب میں دراندازی کے تحت چھے اختلافی اور تاثراتی مضامین شامل ہیں۔

کتاب کا انتساب ڈاکٹر شہناز نبی کے نام ہے۔ کل صفحات کی تعداد ۲۹۶ ہے۔ اس کتاب کے بیش تر مندرجات کم وبیش انھی ادبی رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔ جن کا ذکر ''حاصل مطالعہ'' کے ضمن میں آ چکا ہے تاہم کچھ مضامین شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور، سندھ کے ادبی جنرل ''الماس''، کلکتہ یونیورسٹی کے ادبی جنرل ''دستاویز''، روزنامہ ''ہمارا مقصد'' (دہلی) اور روزنامہ ''نادیہ ٹائمز (دہلی) میں شائع ہوئے تھے۔

(ج) دیگر تنقیدی مضامین کی تفصیل:

اِن دو مستقل تنقیدی تصانیف کے علاوہ کچھ تنقیدی مضامین ''اُردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں بھی مل جاتے ہیں، زیرِ نظر باب میں تمام مضامین کی موضوعاتی درجہ بندی کر کے زیرِ بحث لایا جائے گا تا کہ حیدر قریشی کا تنقیدی وژن نکھر کر سامنے آ سکے۔

(الف) حیدر قریشی کے اہم تنقیدی موضوعات کا مطالعہ

حیدر قریشی کے تنقیدی موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے ذیل میں اُن کے تفصیلی جائزے پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) اُردو زبان وادب اور مغربی ممالک

اُردو زبان وادب کی یہ خوش نصیبی رہی ہے کہ تقریباً ہر دور میں اسے امریکہ، کینیڈا اور یورپی ممالک میں کسی نہ کسی حوالے سے پذیرائی ملتی رہی ہے۔ دنیا کے ہر براعظم میں اُردو زبان کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اِن میں جاپان، چین، ترکی، بھارت، بنگلہ دیش، ایران، خلیجی عرب ممالک، روس، جرمنی، برطانیہ، اطالیہ، ناروے، سویڈن، ہالینڈ، ڈنمارک، آسٹریا، ماریشس، مصر، امریکہ اور آسٹریلیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حیدر قریشی گذشتہ دو دہائیوں سے جرمنی میں مقیم ہیں اسی لیے وہاں کی ادبی صورتِ حال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مغرب میں اُردو کے حوالے سے جو منظر نامہ تشکیل پاتا ہے۔ اُس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ٹی وی چینلز، ریڈیو اسٹیشنز کے ذریعے بول چال کی حد
> تک اُردو اپنے بولنے والوں سے بہت زیادہ منسلک
> ہے۔ ادبی تقریبات ، کانفرنسوں، سیمیناروں اور
> مشاعروں کے ذریعے بھی اُردو جاننے والوں کے لیے
> مجلسی رونق مہیا ہو جاتی ہے۔ یہ ادبی اور ثقافتی تقریبات
> اُردو کی بقا کے لئے کچھ نہ کچھ معاون ضرور ثابت ہوتی
> ہیں۔''(۸)

> ''امریکہ اور کینیڈا اسے خاص طور پر مفت اخبارات کی اشاعت
> کا ایک سلسلہ جاری ہے جو حیران کن بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔
> انگلینڈ سے بھی اخبارات کی اشاعت ہو رہی ہے۔ جہاں جسے توفیق
> ملتی ہے ادبی رسالہ نکال لیتا ہے۔''(۹)

یہ بظاہر خوش کن صورت حال ہے کہ دیارِ غیر میں اُردو کی وجہ سے گہما گہمی ہے، لیکن اُن کے فراہم کردہ زمینی حقائق کے مطابق امریکہ اور برطانیہ میں تارکینِ وطن کی جونئی پود سامنے آ رہی ہے وہ اپنی مادر بولی کو اور اُردو زبان کو آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے ہیں اور انگریزی ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا بن چکی ہے۔ برطانیہ میں مختلف سکیموں کے تحت اُردو پڑھنے والوں کو اضافی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں مگر اس طرف توجہ کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے حیدر قریشی یہ منطقی اور اُصولی نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> ''اگر برطانیہ میں اُردو کے لیے اتنی سہولیات ہونے کے
> باوجود یہاں سے پڑھ کر ۶۳ برسوں میں ایک بھی اُردو کا
> صحافی، ٹیچر یا ادیب پیدا نہیں ہو سکا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ
> اِن ملکوں میں اردو کا مستقبل پہلے سے موجود پرانے

شاعروں، ادیبوں تک محدود ہے، یا پھر جب تک
پاکستان اور انڈیا سے نئے تارکین وطن آتے رہیں گے تو
اُن کے ذریعے ہی اُردو کا نام لیا جاتا رہے گا۔''(۱۰)

حیدرقریشی نے جہاں اہلِ زبان کی بے توجہی کا ذکر کیا ہے وہاں تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان احباب کی اولاد کے برعکس برطانیہ اور جرمنی کے مقامی افراد اُردو سیکھنے میں زیادہ سرگرمی اور دل چسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) اور برطانیہ کے جنوبی ایشیائی مراکز میں ایسے شوقین ہر سال داخلہ لیتے نظر آتے ہیں۔

مغرب میں اُردو شعر و ادب کے ساتھ ایک زیادتی یہ بھی ہو رہی ہے کہ پاک و ہند کے بے شمار لوگ جو روزگار کے اعتبار سے خود مکتفی ہیں اور پہچان بنانے کیلئے شاعری کو زینہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ لوگ عروض سے آزاد شعر کہنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ یہی بے وزن شاعر اردو کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس پیسے کی فراوانی ہوتی ہے لہٰذا کچے پکے مجموعے بھی تواتر سے شائع کرواتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو بے وزن شعر کہنے کے بجائے پاک و ہند میں موجود پیشہ ور شاعروں سے پورے کے پورے مجموعے لکھوا کر شائع کروا دیتے ہیں۔ حیدرقریشی کے بقول:

''اس بیماری کی ذمہ داری بہر حال پاکستان اور انڈیا کے
اُن اُستاد شاعروں پر عائد ہوتی ہے جو ایک معقول رقم
لے کر نہ صرف پوری کتاب لکھ دیتے ہیں بلکہ کتاب چھپوا
کر اُس کی رونمائی کی تقریب تک کا پورا پیکیج فراہم
کرتے ہیں۔ یہ کاروبار افسوسناک حد تک بڑھتا جا رہا
ہے اور لوگ حقیقت جانتے ہوئے بھی جعلی شاعروں کی
پذیرائی کر رہے ہیں۔''(۱۱)

حیدرقریشی نے اس انداز کے تنقیدی جائزے مرتب کر کے اپنی تنقیدی بصیرت کا کینوس وسیع کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ایک مضمون ''ادب کی صورت حال'' میں یہ گلہ کیا تھا:

'' آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرے سے مخاطب
نہیں ہے۔ اس وقت ایک ایسا سناٹا ہے کہ جس میں
حرکت کا عمل بند سا ہو گیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ
معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی

تلاش اور زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش بھی
نظر نہیں آتی۔''(۱۲)

حیدرقریشی کی تنقیدات میں یہ گلہ کسی حد تک دور ہوتا نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے زبان و ادب کو تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو جس وسیع انسانی تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے اُس کی بدولت اُن کی تنقیدات سماجیات میں قابلِ قدر اضافہ کر رہی ہیں۔ اپنے دور کی سچائیوں اور منافقتوں کو معروضی انداز سے پرکھنا ناقد کی اولین ذمہ داریوں کا حصہ ہے۔ حیدرقریشی نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے۔ وہ شاعری میں موجود منفی رجحانات پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی دنیا کے اچھے شاعروں کا ذکر خلوص اور محبت سے کیا ہے اور اُن کی عمدہ تخلیقات کو سراہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''پہلی قسم جینوئن شعرائے کرام کی ہے جو اُردو ادب کے
مرکزی دھارے میں بھی اپنی ایک واضح شناخت رکھتے
ہیں۔ یورپ بھر میں موجود ایسے شعراء کی تعداد انگلیوں پر
گنی جا سکتی ہے۔''(۱۳)

اس طرح کے تجزیات و مشاہدات پیش کرنا حیدرقریشی کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس پر وہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ اس حق گوئی کی وجہ سے مغرب میں موجود اُردو مافیا کے لوگ انہیں پسند کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اُردو زبان و ادب کے اس المیے پر حیدرقریشی کے علاوہ ڈاکٹر جواز جعفری، افتخار نسیم، خالد خواجہ، اور شمس الرحمٰن فاروقی بھی اظہارِ خیال کر چکے ہیں لیکن حیدرقریشی نے تلخ حقائق کو جس بے باکی کے ساتھ طشت از بام کیا اُس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ''اُردو ادب، یورپ اور امریکہ میں'' میں اُردو مافیا کے متعلق بلیغ اشارے کیے ہیں۔ حیدرقریشی نے بھی اپنے دیگر متفرق مضامین میں اس موضوع پر اشارے کرنے کے علاوہ پانچ مستقل تنقیدی مقالات سپردِ قلم کیے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی معلومات اور اعداد و شمار حاصل کرنے کے لیے درج ذیل مضامین کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر (مشمولہ: حاصل مطالعہ)
۲۔ یورپی ممالک میں اردو شعر و ادب۔ایک جائزہ (مشمولہ: حاصل مطالعہ)
۳۔ مغربی ممالک میں اُردو کی صورت حال (مشمولہ: تاثرات)
۴۔ یورپ کی نو آباد اردو بستیوں میں اردو کا مستقبل (مشمولہ: تاثرات)
۵۔ مغربی ممالک میں اردو کی صورت حال (مشمولہ: تاثرات)

حیدرقریشی نے مغرب میں شاعری کے برعکس نثر کی صورت حال پر کسی قدر اطمینان کا اظہار کیا ہے:

''مغربی دنیا میں نثر میں لکھنے والے نسبتاً کم تعداد میں

ہیں، تاہم اُن میں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے
نثر نگاری کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ ثقافتی تصادم کی بعض
کہانیاں اُردو کی عمدہ کہانیوں میں شمار کی جاسکتی
ہیں۔‘‘(۱۴)

حیدرقریشی جائز تعریف وتحسین کا حق ضرور ادا کرتے ہیں اور جہاں ادبی جعل سازی کی مذمت کرنی ہو اُس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ وہ معیاری لکھاریوں کے کتابوں پر تعارفی دیباچے اور تبصرے تحریر کر کے اُن کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ یہ اُن کی متوازن تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مغرب میں اُردو مافیا کے موضوع پر اپنے انٹرویوز میں ان مسائل پر بہانگِ دھل اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔

(۲) تنقید نگاروں پر تبصرے اور تجزیے

اس حوالے سے حیدرقریشی کی درج ذیل چار تحریریں قابلِ توجہ ہیں، ان تبصروں کو ’’تاثرات‘‘ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ’’تاثر اور تنقید‘‘ عبدالرب اُستاد کے مضامین کا مجموعہ
۲۔ ڈاکٹر حامد اشرف کی تنقید نگاری
۳۔ نئے تنقیدی مسائل اور امکانات
۴۔ ڈاکٹر شہناز نبی کی تنقید نگاری

محولہ بالا تنقیدی مضامین میں حیدرقریشی نے دو خصوصی اہتمام کیے ہیں: اولاً زیرِ نظر تصنیف کا جامع تعارف اور ثانیاً متعلقہ تنقید نگاروں کے اندازِ نظر، فکر اور مزاج کی تشکیل کا اجمالی تجزیہ۔ البتہ کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیرِ مطالعہ کتاب پر تبصرہ کرنے کے دوران کچھ ایسے اشارے بھی کر جاتے ہیں جن سے لکھنے والوں کی تربیت بھی ہو جاتی ہے۔ ان اشاروں کا بڑا مقصد صاحبِ کتاب کو راست سمت پر ڈالنا ہے۔ مثلاً وہ اپنے تبصرے ’’ڈاکٹر حامد اشرف کی تنقید نگاری‘‘ میں رقم طراز ہیں:

’’وہ (ڈاکٹر حامد اشرف) ادب کو اُس کے مقامی پس
منظر اور مقامی موجود معیارات کی رُو سے پرکھتے ہیں۔
مجھے لگتا ہے کہ مغربی ادب کے معیارات سے مزید
واقفیت کے بعد وہ اپنے اسی مقامیت کے انداز کو عمدہ
طریق سے آگے بڑھا سکیں گے۔‘‘(۱۵)

آگے چل کر وہ اسی نکتے کو قدرے وضاحت سے بیان کرتے ہیں:

’’اب ضرورت ایسے ناقدین کی ہے جو مغربی ادب سے
بھی واقفیت رکھتے ہوں نئے عالمی تناظر سے بھی باخبر
ہوں اور ان سب کے ساتھ ادب کی اپنی مقامیت سے
ہی اپنی شناخت کو ظاہر کرسکیں۔‘‘(۱۶)

ایسے اصلاحی نکات بیان کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر پڑھنے والا اپنی انفرادی حیثیت میں عملاً مستفید ہوسکتا ہے۔ حیدرقریشی کی تنقید کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُن کے نمایاں پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہیں، مثلاً:

’’وہ (عبدالرب اُستاد) تاثر اور تنقید دونوں کو یکجا رکھتے
ہیں‘ بلکہ دونوں کی یکجائی سے ہی متوازن تنقید کا بہتر تاثر
سامنے آتا ہے۔‘‘(۱۸)

یہ حوصلہ بڑھانے والے کلمات ہیں۔ تنقید کا یہی ایجابی رویہ سماجی اور ثقافتی عناصر سے مل کر اپنی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔ حیدرقریشی جب کسی نقاد کے ہاں معیار و وقار کی کمی محسوس کرتے ہیں تو اُس کا اظہار اس قدر لطیف اور دھیمے پیرائے میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنی اصلاح بھی کر لیتا ہے اور بُرا بھی نہیں مناتا۔ ایک جگہ آپ کرامت علی کرامت کے تنقیدی طریقِ کار پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’وہ بعض اُمور میں کسی بہتر نتیجہ تک پہنچنے کی بجائے کہیں
آس پاس ہی رہ جاتے ہیں۔‘‘(۱۹)

اور اگر تعریف کرنی پڑے تو اُس کا اظہار بھی وضاحت سے کرتے ہیں۔ کرامت علی کرامت ہی کے بارے میں یہ رائے ملاحظہ ہو:

’’ادب کی تفہیم کیلئے اُن کا رویہ سمجھانے سے زیادہ سمجھنے کا
ہوتا ہے۔ فن پارے کے باطن تک رسائی کے لئے اپنی
پوری سوجھ بوجھ کو بروئے کار لاتے ہیں۔‘‘(۲۰)

حیدرقریشی دوسروں کی تنقید نگاری میں جہاں اعلیٰ اور معیاری خیالات کی تحسین کرتے ہیں وہاں کمزوریوں اور علمی لغزشوں کی نشاندہی کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اصل میں ادب اُن کے نزدیک محض وقت گزاری کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ تہذیبی و ثقافتی ذمہ داری کا حصہ ہے۔ وہ ادب کو ایک ایسی سماجی دستاویز خیال کرتے ہیں جس میں کسی قسم کی کمی کوتاہی‘ کمزوری اور اخلاقی گراوٹ قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

حیدرقریشی نے تنقید نگاروں پر جو مضامین یا تبصرے لکھے اُن میں برتاؤ(Treatment) کے مختلف انداز نظر آتے ہیں

جیسا کہ ''ڈاکٹر شہناز بنی کی تنقید نگاری'' پر جو مضمون لکھا گیا اُس میں متعلقہ کتاب کے اہم اقتباس نقل کرنے کے علاوہ کمزوریوں کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے اور اپنی منصفانہ تنقیدی رائے دینے کے بعد اُسی کتاب کے موضوعات پر نئے علمی سوالات بھی اٹھائے ہیں۔ ڈاکٹر شہناز نبی نے اپنی کتاب ''تانیثی تنقید'' میں سجاد ظہیر، اکبرالہ آبادی اور فراق گورکھپوری کی شخصیات کو اُن نفسی رویوں کی مدد سے جانچنے پرکھنے کی کاوش کی ہے جو وہ عورت کے بارے میں رکھتے تھے۔ حیدر قریشی ان تجزیات پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تینوں مضامین ادبی دل چسپی کے حامل ہیں۔ سجاد
ظہیر پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر شہناز نبی کا خود ترقی پسند ہونا
آڑے آیا ہے۔ سجاد ظہیر کی ترقی پسندی کا لحاظ کرتے
ہوئے ہلکی گرفت کی گئی ہے۔ فراق گورکھپوری کے عشقیہ
پس منظر کو انہوں نے سادھو والی نظر سے دیکھا ہے۔ جبکہ
اکبرالہ آبادی کے معاملے میں تو سادھو سے ایک قدم
آگے بڑھ کر سچ مچ کھال اُتارنے والا کام کردیا
ہے۔'' (تاثرات:ص۱۰۳)

یہ تنقیدی رائے صاف شفاف اور کھرے مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک انداز میں محاکمہ کرنا کوئی آسان بات نہیں کیوں کہ اس کی وجہ سے باہمی تعلقات پر منفی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں، لیکن حیدر قریشی نے ادبی قدروں اور علمی دیانت کو ذاتی تعلقات پر قربان نہیں ہونے دیا۔ انگریزی ادب کے معروف نقاد ٹی۔ ایس ایلیٹ نے بھی اُن نقادوں کی مذمت کی ہے جو تنقید کو ایک غیر سنجیدہ سرگرمی قرار دیتے ہیں۔ ایلیٹ اپنے مضمون ''تنقید کا منصب'' میں لکھتے ہیں:

''ہمارے بیش تر نقاد بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی
لعنت میں مصروف ہیں۔ وہ صلح کرنے میں' لیپا پوتی
کرنے میں' معاملہ کو دبانے میں' تھپکنے میں' نچوڑنے
میں' بات بنانے میں' خوشگوار مسکن تیار کرنے میں اور
بہانہ سازی میں مصروف ہیں۔'' (۲۱)

حیدر قریشی اگر چاہتے تو وہ بھی روایتی اور پیشہ ور نقادوں کی طرح خوشامدی تنقید کے تاج محل کھڑے کر سکتے تھے مگر وہ ایلیٹ ہی کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے وہی بات لکھنا پسند کرتے ہیں جو مبنی برحق ہے۔ ایلیٹ رقم طراز ہے:

''تنقید کرنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ فن پارے کی توضیح
اور اصلاحِ مذاق کا کام انجام دے۔'' (۲۲)

حیدر قریشی کی آگہی اور ژرف نگاہی کا حسن یہی ہے کہ وہ غیر جانب داری سے فن پارے کے مالہ اور ماعلیہ کا تجزیہ کر کے اُردو ادب میں صحت مندانہ تنقیدی رجحانات کو فروغ دے رہے ہیں۔

(۳) افسانوی مجموعوں پر اظہارِ رائے

حیدر قریشی بذات خود ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے ''روشنی کی بشارت'' اور ''قصے کہانیاں'' نئی بیانیہ تکنیک اور جدید طرزِ احساس پر مبنی ہیں۔ وہ اس صنف کے تخلیقی اور تنقیدی دونوں مظاہر میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی دونوں کتابوں یعنی ''تاثرات'' اور ''حاصلِ مطالعہ'' میں تقریباً بارہ افسانہ نگاروں کے مجموعوں پر تنقیدی آرا کا اظہار کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں ہمت رائے شرما' منشا یاد' عذرا اصغر' فردوس حیدر' جوگندر پال' دیویندر اسر' نعیمہ ضیاء الدین' عبداللہ جاوید' شہناز خانم عابدی' ڈاکٹر بلند اقبال' رضیہ اسماعیل اور خورشید اقبال شامل ہیں۔

حیدر قریشی نے افسانوی تنقید میں تخلیقی اظہارِ خیال' فنی اُسلوب' تکنیک' تازہ کاری اور روشن خیالی پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔ ثقہ بند نقادوں کے برعکس وہ اپنی رائے سادہ اور پُر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کا اُسلوب بے جا لفاظی اور بناوٹ سے یکسر پاک ہے۔ تعقل پسندی اور بے باکی کے باعث اُن کی تنقیدی آرا خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن کی تنقیدی رائے کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''ہمت رائے شرما کے افسانوں میں مقصد کو بے شک
فوقیت حاصل ہے تاہم اُن میں ادبی رنگ شامل ہے۔
کہیں کہیں انہوں نے طویل ڈائیلاگ کے ذریعے
حصولِ مقصد کے لیے راہ ہموار کی ہے تو کہیں طنز مزاح
سے کام لے کر درد کی شدت کو کم کرنے کی کاوش کی
ہے۔'' (۲۳)

حیدر قریشی انداز بدل بدل کر رائے دینے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً جوگندر پال کے افسانوی مجموعے ''بے ارادہ'' پر بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

'' ''بے ارادہ'' کے افسانوں میں تجریدی اور علامتی
لہریں بھی ہیں' ناسٹلجائی صورتِ حال بھی ہے' اساطیر کے
اثرات بھی ہیں لیکن اِن سب کے باوجود اُن پر انتظار

حسین، انور سجاد، یا رشید امجد کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر
نہیں آتی۔ اُن کے سارے موضوعات اُن کے اپنے
مخصوص تخلیقی انداز میں ہی کہانی کا روپ دھارتے
ہیں۔'' (۲۴)

دوسروں پر تنقیدی رائے دیتے ہوئے گیان کا ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے جب وہ فنِ افسانہ نگاری پر اپنا دلی یا نظری موقف بھی وضاحت سے بیان کرنے لگتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

'' جدید افسانہ عرفانِ ذات اور اظہارِ ذات کی ایک ارفع
صورت ہے۔ ذات جو کسی مخصوص سماج سے وابستہ
ہونے کی بجائے کُل کائنات پر محیط ہے۔ بہت کم فنکار
ایسے ہیں جنہوں نے ذات کی غواصی کے نتیجے میں اپنے
عرفان کے لمحوں کو اظہار کی کامیاب صورت بھی
دی۔ بہت سے تو محض اپنی ذات کے ساحل پر کھڑے
لہروں کو گننے کی ناکام کوشش کرتے رہ گئے۔'' (۲۵)

حیدر قریشی کا یہ اظہاریہ تخلیق کار کو نئے تجربات کی جانب مائل کرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح کی آراء ادب کی نئی صورتِ حال کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہیں۔ یہ تنقید نظریے کی آمریت دور کر کے افسانہ نگاروں کو تخلیقی آسودگی عطا کرتی ہے۔ اصل میں ادب کو زندگی سے قریب کرنا ہی تنقید نگار کا اصل کمال ہوتا ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''زندگی کی طرح فن میں بھی حقائق سے آنکھیں چرانا
خطرناک ہے۔'' (۲۶)

حیدر قریشی کا تنقیدی نظام قاری، متن اور تخلیق کار کے مابین تعلق کو وسعت اور پائیداری عطا کرتا ہے۔ یہ اُن کے ہمدردانہ فہم کا کرشمہ ہے کہ وہ زیرِ نظر تصنیف یا مصنف کو دریافت کرنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ گذشتہ کچھ عرصے سے اُردو فکشن میں پوپ کہانیوں کا تذکرہ سننے میں آرہا ہے۔ حیدر قریشی کو بھی مقصود الٰہی شیخ نے اپنی کتاب ''پوپ کہانیاں'' عنایت کی تھی، ابھی وہ اس کا مطالعہ کر رہے تھے کہ رضیہ اسماعیل کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' تک رسائی حاصل ہوگئی۔ یہ کتاب بھی پوپ کہانیوں پر مشتمل تھی۔ جب ان دونوں تخلیق کاروں سے اس نئی صنف کے حدود و ثغور کے بارے میں استفسار کیا گیا تو کوئی تسلی بخش جواب حاصل نہ ہو سکا۔ خصوصاً رضیہ اسماعیل سے اُن کی جو گفتگو رہی وہ بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی کیونکہ اس نو وارد صنف سے متعلق جو معلومات

فراہم ہوئیں اور جن اوصاف کو نمایاں کیا گیا اُن میں کوئی خاص نئی بات نہیں تھی، بقول حیدر قریشی:

''ان اوصاف کی تو تخلیقی ادب کی تمام اصناف میں ایک
جیسی اہمیت اور حیثیت ہے۔'' (۲۷)

گویا شیخ صاحب اور رضیہ اسماعیل نے جو باتیں بیان کیں اُن کی عمومی حیثیت ہی بنتی ہے جبکہ کس صنف کی وضاحت اور دوسری اصناف سے اُسے ممتاز و ممیّز کرنے کیلئے ٹھوس منطقی دلیل درکار ہوتی ہے۔ حیدر قریشی نے اس صنف پر جو ادبی اور علمی سوال اُٹھائے ہیں اُن کا جواب ابھی تک کسی جانب سے موصول نہیں ہوا۔ وہ دو علمی سوال یہ ہیں:

'' (۱) پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟
(۲) جس طرح افسانچہ، افسانہ، ناولٹ اور ناول کی
پہچان بالکل سامنے کی بات ہے اور قابلِ فہم ہے، اس
طرح پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانہ سے کس طرح الگ
پہچانا جا سکتا ہے؟ کسی مابہ الامتیاز اور کسی تخصیص کے بغیر
پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانے سے الگ کر کے کیونکہ
دیکھا جا سکتا ہے؟'' (۲۸)

''پوپ کہانی'' کا مسئلہ بھی نثری نظم کی طرح اُلجھا ہوا ہے۔ دونوں کی اصل جنس دریافت کرنا سرِ دست مشکل ہے۔ حیدر قریشی اگر چاہتے تو وہ اس صنف پر گول مول بات کر کے آگے نکل سکتے تھے، لیکن وہ ادبی دیانت سے کام لیتے ہوئے اس صنف کے اصل خال و خط دریافت کرنے پر زور دیتے رہے۔

(۴) معاصر ناول پر تنقیدی نظر

حیدر قریشی نے خود تو کوئی ناول نہیں لکھا لیکن اس صنف سے اُن کی بھرپور دلچسپی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ اپنے دونوں تنقیدی مجموعوں میں اُنھوں نے اپنے عہد کے سات ناولوں پر اظہارِ رائے کیا ہے۔ اگر جرمن کلاسیک کے ناول ''سدھارتھ'' کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ اپنی تنقیدی تحریروں میں وہ ناول کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ ناول کی آفاقیت پر آلِ احمد سرور کی رائے کا حوالہ ضروری ہے:

''ناول تہذیب کا عکاس، نقاد اور پاسبان ہے۔ کسی ملک
کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کی
شاعری سے ہوتا ہے مگر اُس کی تہذیب کی روح اُس کے
ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔'' (۲۹)

حیدرقریشی کے ناولوں پر لکھے گئے تبصرے پڑھ کربھی قاری جان جاتا ہے کہ وہ ناول کی تہذیبی وثقافتی قوت سے پوری طرح باخبر ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا جائزہ انھوں نے دس صفحات میں مکمل کیا ہے۔یہ مضمون ''حاصل مطالعہ'' کے صفحہ ۱۶۵ سے ۱۷۴ تک پھیلا ہوا ہے۔حیدرقریشی کو اندازہ تھا کہ اُن کے قارئین نے یہ ناول شاید نہ پڑھا ہو،لہٰذا اپنے مضمون کی ابتداء میں تمام ناول کا ایک مربوط اور پُر اثر خلاصہ پیش کرنے کے بعد اپنے تجزیات پیش کیے ہیں۔اس خلاصے میں مرکزی کرداروں کو بڑی ہنرمندی سے متعارف کرایا گیا ہے۔اس کے بعد ناول کے محاسن ومصائب پر تفصیلی گفت کی ہے۔ناول میں موجود زمانہ ۱۷۹۱ء سے شروع ہوکر ۱۸۵۶ء تک اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔شمس الرحمان فاروقی نے اس عہد کے اصل تہذیبی اور ثقافتی حوالوں کو محفوظ اور پُر اثر بنانے کیلئے اُس عہد کی زبان کو زندہ کر دکھایا ہے۔یہ بظاہر خوبی ہے لیکن حیدرقریشی کا تجزیہ اسے کس اور زاویے سے دیکھتا ہے:

''ناول کی یہ خوبی اُس کی کمزوری یا خامی بھی بن گئی ہے۔
مسئلہ یہ ہے کہ عام قارئین کو تو چھوڑ دیں' خود اُردو کے
شاعروں اور ادیبوں میں کتنے لوگ ہوں گے جو اس
زبان کو ناول کی مطلوبہ روانی کے ساتھ پڑھ سکیں؟ بہت کم
'بہت ہی کم۔''(۳۰)

اس مشکل پسندی کا گلہ کرنے کے بعد وہ اس کے رجائی پہلو کو بھی اُجاگر کرتے ہیں:

''یہ خامی اور خوبی ایک دوسری سطح پر اہلِ ادب کے لیے
چیلنج بھی بنتی ہے کہ وہ اس ناول کے ذریعے اُردو کی بنیاد
تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''(۳۱)

ناول کے فنی اوصاف پر بات کرتے ہوئے وہ اس کی منظرکشی تہذیبی وثقافتی مظاہر'لوگوں کی عادات' وفاداریوں اور غداریوں کے بیان کو سراہتے ہیں' نیز جزئیات نگاری کی تعریف دل کھول کر کرتے ہیں:

''زبان کی مشکلات سے ہٹ کر مجھے اس ناول میں شمس
الرحمان فاروقی کی جزئیات نگاری نے حیران کیا ہے۔
انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کی انہوں نے
جس عمدگی کے ساتھ تصویرکشی کی ہے اور ہر سطح پر جزئیات
کو جس طرح مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے اُسے ان
کے فن کا کمال کہا جاسکتا ہے۔''(۳۲)

اس جزئیات نگاری کی مزید پرتیں کھولتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''جنسی عمل کی منظرکشی میں شمس الرحمان فاروقی کی
جزئیات نگاری کی مہارت اپنے کمال پر دکھائی دیتی
ہے۔اگر انہوں نے ناول کو آج کے عہد کی اردو میں لکھا
ہوتا تو صرف جنسی جزئیات نگاری کے باعث ناول
ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا۔''(۳۳)

یہ حیدرقریشی کے ذہن اور قلم کی پختگی کا ثمر ہے کہ وہ میانہ روی اور اعتدال پسندی کے عناصر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔اگر کمزور پہلوؤں پر بات کرنی ہو تو وہاں بھی اُن کا قلم توازن کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا' اور اگر تعریفی کلمات کا استعمال کرنا ہو تو پھر بھی اپنے قلم کو گرفت میں رکھتے ہیں۔اختصار اور وضاحت کا یہ عالم ہے کہ اکثر وبیشتر اُن کے ابتدائی جملے پڑھ کر ہی پورے ناول سے آگاہی حاصل ہوجاتی ہے۔صلاح الدین پرویز کے تازہ ناول ''ایک دن بیت گیا'' کے آغاز ہی میں یہ بتادیتے ہیں:

''بنیادی طور پر یہ ناول ٹوٹتی ہوئی انسانی قدروں اور اور گم
شدہ کلچر کا نوحہ ہے جسے آج کے مشینی اور سائنسی ماحول
نے ہڑپ کرلیا ہے۔''(۳۴)

نورالحسن نقوی اپنی تصنیف ''فن تنقید اور اُردو تنقید نگاری'' میں رقم طراز ہیں:

''بھرپور اور کامیاب تنقید وہ ہے جو کسی ادبی وفنی کارنامے
کو کسی ایک عینک اور کسی مخصوص زاویے سے نہ دیکھے بلکہ
جتنے وسائل اور جتنے طریقے ممکن ہیں اُن سب کو استعمال
کرے۔''(۳۵)

حیدرقریشی کی تنقید میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔اُن کا تنقیدی مزاج تامل وتفکر' توازن وسنجیدگی اور صلابتِ رائے کا مظہر ہے۔وہ فن پارے کے محرکات وموثرات کی تہہ میں اُترنے کی کوشش کرتے ہیں اور مشکل مقامات اور علامات کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے اپنا تنقیدی فریضہ ادا کرتے ہیں۔ناول ''ایک دن بیت گیا'' میں وہ اُن اہم علامتوں کو معنی دینے کی سعی کرتے دکھائی دیتے ہیں جو پورے ناول میں بکھری ہوئی ہیں اور اگر ان کی تفہیم ہوجائے تو مرکزی خیال کی ترسیل بآسانی ہوجاتی ہے۔یہ انداز ملاحظہ ہو:

''راجہ جبریت کی علامت ہے اور گورو جی اس جبر کی
کھوکھلی روحانیت کے حوالے سے تحفظ کی علامتِ اس

جبریت نے جہاں انسانوں کو غلام بنایا ہے وہاں فن
کاروں کو بھی قید کر رکھا ہے۔شاعر،سنگتراش،موسیقار اور
مورخ،سیاح،فنکارانہ دانش کی علامتیں ہیں جنہیں راجہ
نے قید کر رکھا ہے۔"(۳۶)

تنقید کا یہ تشریحی اور تحلیلی انداز فن پارے کی پیچیدہ گرہیں کھولتا ہے۔اس نوع کی تشریح کا اصل فائدہ قاری کو پہنچتا ہے کیونکہ وہ اِن وضاحتی اشاروں کی مدد سے ناول کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔تنقید نگار کا کام بھٹکانا نہیں بلکہ راستہ دکھانا ہے۔حیدر قریشی نے اس کے علاوہ جن ناولوں پر بات کی ہے اُن میں جوگندر پال کے دو ناول "پار پرے" اور "نادید"، آر۔کے نیازی کا ناول "کسک" ترنم ریاض کا "مورتی" ثریا شہاب کا "سفر جاری ہے" دیویندر اسر کا "خوشبو بن کے لوٹیں گے" اور صادقہ نواب سحر کا ناول "کہانی کوئی سناؤ متاشا" شامل ہیں۔"تاثرات" میں جرمن ناول نگار ہرمن ہیسے کے ناول "سدھارتھ" پر تفصیلی مطالعہ بھی ملتا ہے۔حیدر قریشی نے اس ناول کے مرکزی خیال کو روایتی تصورات سے ہٹ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) سفرناموں پر مختصر تبصرے اور تاثرات

حیدر قریشی اصلاً ایک ہمہ جہت ادیب ہیں اُن کا تخلیقی اور تنقیدی سرمایہ متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ادبی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے اُن کی تنقیدات میں بھی موضوعاتی اصناف اور اسالیب کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔"حاصل مطالعہ" اور "تاثرات" میں تین ادیبوں کے چار سفرناموں کا تنقیدی احوال ملتا ہے:

۱۔ جمیل زبیری

"دھوپ کنارا" اور "موسموں کا عکس" (مشمولہ: حاصلِ مطالعہ)

۲۔ ہمت رائے شرما

"میاں آواز کا سفرنامہ" (مشمولہ: حاصلِ مطالعہ)

۳۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

"ابن بطوطہ کے خطوط" (مشمولہ: تاثرات)

حیدر قریشی جمیل زبیری کے دونوں سفرناموں کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

"دھوپ کنارہ" اُن کے امریکہ اور کینیڈا کے سفر کی روداد
ہے جب کہ "موسموں کا عکس" بھارت کے سفر کی کہانی
ہے۔بظاہر یہ دو انتہاؤں کے سفر ہیں، ایک مغرب کی
طرف ایک مشرق کی طرف، لیکن اِن میں انسانیت کا

دُکھ قدرِ مشترک ہے۔"(۳۷)

اب اِن سفرناموں پر اُن کی تجزیاتی رائے ملاحظہ ہو:

"جمیل زبیری نے انسانوں کو کسی جغرافیائی، نسلی یا مذہبی
امتیاز کے متعصّبانہ زاویے سے دیکھنے کی بجائے صرف
انسانی قدروں کی سچی بنیاد پر دیکھا ہے۔پھر وہ کسی کا دکھ
تھا یا اُن کا اپنا دکھ تھا انہوں نے اُس دُکھ کو اپنے دل میں
سجالیا ہے۔(۳۸)

محض چند سطروں میں پوری کتاب کا تعارف وخلاصہ اور تجزیہ پیش کرنا حیدر قریشی کی تنقید کا خاصہ ہے۔حامد اللہ افسر،نقاد کے فرائض بیان کرتے ہوئے اپنی تصنیف "تنقیدی اُصول اور نظریے" میں رقم طراز ہیں:

"نقاد کا سب سے پہلا فرض بے لوث ہونا ہے۔اُس پر
لازم ہے کہ وہ زیرِ تنقید تصنیف پر مکمل طور پر عبور حاصل
کرلے۔اُس کے مقصد کی ترجمانی کرے۔اُس کی اہم
ترین خصوصیات اور اُس کے محاسن کا تجزیہ کرے۔اس
امر کو واضح کرے کہ اس تصنیف میں کیا چیز ایسی ہے جو
مستقل اور باقی رہنے والی ہے اور کیا چیز مستقل اور عارضی
ہے۔"(۳۹)

حیدر قریشی کے ہاں اِن خصوصیات کا مشاہدہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔وہ جس سہولت،اعتماد،خلوص اور عالمانہ اُسلوب میں تصنیف پر بات کرتے ہیں اُس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اُنھوں نے متعلقہ کتاب کی محض ورق گردانی نہیں کی بلکہ دورانِ مطالعہ اُس فن پارے کا دقتِ نظر سے تجزیہ بھی کرتے رہے ہیں۔اُن کی تنقید قاری اور فن پارے کے درمیان ترجمانی کا فریضہ ادا کرتی ہے۔اُن کی تنقید خالص محاسن اور خالص مصائب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس کے برعکس وہ اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں ایک غیر جانب دارانہ تجزیہ اور تشریح پیش کرنا زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں۔اُن کی تنقیدی بصیرت کا سیاق وسباق ہر فن پارے میں ایک نئے انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔وہ اپنی تنقید کے ذریعے تخلیق کار کی انفرادیت اجاگر کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔یہ مثال ملاحظہ ہو:

"جمیل زبیری کی خوبی کہ اُنہوں نے کسی سفرنامہ نگار کے
شوخ اُسلوب کی نقالی نہیں کی بلکہ وہ اپنے سادہ اور
معصومانہ اُسلوب میں سفرنامہ لکھا ہے۔"(۴۰)

حیدرقریشی ایک محنتی طالبِ علم کی طرح اصل تنقیدی مواد کی جستجو کرتے ہیں' اپنی بصیرت و بصارت کی روشنی میں اُس کا تجزیہ کرتے ہیں اور حاصل شدہ نتائج کو نہایت عاجزی کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔اس انداز میں نہ تو خود ستائشی کا کوئی پہلو نکلتا ہے اور نہ حتمیت کا شائبہ دیکھنے میں آتا ہے۔

اُردو سفر نامے کا باضابطہ اور باقاعدہ آغاز اُنیسویں صدی کے وسط میں ہوا تھا، ابتدا میں اس پر فارسی اور ترکی کے اثرات حاوی رہے اور انھی ارتقائی مراحل میں انگریزی سفر نامہ بھی اُردو پر اپنے مثبت اثرات مرتب کرنے لگ گیا تھا۔اُردو زبان کا پہلا سفر نامہ یوسف حلیم خان کمبل پوش کا ہے جو ۱۸۴۷ء میں بعنوان ''عجائبات فرنگ'' طبع ہوا۔ اس میں برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کا ذکر ہے۔اس کے بعد کے سفر ناموں میں یہی یورپی منظر نامہ نظر آتا ہے ۔حیدر قریشی نے جن سفر ناموں پر قلم اُٹھایا وہ بھی اتفاقاً اسی قبیل کے ہیں۔اُن کے تنقیدی مجموعے ''تاثرات'' میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے سفر نامے ''ابن بطوطہ کے خطوط'' کا حال درج ہے جو قاری کی معلومات میں خوشگوار اضافہ کرتا ہے۔

حیدر قریشی کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق یہ سفر نامہ ہالینڈ' جرمنی' فرانس' برطانیہ' امریکہ اور ترکی کے اسفار پر مشتمل ہے۔یہ سفر ۸/جولائی ۲۰۰۷ء سے لیکر ۲۹/اگست ۲۰۰۷ء تک کے سفری حالات کا بیانیہ ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اس سے قبل بھی سفر نامے تحریر کر چکے ہیں۔لیکن اِس سفر نامے کا اُسلوب یکسر منفرد ہے۔ یہ سفر نامہ مکتوبی اُسلوب میں لکھا گیا ہے۔اصل میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے دورانِ سفر اپنے دوستوں کو جو مکاتیب لکھے تھے بعد ازاں اُنھی مکاتیب کو سفر نامے کی شکل دی گئی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا تجربہ ہے، اسے مکتوبی سفر نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

سفر نامے کے مندرجات پر تبصرہ کرتے ہوئے حیدر قریشی لکھتے ہیں:

> ''اس سفر نامے میں متعلقہ ممالک کے بارے میں اعداد و شمار والی معلومات سے زیادہ ڈاکٹر اعوان کے ذاتی تجربات' مشاہدات نے سفر کی روداد کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ انہوں نے مغربی ممالک کے خوب صورت اور قابلِ تقلید رویوں کو بھی اجاگر کیا ہے اور اِن معاشروں کے منفی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔''(۴۱)

محولہ بالا اقتباس میں اُسلوب کی سادگی اور عمیق تجزیات کا رچاؤ پڑھنے والوں پر خوش گوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ عام فہم اندازِ تنقید، تفکر و تعقل کے تمام وسائل ساتھ رکھتا ہے۔تنقید کا یہ آہنگ صاحبانِ بصیرت کی نگاہوں میں معتبر ٹھہرے گا۔حیدر قریشی کی تنقید اصل میں اُن کے تخلیقی عمل ہی کا ایک زاویہ ہے اور قاری کے ذوق کی آبیاری بھی

کرتا ہے۔

(۶) تحقیقی کاموں کا محاکمہ

حیدر قریشی کے فکری نظام میں تحقیق و تفتیش کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔اس تحقیق کے اولین نقوش اُن تحریروں میں بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں ماسوائے کے تکنیکی اور فنی خدوخال کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ بحیثیت محقق اُن کے ہاں تاریخی تحقیق' بیانیہ تحقیق' تجزیاتی تحقیق اور موضوعاتی تحقیقی کے عناصر باہم دگر نظر آتے ہیں''حاصل مطالعہ'' میں ایک قلمی نسخے کا تعارف جس تحقیقی اُسلوب میں پیش کیا اُس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا حیدر قریشی کا اصل شعبہ تخلیقی ادب ہے یا تحقیق ہے! یہاں وہ ایک منجھے ہوئے محقق کی مانند تمام حالات کے صغرے کبرے ملاتے نظر آتے ہیں۔ یہ قلمی نسخہ خان پور کے ایک گمنام شاعر محسن خان پوری کا لکھا ہوا ہے۔ حیدر قریشی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ قلمی نسخہ اصل میں دیوانِ ریختی ہے جو ''مثنوی قہرِ عشق'' کے نام سے مرتب ہوا تھا۔اس نسخے کا دیباچہ دس صفحات پر مشتمل ہے جس میں شاعر نے دیوانِ ریختی کی وجہِ تالیف پر روشنی ڈالی ہے۔حیدر قریشی نے متعلقہ دیباچے کے اہم نکات کو یکجا کر کے پیش کر دیا ہے جس کی وجہ سے عام قاری یا محقق آزادی سے اپنی انفرادی رائے قائم کر سکتا ہے۔حیدر قریشی کا یہ تجزیاتی مضمون ''اوراق گم گشتہ'' کے نام سے ''حاصل مطالعہ'' کی زینت بنا تھا۔داخلی شواہد کی مدد سے اُنھوں نے اس شاعر کی دیگر تصانیف بھی کھوج نکالی تھیں ان میں ''ڈالی'' اور ''خوابِ سرشار'' کا سراغ شامل ہے۔تاہم ''مثنوی قہرِ عشق'' کا زمانۂ تالیف کا ہنوز تعین نہیں ہو سکا۔البتہ اُن کی درج ذیل محققانہ رائے آنے والے محققین کو راستہ دکھائے گی:

> ''سرورق سمیت اس دیوانِ ریختی کے کل صفحات ۱۱۲ ہیں۔ دیوانِ ریختی کے اس مطالعے سے اگرچہ مضحک تضادات کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں تاہم...... اس کے مطالعے سے ہمیں لکھنؤ کے گھروں' گلیوں اور بازاروں کی زبان سے آگاہی ہوتی ہے۔اُس دور کے مشاعراتی ماحول کا پتہ چلتا ہے جو بے شک اِس وقت خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن اُس وقت یہ ساری مضحکہ خیزیاں تہذیب اور ادب آداب کا اہم حصہ تھیں۔''(۴۲)

یہ نئے حقائق کی جستجو ہے۔حیدر قریشی کی تنقید کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ موضوع کی اہمیت اور افادیت پر حتی المقدور توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اُن کے اخذ کردہ نتائج تشریح و تعبیر کے مراحل سے گزر کر قاری تک

پہنچتے ہیں۔ تحقیق وتنقید اُن کی کوئی جز وقتی سرگرمی نہیں ہے بلکہ اُن کے تخلیقی عمل اور فکری نظام کا مضبوط ستون ہے۔
ڈاکٹر رشید امجد نے جب اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں چھپ جانے کے بعد حیدر قریشی کو تبصرے کے لیے ارسال کیا تو انھوں نے اس مقالے (میرا جی، شخصیت اور فن) کا تنقیدی جائزہ دس صفحات میں لیا ہے۔ یہ تجزیہ سادہ وسلیس زبان اور فطری اُسلوبِ نگارش کا عکاس ہے۔ دورانِ تنقید وہ اپنی نثر کو ہر قسم کے آرائشی عناصر اور صنائعی سے دور رکھتے ہیں۔ اس مقالے کے کل سات ابواب ہیں۔ وہ پہلے تمام مقالے کا وضاحتی خلاصہ پیش کرتے ہیں پھر ہر باب کے اہم نکات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی معلومات بھی پیش کر دیتے ہیں، یہ نئی فراہم کردہ معلومات موقع محل کی مناسبت سے درج ہوئی ہے اور بے ساختہ انداز سے اُن کے تنقیدی عمل کا حصہ بنتی گئی ہے۔ یہی بے ساختگی اُن کے ہر تنقیدی تبصرے یا مضمون میں ملائمت اور لطافت کا باعث بنتی ہے۔ اکثر چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں، مثلاً:

''میرا جی کی تنقیدی بصیرت اُن کی تنقیدی آراء سے
عیاں ہے۔''(۴۳)

اس کے علاوہ اگر ڈاکٹر رشید امجد کی کسی بات یا اقتباس کو نقل بھی کیا ہے تو بہت سوچ سمجھ کر اور ایسے جملوں کو باقاعدہ واوین میں رکھ کر بات آگے بڑھائی ہے تاکہ قاری کسی قسم کے مغالطے کا شکار نہ ہو۔ اُن کے تجزیات بھی نپے تلے اور مقالے کے مندرجات کو روشن کرنے والے ہیں۔ اُردو زبان کے معروف نقاد محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''تجزیے میں عقلی اور فکری عناصر کی شمولیت لازمی
ہے''(۴۴)

حیدر قریشی نے اس میں جذبے کی صداقت شامل کر کے مزید وسعت دے دی ہے۔

(۷) سوانحی ادب پر نقد ونظر

سوانحی ادب میں خود نوشت، سوانح عمری، یادنگاری، خاکہ نگاری، آپ بیتی، روزنامچہ نگاری اور مکتوب نگاری شامل ہے۔ اس کا شمار قدیم اصناف میں ہوتا ہے حتیٰ کہ قدیم ہند، روم، چین اور یونانی ادب میں بھی شخصی اور سوانحی مرقعے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت'' میں اس صنف کے لوازم پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''سوانحی ادب میں تین بنیادی عناصر تاریخیت، فرد یا شخص
کو مرکزی اہمیت اور ادبیت کا پایا جانا بے حد ضروری
ہے۔ ادبیت ہی سوانحی ادب کو تاریخ سے الگ کرتی
ہے۔ محض واقعات کی کھتونی اور فردِ واحد کے حالات

واقعات کا خشک انداز میں تحریری مواد سوانحی ادب نہیں
ہے''۔(۴۵)

سوانحی ادب میں اصل حقائق پر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور اُس کی ادبیت اور زندگی آمیز اُسلوب نگارش اس صنف کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہیں۔ معیاری سوانحی معلومات کو تاریخی، سماجی وثقافتی، نفسیاتی، اخلاقی اور جمالیاتی سطحوں پر پرکھا جا سکتا ہے۔
حیدر قریشی نے اس صنف پر بھی توجہ کی ہے اور دلچسپی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے، اس خصوص میں اُن کی درج ذیل تحریریں اہمیت رکھتی ہے:

۱۔ تمنا بے تاب (مشمولہ: حاصلِ مطالعہ)
۲۔ یادخزانہ (مشمولہ: حاصلِ مطالعہ)
۳۔ جست بھر زندگی (مشمولہ: حاصلِ مطالعہ)
۴۔ آزاد خاکے (مشمولہ: حاصلِ مطالعہ)

اُن کے دوسرے تنقیدی مجموعے ''تاثرات'' میں اس حوالے سے کوئی تحریر شامل نہیں ہے۔ سوانحی ادب پر اُن کے تاثرات وتبصرے ثروتِ فکر کی تازگی اور شادابی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کی یادنگاری پر مشتمل کتاب ''تمنا بے تاب'' پر نقد ونظر کرتے ہوئے اُس کی تکنیکی صورتِ حال کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''بلاشبہ اس خودنوشت کی حدیں کہیں خودنوشت کی مقرر و
معین حدود سے باہر تک جاتی ہیں اور کئی مقامات پر معین
حدود سے بھی کہیں اندر تک سمٹی ہوئی دکھائی دیتی
ہیں۔''(۴۶)

کتاب کے اصل موضوع کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

''اس کتاب کے مطالعے سے ایک طرف رشید امجد کی
ذاتی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف ہوتی ہے تو
دوسری طرف راولپنڈی، اسلام آباد کے ادیبوں کے
مختلف النوع احوال بھی معلوم ہوتے ہیں...... پاکستان
کی بیوروکریسی اور سیاست دانوں کے اندر خانوں کے
حالات کھلتے ہیں...... جمہوریت کا گلا گھونٹنے والے فوجی
حکمرانوں کے کارنامے بھی سامنے آتے ہیں۔''(۴۷)

اگر کتاب میں کوئی غلطی نظر آتی تو اُس کی نشاندہی بھی دھیمے انداز سے کر دیتے ہیں:

''رشید امجد نے چونکہ اپنی یادوں کو آزادانہ طور پر بیان کیا
ہے اس لیے کہیں کہیں بلا ارادہ اُن سے واقعات کے
بیان میں سہو بھی سرزد ہوئے ہیں۔''(۴۸)

اس کے بعد جہاں صاحبِ کتاب سے سہو سرزد ہوا تھا اُن تمام واقعات کو اصل پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔البتہ اپنے مضمون کے آخر میں اس کتاب کی عملی افادیت کو اجاگر کیا ہے:

''اصل کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ادیبوں کی
سوانح نگاری میں یہ کتاب اپنی ایک الگ پہچان رکھے
گی۔''(۴۹)

اصل میں سوانح نگاری کا فن بظاہر جتنا آسان نظر آتا ہے یہ اُتنا ہی مشکل اور پیچیدہ بھی ہوتا ہے۔ یادداشت پر بھروسا کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے ادیبوں سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔حیدر قریشی نے جس خوبی اور سلیقے سے اس کتاب کے محاسن گنوائے اُس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتاب اچھی طرح پڑھ کر اُس کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس علمی سرگرمی میں سنجیدہ رویہ اپناتے ہیں۔

اُردو زبان کے معروف سفرنامہ نگار اور افسانہ نگار جمیل زبیری کی سوانح عمری ''**یادِ خزانہ**'' کے اہم مقامات کو خوبی سے واضح کیا ہے۔حیدر قریشی کی کوشش تھی کہ اس کتاب میں پاکستان کے ابتدائی دور سے متعلق جو اہم معلومات درج ہے اُس میں قارئین کو بارِ دگر شامل کیا جائے لہٰذا اُن کے تنقیدی تبصرے میں خاص واقعات اور خاص رویوں کا اظہار ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنی جگہ بناتا نظر آتا ہے'لوگوں بدلتے ہوئے رویوں کی جھلک ملاحظہ ہو:

''اوائل ہی سے پاکستان کے ''طبقہ اشرافیہ'' کی عوام سے
بے تعلقی ظاہر ہوتی ہے۔ایسے لوگوں کا ذکر بھی ہے جو
بہت ترقی کر کے بھی سراپا انکسار رہے اور ایسے افراد کا
تذکرہ بھی ملتا ہے جو پوش علاقے میں چلے جانے کے
بعد اپنے پرانے گھر کے کورنگی جیسے علاقے کو نہ صرف
بھول گئے بلکہ اس سے بھی انکار کر گئے کہ وہ کبھی وہاں
رہتے تھے۔''(۵۰)

صاحبِ کتاب کے اُسلوبِ نگارش کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے:

'' 'یادِ خزانہ' کا اندازِ بیان سادہ ہے۔جمیل زبیری کی

سادہ نثر اپنی سادگی میں لفظوں کا جادو تو نہیں جگاتی لیکن
ان کے بیان کردہ واقعات میں ایک مٹتے ہوئے عہد کی
یادوں کا انوکھا جادو ضرور ہے۔''(۵۱)

حیدر قریشی اپنے تنقیدی تبصروں میں بے جا تعریف اور بے جا تنقیص سے قلم بچا کر رکھا ہے، معیار اور توازن اُن کی شناخت ہے۔

(۸) شعری مجموعوں پر ناقدانہ نظر

حیدر قریشی نے اپنی تصانیف ''حاصلِ مطالعہ'' اور ''تاثرات'' میں اٹھارہ شاعروں پر نقد و نظر کیا ہے ۔ یہ شعری مجموعے غزل'نظم'ماہیے اور نثری نظم جیسی اصناف پر مشتمل ہیں۔ان میں نئے اور پرانے دونوں لکھنے والے شامل ہیں۔اگرچہ نثری نظم کے بارے میں ان کے کچھ تحفظات بھی ہیں اور وہ اسے الگ صنف تسلیم نہیں کرتے تاہم ان کے تنقیدی عمل میں یہ صنف کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہے۔نثری نظم پر حیدر قریشی کا مؤقف بالکل واضح ہے:

''جب ڈاکٹر وزیر آغا شعری مواد اور شاعری کے فرق کو
واضح کر کے نثری نظم کے شعری مواد کا اعتراف کر کے
اسے شاعری تسلیم نہیں کرتے تھے میں تب بھی ان کے
خیالات سے متفق تھا اور اب بھی اسی بات کا قائل
ہوں''(۵۲)

نثری نظم کے حوالے سے ان کے نظریے میں قدرے لچک بھی نظر ہے، درج ذیل اقتباس ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے نثری نظموں کے مجموعے (آواز) پر کیے گئے تبصرے سے اخذ کیا گیا ہے:

''نثری نظم اور آزاد نظم کی بحث میں اپنا واضح مؤقف
رکھنے کے باعث نثری نظم کے تئیں میرے تحفظات بہت
واضح ہیں تاہم اس صنف کے امکانات کو آزما لینے میں
کوئی حرج نہیں۔نثری نظم کے جو مجموعے ان امکانات پر
گفتگو کی گنجائش پیدا کریں گے ان میں ایک ''آواز'' بھی
شامل رہے گا۔''(۵۳)

حیدر قریشی اس صنف کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود مستقبل میں اس کے امکانات سے پر اُمید نظر آتے ہیں۔یہی توازن ان کی تحریروں میں دل کشی پیدا کرتا ہے۔اپنی شعری تنقیدات میں وہ شاعر کے اصل وجدان اور وژن کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

یہ مثال ملاحظہ ہو:

''اکبر حمیدی کی رزمیہ شاعری اس کے ذاتی
تجربوں، روحانی الاؤ اور باطن کی سچائی سے پھوٹی ہے
''(۵۴)

حیدر قریشی کی یہ رائے اکبر حمیدی کے تازہ شعری مجموعے ''تلوار اُس کے ہاتھ میں'' کے تناظر میں ہے۔ اس مجموعے کا مطالعہ کر چکنے کے بعد حیدر قریشی نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں:

''اکبر حمیدی کا کمال یہ ہے کہ اس پہلی بار بلند لہجے میں بڑی شاعری
کر دکھائی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکبر حمیدی نے بلند لہجے کی بھی
کچھ حدود کا التزام رکھا ہے اور پھر اُس میں دھیمے پن کی بھی فنکارانہ آمیزش کی۔''(۵۵)

ان اقتباسات میں حیدر قریشی شاعر کی فکر اور تخیل کا مرکزی دھارا تلاش کرنے پر توجہ صرف کر رہے ہیں۔

حیدر قریشی نے جس شعری مجموعے پر بات کی ان میں نمائندہ شعروں کا حوالہ بھی نقل کر دیتے ہیں تاکہ قاری خود ان اشعار کو پڑھ کر ذاتی رائے بھی قائم کر سکے۔ ان کے شعری تبصروں میں اچھا خاصا ذخیرہ عمدہ اشعار کا دستیاب ہو جاتا ہے جو قاری کے لطف میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ ہر قاری اپنی افتادِ طبع اور ذوق کے مطابق ان شعروں سے اکتسابِ حظ کرتا ہے۔ ان شعروں کے انتخاب میں خاص احتیاط برتی گئی ہے اور صرف انھی اشعار کو بطور مثال نقل کیا ہے جن کی مدد سے شاعر کے ذہنی میلانات سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی اور قاری بذاتِ خود استدلال قائم کر سکے۔ لہٰذا ان کے پیش کردہ شعری حوالے ہیئت، جمالیاتی جذبے، تخیل کی صورت آفرینی، حسنِ زبان اور جذبات کی دنیا کو از سرِ نو تخلیقی عمل سے گزارتے ہیں اور قاری کی آزادانہ رائے کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔

کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

ناکام حسرتوں کا مقدر لیے پھرا
یوں میں شکستِ خواب کا منظر لیے پھرا (۵۶)

مانا کہ وصل و ہجر ازل کی اکائی ہیں
لیکن بدن سے جاں کا تعلق کچھ اور ہے (۵۷)

مزید مثالوں سے گریز کیا گیا ہے۔

(۹) ادبی شخصیات پر نقد و نظر

حیدر قریشی نے کچھ اہم ادیبوں پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی ہے اسی لیے ان کے فکر و فن کو قدرے گہرائی

میں جا کر سمجھنے کی کاوش نظر آتی ہے۔ ان ادبا میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ایوب خاور، پروین شاکر، جوگندر پال، فرحت نواز، عبداللہ جاوید اور صادق باجوہ شامل ہیں۔ ان کی بعض تحریروں میں لاگ اور لگاؤ کے کئی منفرد انداز پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیض سے ان کی ایک ملاقات اور چند خطوط کا تبادلہ ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اجنبیت کی دیوار اپنی جگہ قائم رہی۔ اس صورت حال کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

''میں فیض کے معاملے میں اجنبی کا اجنبی ہوں۔ لیکن
فیض کی شاعری اور شخصیت دونوں میں اتنا جادو ہے کہ
دور بیٹھے ہوؤں کو بھی اپنا اسیر بنالیتا ہے سو میں فیض کے
ایسے اسیروں میں سے ہوں اور اس لحاظ سے ان کا شناسا
بھی ہوں۔''(۵۸)

اپنے مضمون ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' (مشمولہ: ''تاثرات'') میں حیدر قریشی نے فیض کے ناقدین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو فیض کی شعری تازگی اور توانائی کا قائل ہے اور اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ ایک خاص دور کے بعد اُن کی شاعری جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ اس حلقے میں ڈاکٹر وزیر آغا، انیس ناگی اور خورشید الاسلام جیسے اکابرین شامل ہیں۔ دوسرے گروہ میں شامل لوگ احمد ندیم قاسمی کے زیرِ اثر لکھ رہے ہیں جن کا مسئلہ ادبی نہیں بلکہ ذاتی ہے کیونکہ چند لوگوں نے بقول حیدر قریشی:

''کبھی فیض اور قاسمی کو ہم پلہ ثابت کرنا چاہا تو کبھی کسی
حیلے سے جناب قاسمی کو فیض سے بھی بڑا شاعر ثابت
کرنے کی کوشش کی۔''(۶۸)

یہ سلسلہ تا حال جاری ہے کیونکہ ابھی دونوں گروہوں کے اہم لکھاری اپنے اپنے نقطۂ نظر پر سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ مذکورہ بالا مضمون کے ذریعے یہ بات بھی علم میں آتی ہے کہ فیض نثری نظم کو نہیں مانتے تھے۔

حیدر قریشی نے اپنی تنقیدی تصنیف میں تین اور مضامین مثلاً ''رسول حمزہ کی نظموں کے تراجم: اصل ترجمہ نگار کون؟'' ''افتتاحی تقریر، فیض سیمینار کلکتہ'' اور ''فیض صدی کی ایک جھلک'' شامل کیے ہیں جو فیض اور ان کے بعد ان کی پذیرائی کے بارے میں ہیں اور قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔ ''سرِ وادیٔ سینا'' میں رسول حمزہ کی نظموں کے اُردو تراجم کے بارے میں حیدر قریشی نے جو سوالات اُٹھائے ان کا جواب تا حال سامنے نہیں آیا۔ وہ سوال یہ تھا کہ فیض کی کتاب '' سرِ وادیِ سینا'' کے آخر میں روس کے ملک الشعرا رسول حمزہ کی نو نظمیں شامل ہیں ان کا اُردو ترجمہ کس نے کیا تھا؟ کیونکہ یہی تراجم ظ انصاری کی کتاب ''منظوم تراجم'' میں بھی شامل ہیں۔ ان نظموں کا مترجم یا تو فیض ہے یا ظ انصاری، لیکن ابھی تک کوئی ٹھوس جواب سامنے نہیں آیا۔ حیدر قریشی غالباً

وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے یہ اہم سوال اُٹھایا ہے۔اُمید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے ناقدین اور محققین اس قضیے کو حل کرنے میں کامیابی حاصل کرلیں گے۔البتہ ۲۰۱۱ء میں فیض صدی منانے کا فیصلہ ہوا اور اس سال فیض کے فکروفن پر بھی کافی کچھ لکھا گیا لیکن اس مسئلے کی جانب کسی نے توجہ دینا پسند نہیں کیا۔حیدر قریشی اپنے مضمون ''فیض صدی کی ایک جھلک''میں یہ معلومات فراہم کی ہے سال ۲۰۱۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کولکاتا نے فیض صدی کو مزید بامعنی بنانے کے ایک سیمینار کا انعقاد کیا تھا لیکن اس کے باوجود رسول حمزہ کے توارد والا مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ ماسکو میں اُردو کی نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر لدمیلا نے اسے اشاعتی ادارے کی غلطی تو قرار دیا ہے تاہم وہ بھی کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کرسکیں۔حیدر قریشی نے ان تراجم کی مکرر اشاعت کر کے فیض شناسوں کو ایک بار پھر دعوتِ فکر دی ہے۔

حیدر قریشی نے ''پروین شاکر۔۔نسائی شاعری کی آن'' جیسا عمدہ تنقیدی مضمون لکھ کر اس شاعرہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔وہ پروین شاکر کی خداداد صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ہے اس بات کی تحسین کرتے ہیں کہ پروین نے ادا جعفری' کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی موجودگی میں اپنی منفرد شناخت قائم کرائی ہے۔احمد ندیم قاسمی اور پروین شاکر کے باہمی مراسم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کی تردید کی ہے کہ پروین شاکر صرف احمد ندیم قاسمی کی بدولت ناموری اور شہرت کے درجے پر فائز ہوئی تھی،اس کے برعکس اُن کا کہنا ہے:

''یوں نہیں ہے کہ جسے بھی قاسمی صاحب خصوصی توجہ دیں
وہ بڑی شاعرہ بن جائے گی۔ اس کے لیے اپنے
اندرویسی صلاحیتیں ہونا بھی ضروری ہے۔اسے پروین
شاکر کی خوش قسمتی کہہ لیں کہ انہیں قدرت کی طرف سے
صلاحیتیں ودیعت کئے جانے کے ساتھ مناسب ماحول
اور وسائل بھی میسر آ گئے اور قاسمی صاحب کا دستِ
شفقت بھی مل گیا۔''(۶۰)

ناقدانہ تجزیے کی یہ مثال دیکھیے:

''پروین نے کھردری اور نثر نما شاعری کرنے کی بجائے
صنفِ نازک کے لطیف جذبات اور احساسات کو بہت
ہی نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ اور کسی حد تک باریک
پردے کے ساتھ پیش کیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ شاعرات
میں اپنی پیش رووں سے کہیں آگے نکل گئیں۔''(۶۱)

پروین شاکر کو اس کے اصل شعری پس منظر میں رکھ کر اس کی ادبی قدروقیمت پر بات کرنا حیدر قریشی کے عمدہ ذوق

سلیم کا ثبوت ہے۔مندرجہ فوق تجزیے کی روشنی میں یہ اخذ کرنا ممکن ہوجاتا ہے کہ پروین شاکر شاعری میں جدتِ خیال' شدتِ خیال اور حدتِ خیال کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اُسلوبیاتی آہنگ بھی موجود ہے۔شاعری اصلاً جذبات کا کھیل ہے اور اچھا نقاد انھی جذبات کی تفہیم کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔

معروف ترقی پسند نقاد ممتاز حسین رقم طراز ہیں:

''جذبات کی گہرائی اس کا نام نہیں کہ ہم غلط اقدار کی
گرفت میں اپنے کو ڈھیل دے رکھیں بلکہ یہ اس وقت
پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے جذبات صحیح اقدار کے گرد
منظّم اور مستحکم ہوتے ہیں۔''(۶۲)

یہ بات جتنی شاعری پر صادق آتی ہے اتنی ہی نقاد کی تنقیدی بصیرت پر بھی پوری اُترتی ہے۔حیدر قریشی کے تنقیدی نظام میں جہاں جذبہ واحساس کے عناصر متحرک نظر آتے ہیں وہاں اُصول ومنطق کی لہریں بھی اسی نظام کو مضبوط کرتی دکھائی دیتی ہیں۔یہی تمام عناصر مل کر ان کے تنقیدی نظام کو واضح کرتے ہیں۔

(۱۰) ادب میں سرقہ اور جعل سازی کی نشاندہی

حیدر قریشی نے اپنی تنقید کے ذریعے جہاں نئے اور پرانے لکھنے والوں کے فکروفن پر سیر حاصل جائزے پیش کیے وہاں ایسے جعلی ادیبوں پر سخت گرفت بھی کی جو چور راستے سے ادب میں وارد ہوئے اور مختلف حربوں کے ذریعے خود کو ادیب منوانا شروع کر دیا۔ایسے لوگوں کو منظر عام پر لانا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن حیدر قریشی یہ کام کر گزرے جس کی وجہ سے ایک مخصوص حلقہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا تھا،تاہم وقت کی میزان نے ثابت کر دیا ہے کہ اصل ادیبوں کی موجودگی میں نقلی ادیبوں کی دال گلنا محال ہے۔اُردو ادب میں اس نزاعی موضوع پر کافی لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔مولوی نجم الغنی نے ''بحر الفصاحت'' میں سرقہ اور توارد کے کئی پہلوؤں پر ناقدانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی نے اپنے تحقیقی رسالے ''جریدہ'' شمارہ نمبر ۲۷ میں مشرق ومغرب میں سرقہ نویسی کی تاریخ کے کچھ اوراق متعارف کرائے ہیں۔اس یادگار شمارے کے پہلے مضمون کا آغاز ہی ان الفاظ میں ہوتا ہے:

''سرقہ'تصرف'افادہ'استفادہ'استفاضہ'اخذ'تقلید'نقل'توارد' یکسانیت'
مشابہت'مطابقت'متحد الخیالی'متوازیات'اثر اور امثالِ
سرقہ (نثر ونظم) سے متعلق مباحث علمی وادبی تواریخ کا
خصوصی موضوع رہے ہیں۔''(۶۳)

حیدر قریشی نے اسی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔اُنھوں نے اپنے مضامین میں اس حوالے سے جو بھی

لکھا اُسے مکمل سند کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کر دیا ہے، مثلاً وہ اپنے مضمون ''اُردو غزل کا انتقام'' میں یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ستیہ پال آنند نے امریکہ کے ایک مشاعرے میں غلام محمد قاصر کے اشعار اپنے نام سے سنا دیے تھے۔

شعر یہ ہیں:

بغیر اُس کے اب آرام بھی نہیں آتا
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا (۶۴)

یہ غزل غلام محمد قاصؔر کے شعری مجموعے ''دریائے گمان'' کے فلیپ پر بھی موجود ہے۔ آنند صاحب نے مذکورہ بالا اشعار جس ادبی تقریب میں سنائے تھے اُس کی ویڈیو ٹیپ یوٹیوب پر موجود ہے، جس کا لنک یہ ہے:

(۶۵) www.youtube.com/watch?bv=x10wwcv6g

ستیہ پال آنند نے خاصی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی اور مختلف احباب بشمول حیدر قریشی کو اپنی ای میلز کے ذریعے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانا چاہا مگر حقائق تاہم حقائق ہیں۔ حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''ستیہ پال آنند نے اپنی ایک معصوم لغزش کا فراخدلانہ اعتراف کر لیا ہوتا تو آج یوں مزید تماشا نہ بنتے۔ اُنہیں جھوٹ پر جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں اور ہر جھوٹ بے نقاب ہوتا جا رہا ہے۔'' (۶۶)

حیدر قریشی کے اس مضمون میں ستیہ پال آنند کی وہ ای میلز بھی درج ہیں جن میں یہ ساری بحث موجود ہے۔ بخوفِ طوالت غیر ضروری حوالہ جات سے اجتناب برتا گیا ہے۔ تاہم یہ طے شدہ امر ہے کہ ستیہ پال آنند نے غلام محمد قاصر کا کلام بغیر حوالہ دیے پڑھا تھا اور لوگوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ یہ اُن کا اپنا کلام ہے۔

حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''میں ذاتی طور پر ادب میں سرقہ اور جعلسازی کے خلاف ایک عرصہ سے متحرک ہوں لگ بھگ ۱۹۹۰ء سے۔'' (۶۷)

یہ بیان بھی ملاحظہ ہو:

'' تمام تر مخالفت کے باوجود میں نے سرقہ اور جعل سازی کو بے نقاب کرنے کا اپنا کام جاری رکھا۔ اس

وقت بھی انڈیا میں جوگندر پال کے افسانے کا سرقہ کرنے والے ایک کردار پر کام کر رہا ہوں۔'' (۶۸)

اس ضمن میں اُن کے کئی مضامین شائع ہوئے جس کی وجہ ہے نئے نئے سرقوں کا سُراغ ملا۔ مثلاً عمران بھنڈر وہ شخص ہے جس نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اُن سرقوں کو منظرِ عام پر لایا جس کا ارتکاب اُنھوں نے اپنی تصنیف ''ساختیات پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں کیا تھا۔ یہ مضمون ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی کے سالنامہ (۲۰۰۶ء) میں چھپ چکا ہے۔ مذکورہ مضمون میں عمران بھنڈر نے گوپی چند نارنگ کو مصنف کے بجائے مترجم ثابت کرنے پر زور دیا۔ یہ مضمون ہر قسم کے ضروری حوالہ جات سے مزین تھا لہٰذا اُردو ادب میں اِس نزاعی مضمون نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہی عمران بھنڈر بعد ازاں خود بھی سرقے کا مرتکب ہوا جس کی نشاندہی حیدر قریشی نے اپنے مضمون ''عمران بھنڈر کا سرقہ اور جعل سازی'' (مشمولہ: ''تاثرات'') میں بوضاحت کر دی۔ حیدر قریشی نے مقدور بھر یہ کوشش کی ہے کہ وہ ادب میں در اندازی کرنے والوں کو بے نقاب کریں۔ اس سلسلے میں انھیں خاصی کامیابی نصیب ہوئی لیکن کئی ادبی حلقوں کی جانب سے مخالفت کا بازار بھی گرم رہا ہے۔ اس حوالے سے اُن کی کاوشیں منظرِ عام پر آتی رہیں گی۔

(۱۱) ماہیے پر تنقیدی مباحث

حیدر قریشی نے صنفِ ماہیا کے فنی، فکری، تخلیقی، اُسلوبیاتی اور تحقیقی زاویوں کی وضاحت وصراحت کی خاطر مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ الگ الگ کتابوں کی صورت میں شائع ہونے کے بعد کلیات کی شکل میں بعنوان ''اُردو ماہیا تحقیق وتنقید'' بھی طبع ہو چکا ہے۔ اس کلیات میں ماہیے پر قابلِ قدر تنقیدی سرمایہ محفوظ ہو چکا ہے۔ فاضل تنقید نگار نے اپنے انٹرویوز، مضامین، نجی خطوط، پیش لفظ، ادبی وسائل کے مدیروں کے نام خط اور تبصروں کے ذریعے اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان کے معروف شاعر پروین کمار اشکؔ کے بارے میں یہ تنقیدی رویہ ملاحظہ ہو:

''پروین کمار اشک کے ماہیوں میں کہیں کہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اُن میں زمینی آسمانی، طبیعیاتی و مابعد الطبیعیاتی قسم کی نیم فلسفیانہ لہر بھی آ جاتی ہے۔ ماہیا اپنے مخصوص مزاج کے باعث دقیق اور فلسفیانہ مضامین کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے مضامین کو ماہیے کے لئے شجرِ ممنوعہ قرار دینا بھی مناسب نہیں۔'' (۶۹)

شاعر کے تخلیقی عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کی تنقیدی رائے ظاہر کرنا بذاتِ خود عملِ خیر ہے۔ توازن اور

تجزیے کا خوبصورت امتزاج اور بھی کئی جگہوں پر نظر آتا ہے۔
نذیر فتح پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نذیر فتح پوری کے ہاں پنجاب کے دریائی اور میدانی
مزاج کی بجائے صحرائی مزاج ملتا ہے۔ ماہیے کے مزاج
میں صحرائی اثرات کی مکمل نفی تو نہیں کی جا سکتی لیکن اس
میں کوئی شک نہیں کہ ماہیے کے مزاج کا غالب عنصر
میدانی اور پنج دریائی ہے۔''(۷۰)

نذیر فتح پوری کا تعلق چوں کہ راجستھان سے ہے اسی لیے اُن کے ماہیوں میں مقامی رنگ کا اثر نمایاں ہے۔ حیدر قریشی نے اسی منفرد پہلو کو تنقیدی میزان میں تولنے کی کوشش کی ہے۔ برطانیہ کے شہر برمنگھم کی معروف شاعرہ اور مزاح نگار رضیہ اسماعیل کے ماہیوں میں خاصا موضوعاتی تنوع ملتا ہے۔ اُنھوں نے برطانیہ میں موجود تارکینِ وطن کے مسائل وعوارض کو بھی اپنی ماہیا نگاری کا حصہ بنایا ہے۔ حیدر قریشی نے اس جہت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ تنقیدی رائے دی ہے:

''یورپ میں مقیم بعض دوسرے ماہیا نگاروں نے بھی
یہاں درپیش مسائل کو عمدگی سے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن
ایسا انداز کہ جس سے ہم لوگوں کا ثقافتی بحران اور اس
مسئلے کی داخلی کیفیات نمایاں ہو سکیں، اس کو رضیہ اسماعیل
نے ایسی بے ساختگی سے بیان کیا ہے کہ یہ اُن کی
انفرادیت بن گئی ہے، ایسی انفرادیت جس میں پورے
اجتماع کی ترجمانی یا عکاسی موجود ہے۔''(۷۱)

رضیہ اسماعیل کے ماہیوں پر یہ تنقیدی رائے شاعر کے اصل وژن کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہے۔ نئی تنقید نے فن پارے کی تقسیم میں متن کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ شاعر اور دیگر سماجی احساسات کی نفی ہو کر رہ گئی تھی لیکن حیدر قریشی کی تنقید فن پارے کو کلیاتی تناظر میں پرکھنے کی قائل ہے۔ یہی وہ راست تنقیدی سمت ہے جو قاری کو اصل فن پارے کی سیر کراتی ہے۔ ساختیاتی تنقید کے معماروں نے فن پارے کو تمام لوازمات سے آزاد کر کے ہوا میں معلق کر دیا ہے۔ حیدر قریشی کی تخلیقی تنقید فن پارے کو تمام ضروری لوازم سمیت قبول کرتی ہے اور یہی اُن کی انفرادیت بھی ہے۔ ہمارے ساختیاتی نقاد اس حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہے:

''شاعر یا فنکار اقدار اُس وقت تخلیق کرتا ہے جب کہ وہ

خارجی حقیقت کے بارے میں اپنے ذہنی رجحان اور
قوتِ ارادی کے میلانات کا اظہار کرتا ہے۔ خواہ وہ
رجحان خارج کے مقابل میں جذبہ سپردگی ہی کا کیوں نہ
ہو۔''(۷۲)

ممتاز حسین کے اس بلیغ بیان نے ساختیاتی طریقِ کار کی نفی کر دی ہے۔ حیدر قریشی کا مکتبِ تنقید اسی روشن فکری کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ تجربے کی جامعیت کو مانتے ہیں اور شاعر کی جدلیاتی فکر کے بدلتے منظر ناموں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

حیدر قریشی کی تنقید نگاری پر مشرق و مغرب کے کسی بڑے نقاد کے اثرات تلاش کرنا بے معنی ہے۔ اُن کا تنقیدی انداز سراسر اُن کا اپنا ہے۔ جس طرح خالص ادبی جذبات تخلیقی عمل میں اُن کے ہمراہ ہوتے ہیں بالکل اس طرح عمومی رویے اور جذبات و احساسات بھی اُن کی تخلیقی ادبی تنقید کا بھرپور عکس ہیں۔

(ب) حیدر قریشی کے تنقیدی رویے اور اُسلوب

تنقیدی عمل جہاں فن پارے کے فنی وفکری زاویوں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں نقاد کے ذہنی رویوں کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ تنقید خواہ معروضی ہو یا موضوعی وہ نقاد کے شعوری اور لاشعوری محرکات کو اُس کی تحریر کے ذریعے ظاہر کر دیتی ہے۔ تنقیدی عمل کے دوران احساس وادراک کی لہریں کسی نہ کسی حوالے سے اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں اور یہی وہ پراسرار راستہ ہے جس پر چل کر نقاد کے باطنی رویوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اِن تمام اہم اُمور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حیدر قریشی کے مخصوص تنقیدی رجحانات کا کھوج لگانے کی سعی کی جا رہی ہے تا کہ اُن کی تمام تنقیدی سرگرمیوں کو اصل تناظر میں سمجھا جا سکے۔

(ا) تنقیدی نظریات اور طریقِ کار

حیدر قریشی اپنی تنقیدی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اُردو میں نقاد کہلانے کے لیے جس قسم کی تنقید لکھی جا
رہی ہے، میں اُس قطار میں شمار نہیں ہوتا۔ میرے جملہ
مضامین، تبصرے اور تاثرات ایک قاری کے تاثرات
ہیں، ایسا قاری جو خود تخلیق کار بھی ہے۔''(۷۳)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''تنقید کو تخلیق کا جزوی حصہ سمجھتا ہوں...... کسی کتاب یا
موضوع پر لکھتے وقت جو کچھ میرے ذہن میں آتا ہے اور

دل اُسے جس حد تک قبول کرتا ہے میں اُن تاثرات کو لکھتا
چلا جاتا ہوں۔ قارئین پر کسی درآمدی نظریے یا فلسفے کا
رعب جھاڑنا میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔'' (۷۴)

''مابعد جدیدیت کے زیر اثر قاری کو قرأت کی آڑ میں
ناقد کی بالادستی کا ڈرامہ تو اُردو ادب میں نہ صرف فلاپ
ہو چکا ہے بلکہ اس کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ چکی
ہے۔'' (۷۵)

یہ بات صداقت پر مبنی ہے۔ ہمارے ہاں مغرب سے درآمد شدہ تنقیدی نظریات کا جو چربہ پیش ہوتا رہا ہے اُس کی وجہ سے متن کو اصل شئے قرار دے کر تخلیق کار کو غیر اہم سمجھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا جس کی وجہ سے جہاں ہماری مشرقی تنقید کو رد کر دیا گیا وہاں موجود نئی تنقید کو غلط سمت پر ڈال دیا گیا۔ اُردو تنقید میں دراندازی کا یہ عمل خاصا نقصان دہ ثابت ہوا اور کئی ذہین ادیبوں کی گمراہی کا سبب بنا۔ اس سارے منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے حیدر قریشی کی اس متوازن فکر کا مطالعہ کریں جس میں وہ بتاتے ہیں:

''تخلیق کار، فن پارے اور قاری تینوں کے درمیان ہم
آہنگی سے ادب کی تفہیم و ترویج ممکن ہے۔'' (۷۶)

تنقید کا اصل حسن اس میں پوشیدہ ہے کہ ان تینوں میں ہم آہنگی اور تناسب کا رشتہ برقرار رہے اس تکون کو قائم رکھنا بھی تنقید کے منصب کا لازمی حصہ ہے۔ لیکن گزشتہ دو دہائیوں میں ساختیات اور جدیدیت کے نام پر جو ڈرامہ بازی ہوتی رہی اس نے ہمارے تنقیدی عمل کو بے طرح مجروح کیا ہے، بالخصوص جدیدیت کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا یہ بیان مخدوش صورت حال کو واضح کرتا ہے۔

''جدیدیت پر اُردو میں لکھے گئے مکالمات ایک عجیب
انتشار کو پیش کرتے ہیں یہ انتشار تعقلاتی اور تعبیری
دونوں سطحوں پر ہے۔ جدیدیت کے مرکزی تعقلات کی
وضاحت میں خوب آزادی سے کام لیا گیا ہے ان
تعقلات کی تعبیر میں من مانی کی گئی ہے ظاہر ہے یہ
آزادی اور من مانی وہاں خوب فروغ پاتی ہیں جہاں
اصطلاحات کو سنگ گراں اور تناظر کو غیر ضروری سمجھا جاتا
ہو۔'' (۷۷)

اس غلط روش نے جو فکری مغالطے پیدا کیے ان کا تدارک آج تک نہ ہو سکا تنقید کا نظری اور عملی سرمایہ مختلف منازل طے کرنے کے بعد ہی اپنی شناخت متعین کرتا ہے اگر اسے ماضی سے کاٹ کر اور ہوا میں معلق کر کے ترقی دینے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا نتیجہ انتشار خیالی کی صورت میں برآمد ہوگا حیدر قریشی تنقید کے جدید نظری مباحث کو خاص اہمیت دیتے ہیں لیکن کسی فکری بے رہ روی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے:

''میں نظری تنقید کی اہمیت کا بھی معترف ہوں، اس کی
وجہ سے ادب کے سرے فلسفہ اور سائنس سے جا ملتے
ہیں۔'' (۷۸)

نظری مباحث میں جدید علوم وفنون نے تنقید پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جن لوگوں نے جدید علوم کی سطحی معلومات کو تنقید میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی اصل مسائل کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ وگرنہ نئے علوم کی مدد سے تنقید نے اپنے ہونے کا ٹھوس جواز فراہم کیا ہے۔

حیدر قریشی غیر سنجیدہ نقادوں سے باقاعدہ ناراضی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں:

''تنقید کو ہمارے ہاں سکہ بند نقادوں کا فریضہ بنا کر نقاد کو
ادب میں کسی مذہبی پیشوا سے ملتی جلتی حیثیت دے دی گئی
ہے۔ رہی سہی کسر ان مابعد جدید شارحین/سارقین نے پوری
کر دی جنہوں نے مختلف حیلوں سے مصنف اور متن دونوں کو
بے وقعت قرار دے کر اپنی تشریحات اور سرقوں ہی کو ادبِ عالیہ
قرار دلوانا چاہا۔'' (۷۹)

حیدر قریشی کے اس طرزِ عمل یا ردِ عمل کو سمجھنے کی خاطر جدید تنقید کے اُس پس منظر کو جاننا لازمی ہے جس میں نت نئی تنقیدی اصطلاحات کے عقب میں انگریزی کتابوں کے چربے، ترجمے اور براہِ راست سرقے اُردو میں منتقل ہونا شروع ہوئے۔ جدیدیت کے اس سیل بے پناہ کا تجزیہ کیا جائے سوائے مایوسی اور بدعات کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ حیدر قریشی کے تنقیدی وژن کی جانکاری حاصل کرنے کے لیے اس پس منظر کا واضح ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ادبی تنقید ذہنی معرفت کا دوسرا نام ہے۔ وہ بغیر کسی ذاتی منفعت اور دوست داری کے حق سچ کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ حق گوئی اکثر اوقات ان کے پرانے تعلقات پر بری طرح اثر انداز بھی ہوتی رہی مگر وہ بھی قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید کی مجسم تصویر بنے رہے۔

(۲) کفایت لفظی اور سادگی

حیدر قریشی کا تنقیدی اُسلوب اختصار کی جانب مائل ہے۔ بھاری بھر کم الفاظ، بڑی بڑی تنقیدی

اصطلاحات اور بے جا لفاظی ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتے۔ مفہوم کی ادائیگی میں استعارات اور تشبیہات سے دامن بچ کر چلتے ہیں۔ سادہ اور سلیس الفاظ و محاورات ان کی پہچان ہیں۔ زبان عام فہم اور سادہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بیان میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہوتی، انداز بیان کی سادگی اور شائستگی کی وجہ سے ہر طبقے کا قاری ان کی تحریروں کو حسب حال پاتا ہے۔ ان کا قلم بے اعتدالی کا شکار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی ادبی کمزوریوں کی جانب بھی غیر محسوس انداز میں توجہ دلاتے ہیں۔ زبان و بیان کی اس سادگی نے ان کے اُسلوب میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں مطلب کی بات کہہ دینے کا فن جانتے ہیں۔ یہ مثال دیکھئے:

''عبداللہ جاوید کی شاعری بے ساختہ پن، رواں اور سہل ممتنع کی خوبیوں سے لبریز ہے۔'' (۸۰)

عبدالرب اُستاد کی تنقیدی کتاب پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''وہ تاثر اور تنقید دونوں کو یکجا رکھتے ہیں۔ بلکہ دونوں کی
یکجائی سے متوازن تنقید کا بہتر تاثر سامنے آتا
ہے۔''(۸۱)

اس نوع کی تنقیدی فعلیت پڑھنے والے کی تربیت بھی کرتی ہے۔ سادہ اُسلوب نگارش میں حسن و تاثر بھی اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ نقاد کسی فن پارے کے جملہ عناصر کو جذب کرنے کے بعد اظہار خیال کرتا ہے۔ کفایتِ لفظی اور سادگی کا ایک یہ انداز ملاحظہ ہو جہاں حیدر قریشی محض چند سطروں میں تین افسانہ نگاروں کے کلیدی اوصاف واضح کر رہے ہیں:

''انور سجاد کے ہاں روایتوں سے بغاوت کا رجحان
ہے۔ انتظار حسین کے ہاں روایتوں پر جدید عہد کی تشکیل
کی خواہش ہے، رشید امجد کے ہاں روایتوں سے مکمل
بغاوت تو نہیں مگر انحراف ضرور ملتا ہے۔ لیکن گریز ساری
کہانی میں آنکھ مچولی کی طرح چلتا ہوا آخر میں روایتوں کو
مسترد کرنے کی بجائے اس کے صحت منداجزا کو ملا کر
جدید عہد کی تشکیل کرتا ہے۔''(۸۲)

تنقید کا یہ سادہ انداز بذات خود تخلیقی مقام پر فائز ہے۔ محمد حسن عسکری نے لکھا تھا:

''تربیت یافتہ ادبی شعور کے بغیر کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں۔'' (۸۳)

حیدر قریشی کی تنقیدات میں یہ شعور اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے اور پڑھنے والوں کے فکر و نظر میں خوش گوار اضافوں کا باعث بھی بنتا ہے۔

(۳) حقیقت پسندی

ادبی تنقید تین شعبوں پر مشتمل ہے یعنی اُصول تنقید، عملی تنقید اور نقدِ تنقید۔ ان تینوں کی بنیاد حقیقت پسندی پر اُستوار ہے۔ ہماری اُردو تنقید میں جو کمزوریاں نظر آتی ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ حقائق سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے اور وقتی یا ہنگامی قدروں کو ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔ ایسے غیر علمی رویوں کی وجہ سے اُردو تنقید قدرے سست روی سے آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔

حیدر قریشی نے عملی اور نظری سطح پر اس خرابی کی مذمت کی ہے اور تنقید میں واقعیت نگاری کو اپنا شعار بنائے رکھا ہے۔ مبالغہ آرائی اور طول کلام سے اپنی تنقید کو پاک رکھ کر اور جائز اور سیدھی بات لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ تخلیقی تنقید میں حق گوئی کا عنصر کیسے شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں بیسیوں ایسے شعرا موجود ہیں
(شاعرات بھی) جو خود شعر کہنے کا ملکہ نہیں رکھتے مگر شہرت اور ناموری کے چکروں میں اس طرف آ نکلے ہیں۔
حیدر قریشی اس المیے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''پاکستان اور انڈیا میں ایسے ضرورت مند اُستاد، شاعر
موجود ہیں جو معقول معاوضہ پر پورا شعری مجموعہ لکھ کر
دے دیتے ہیں۔ جعلسازی کے فروغ کے اس خطرناک
رجحان پر بروقت گرفت نہ کی گئی تو یہاں اصل اور نقل کا
فرق کرنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ یہ اُردو ادب کا جنازہ
نکالنے والا کام ہو رہا ہے۔''(۸۴)

اور صورت حال یہ ہے:

''مغربی ممالک میں جعلی شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ پیدا ہو چکی ہے۔''(۸۵)

مغرب میں اس وقت بے شمار اُردو شاعر اور نثر نگار موجود ہیں لیکن اس طرح کے انکشافات کرنے کو کوئی جرأت نہیں کرتا۔ ہر لکھنے والا کسی نہ کسی مصلحت کا شکار ہو کر اس المیے کو بے نقاب نہیں کرتا۔ تاہم حیدر قریشی نے تمام مصلحت کوشی کو ایک طرف رکھتے ہوئے اصل حقیقت بیان کر دی ہے۔ یہ ان کی حقیقت پسندی کا مثبت پہلو ہے۔ حیدر قریشی کے نزدیک ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار کا باہمی بندھن ناگزیر ہے۔ جہاں یہ بندھن کمزور یا ڈھیلا پڑ جائے وہاں بے ایمانی اور بددیانتی جنم لیتی ہے۔ ان کی شخصیت پر حق گوئی کا غلبہ اتنا مضبوط ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر بات کرتے کرتے حق پر مبنی دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً وہ ناصر عباس نیر کی ادبی شخصیت پر بات کرتے کرتے ان کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں:

''اگر ادب میں اقتدار والوں کے مقاصد اور دوسری
اغراض فوقیت اختیار کرنے لگیں تو جینوئن لکھنے والے ادبی
برکت سے محروم ہو کر قلم کی بے برکتی کا شکار ہو جاتے
ہیں۔''(۸۶)

یہ مشورہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے، اگر اس کی پرتوں کو کھول کر دیکھا جائے تو یہی درس ملے گا کہ کسی حال میں بھی حق وصداقت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔کرامت علی کرامت کا جب تازہ مجموعۂ مضامین بعنوان ''نئے تنقیدی مسائل اور امکانات'' ان کے ہاتھ آیا تو اس کی کمزوریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

''تاہم مجھے لگا کہ وہ بعض امور میں کسی بہتر نتیجہ تک پہنچنے
کی بجائے کہیں آس پاس ہی رہ جاتے ہیں۔''(۸۷)

اگر حیدر قریشی چاہتے تو یہ بات گول مول انداز میں بھی کر سکتے تھے لیکن ان کی صاف گوئی کی بدولت یہ بات تقریباً براہ راست پیرائے میں سامنے آ گئی ہے اور صاحب کتاب اسے پڑھ کر اپنا قبلہ درست کر سکتا ہے۔تنقید کا یہ انداز ذرا سخت ضرور ہے لیکن اس کی اثر انگیزی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ہماری اُردو تنقید کو یہی انداز درکار ہے۔نقاد کی ذمہ داریوں میں جہاں بہترین علم کی ترویج، غیر جانب داری، تقابلی مطالعے کے عناصر اور وسعت مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے وہاں محقق اور تخلیق کار کو درست جادہ پر گامزن رکھنا بھی نقاد کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔نقاد کی نظر حقائق پر ہونی چاہیے تا کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی حقائق دکھا سکے حیدر قریشی نے یہ فرض عمدگی سے ادا کیا ہے۔

(۴) تشریحی اور توضیحی انداز

تنقید ایک ایسی ہمہ گیر علمی سرگرمی ہے جس میں بیک وقت کئی اہم امور کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔جن میں ایک بڑا کام یہ بھی ہے کہ زیرِ نظر فن پارے کی جانچ پرکھ کے ساتھ اس کی تشریح وتوضیح کا فریضہ بھی انجام دیا جائے۔انگریزی ادب کے معروف نقاد ٹی۔ایس ایلیٹ بھی اس تنقیدی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے:

''جب میں تنقید کا نام لیتا ہوں تو یقیناً اس سے یہاں
میری مراد تحریری لفظوں کے ذریعہ کسی فن پارے کی تفسیر و
تشریح سے ہے۔''(۸۸)

اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے ایلیٹ لکھتا ہے:

''تنقید کیلئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ کسی مقصد کا اظہار
کرے، جسے سرسری طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن

پارے کی توضیح اور اصلاحِ مذاق کا کام انجام دے۔اس
طرح نقاد کا کام بالکل واضح اور مقرر ہو جاتا ہے اور اس
بات کا فیصلہ بھی نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ آیا وہ اسے تسلی
بخش طور پر انجام دے رہا ہے یا نہیں۔''(۸۹)

حیدر قریشی کی تقریباً تمام تنقیدی سرگرمیوں میں تشریح وتوضیح کا انداز نمایاں ہے۔اس انداز کے دو بڑے فوائد ہیں؛ ایک تو علم قاری اصل فن پارے کے نزدیک ہو جاتا ہے دوسرا اس پر ہونے والی تنقید کا معیار نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔اس ضمن کی ایک نمائندہ مثال اُن کے مضمون ''ہرمن ہیسے کا ناول ''سدھارتھ'' ہے۔اس ناول پر بات کرنے سے پہلے وہ متعلقہ مصنف کا جامع پس منظری مطالعہ پیش کر دیا ہے تا کہ ایک عام قاری بھی اصل حقائق وواقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ناول کا فہم حاصل کرے اور اس پر لکھی جانے والی تنقید کی قدر و قیمت جان سکے۔حیدر قریشی یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد ''سدھارتھ'' کے تشریحی مقامات واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس ناول میں متعدد فکری سوالات اور شبہات بھی
سامنے آتے ہیں اور فلسفیانہ روحانی جستجو کے ایسے
اشارے بھی ملتے ہیں جو پنڈتوں، پادریوں اور مولویوں
کی طویل تقریروں پر بھاری ہیں۔''(۹۰)

اس ناول کا ایک اہم کردار واسودیو ہے۔اس کردار کے گرد ایک ایسی ماورائی دُھند چھائی ہوتی ہے کہ قاری کو اس کردار کی اہمیت وافادیت کے بارے میں ٹھیک اندازہ نہیں ہو پاتا، حیدر قریشی اس کردار کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''واسودیو عام زندگی کا ایک ایسا کردار ہے جو کوئی عالم نہ
ہوتے ہوئے جنگل اور دریا کے کناروں پر فطرت سے
براہِ راست فیض یاب ہو کر اس کے بھیدوں سے آشنا ہوتا
ہے۔واسودیو کا کردار خاموش طبع ہونے کے باوجود
دریائی صفات سے لبریز دکھائی دیتا ہے۔''(۹۱)

یہ وضاحتی نکات ناول کے اہم مقامات کی تفہیم کرتے ہیں۔اس کے اصل مرکزی کردار کا نام ''سدھارتھ'' ہے جو ناول کے تمام حصوں میں متحرک دکھائی دیتا ہے، ابہام کی پرچھائیاں اس کے گرد بھی لپٹی نظر آتی ہیں جن کی وضاحت کرنے کے لیے حیدر قریشی کو یہ لکھنا پڑا:

''سدھارتھ کی مجموعی شخصیت کو دیکھیں تو یہ ایک ایسی

مضطرب روح ہے جو علم کی بجائے دانائی کی کھوج میں
ہے۔ جو ترکِ دنیا کر کے بھی دنیا سے دور نہیں جا پاتی اور
دنیا کے اندر اتر کر بھی اپنے اندر کے تیاگی سے نجات نہیں
پا سکتی۔ یہی اس کی اصل کشمکش ہے۔'' (۹۲)

حیدر قریشی نے ہرمن ہیسے کے ناول میں چھپے اس مرکزی دھارے کی کھوج لگائی ہے جس کی جانکاری ناول کے مشکل مقامات کو آسان بنا دیتی ہے۔ سید احتشام حسین بھی ذمہ دار نقاد سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ:

اُس فلسفے کو ڈھونڈ نکالے جو ادیب کے خیالوں کو ایک
مربوط شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس طرح یقیناً
ایک منزل میں تو نقاد کو بھی ادیب کے ساتھ ہر وادی و
کوہسار میں چلنا پڑے گا۔'' (۹۳)

اگر سید احتشام حسین کے اس وقیع بیان کو بغور پڑھا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ نقاد کے تشریحی اور توضیحی فرائض ہی کی بات کر رہے ہیں۔ ادیب کے اصل فلسفے تک وہی نقاد رسائی حاصل کرے گا اور پھر تنقیدی اُسلوب میں پیش کرنے کی ہامی بھرے گا جو پہلے خود فہم وادراک کے مراحل طے کر چکا ہو۔ اگر فن پارے نے اس پر اپنے باطنی اسرار اور بھید کھولے ہیں تو وہ اپنے تنقیدی عمل میں دوسروں کو بھی شریک کرتا جائے گا اور یوں تفہیم کی منزل سر ہوتی چلی جائے گی۔ حیدر قریشی کے تنقیدی عمل کی بنیاد ہی تشریح وتوضیح ہے۔ اس لگاؤ کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اُنھیں منشا یاد کا پچاس افسانوں پر مشتمل کلیات ''شہر فسانہ'' ملا تو اس ضخیم کتاب کا مطالعہ تمام کرنے کے بعد ایک طویل تنقیدی مضمون قلم بند کیا اور اُس میں کمال اختصار کے ساتھ پچاسوں افسانوں کے مرکزی خیال پر توضیحی اشارے لکھ ڈالے۔ یہ اشارے مختصر ہونے کے باوجود اتنے واضح اور جامع ہیں کہ محض انھیں پڑھ کر اصل افسانے کا تاثر ذہن میں تازہ کیا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی نے ان توضیحی اشاروں، اسالیب، موضوعات، کردار، پلاٹ، وحدتِ تاثر اور علامتوں پر بات کی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد تنقیدی مضمون ہے۔

(۵) معروضی تنقید

ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی معروضی تنقید کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ادبی نصوص کی ذاتی قیمت اور اضافی مقام کا تعین
، معروضی تنقید ہے۔ اصطلاح میں معروضی تنقید، ادبی
عبارتوں کو پرکھنے، ان کا صحیح اندازہ، اُن کا مقام اور مرتبہ
متعین کرنے کو کہتے ہیں۔'' (۹۴)

اس شعبۂ علم کے ناقد میں درج ذیل اوصاف کا ہونا احسن ہے:

''معروضی نقاد کا ثاقب النظر، سریع الخاطر اور مہذب
الذوق ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ
ادیب کے ساتھ میلانِ طبع اور اس کے فطری جذبے میں
شریک ہو۔'' (۹۵)

معروضی تنقید میں عموماً جذبہ، خیال، مواد اور ہیئت پر بات کی جاتی ہے۔ معروضی تنقید کا ناقد اگر ایک طرف مسئلہ زیرِ بحث پر غیر جانب داری کا ثبوت دیتا ہے تو دوسری جانب وہ اپنے انفرادی ذوق کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ جمالیاتی قدروں اور اسلوبیاتی اوصاف پر بات کرنا معروضی تنقید کے اہم زاویے ہیں۔ ہمارے ہاں معروضی تنقید کی اصطلاح جس یک رخے پن کا شکار ہو کر رہ گئی تھی، ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی نے اس کے وصفی اور شخصی پہلوؤں کو واضح کر کے اس کا قبلہ درست کر دیا ہے۔

حیدر قریشی کی تحریروں میں معروضی تنقید کا عنصر اپنے تمام مثبت پہلوؤں کے ساتھ موجود ہے۔ اس ضمن میں ذوق و وجدان کی رہنمائی بھی وہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے مروجہ اسالیب سے اپنی الگ راہ نکالتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تنقیدات اصل فن پارے کے صوری اور معنوی حسن کی نقاب کشائی کریں۔ وہ تنقید کی بڑی بڑی اصطلاحات سے نہ خود مرعوب ہوتے ہیں اور نہ دوسروں پر رعب جھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہر تنقیدی مضمون میں اخلاقی مطالبات کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور جذبہ، خیال، مواد اور ہیئت میں خاص تناسب قائم رکھتے ہیں۔ یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

فرحت نواز کی نظموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''فرحت نواز کی نظموں میں شک اور یقین کے درمیان
اٹکی ہوئی ایسی کشمکش ملتی ہے جس نے ان کی نظموں کو ایک
ہلکی سی دھند میں ملفوف کر رکھا ہے۔ اس سے معنی کی
ترسیل میں کوئی رکاوٹ بھی پیدا نہیں ہوتی اور کشمکش کی
لہریں معنی کی ایک سے زائد پرتوں کی صورت دکھائی
دینے لگتی ہیں۔'' (۹۶)

ہمت رائے شرما کے افسانوں پر رائے ملاحظہ ہو:

''ہمت رائے شرما جی کے افسانوں میں مقصد کو بے شک
فوقیت حاصل ہے تاہم ان میں ادبی رنگ شامل ہے

۔کہیں کہیں انہوں نے طویل ڈائیلاگ کے ذریعے
حصول مقصد کے لئے راہ ہموار کی ہے تو کہیں طنز ومزاح
سے کام لے کر درد کی شدت کو کم کرنے کی کاوش کی
ہے۔''(۹۷)

اکبر حمیدی کی غزلوں پر یہ رائے توجہ طلب ہے:

''اکبر حمیدی کی غزلیں پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اکبر حمیدی نے بعض موضوعات کو مَس
کرنے کے باوجود خود کو ہنگامی شاعر بننے سے نہ صرف بچایا ہے بلکہ اپنے زندہ رہنے والے
شعروں کے باعث ان ہنگامی موضوعات کو بھی تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے۔اردو غزل میں
یہ اپنی نوعیت کا کارنامہ ہے۔''(۹۸)

ان اقتباسات کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ حیدر قریشی نے معروضی تنقید کے دونوں پہلوؤں یعنی وصفی اور شخصی کو اپنی تنقیدات میں فعال رکھا ہے۔ان تجزیوں میں بالغ نظری اور سنجیدہ علمی فکر کارفرما نظر آتی ہے۔جدید نقادوں کے ہاں ایک خرابی یہ در آئی ہے کہ وہ اپنی اصطلاحوں کے معنی متعین کیے بغیر بات کو طول دیتے ہیں جبکہ حیدر قریشی نے صاف شفاف لفظوں میں دل کی بات کہہ دی ہے۔ان کے پیش کردہ تحلیلی جائزے فن پارے کی متعین دلالتیں روشن کرتے ہیں۔

اگر ایسی تنقید تخلیقی درجے پر فائز ہو جائے تو اُس پر حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

(۶) فکری عناصر

تنقید اپنی اصل کے اعتبار سے ایک فکری سرگرمی ہے لیکن اس کا اظہار ہر ناقد کے بس کی بات نہیں۔نئی تنقید نے اب دیگر سماجی علوم وفنون سے استفادہ بھی شروع کر دیا ہے جس کی بدولت ہماری تنقید میں فکری عناصر کی شمولیت پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی رقم طراز ہیں:

''دانتے،سنجیدہ اور اعلیٰ ادب کا اوّلین عنصر موضوع،مواد اور فکر کو قرار دیتا ہے۔''(۹۹)

معیاری اور عمدہ تنقید میں بھی یہی عناصر موجود ہوتے ہیں۔کیا ایسی تنقید جو فکر و جذبے سے عاری ہو اسے ہم معیاری تنقید کہہ سکتے ہیں؟

حیدر قریشی کے تنقیدی تاثرات اور مضامین میں فکری عناصر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ڈاکٹر شہناز نبی کی کتاب ''تانیثی تنقید'' پر وہ جن فکری سوالات کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا:

''عورت کا کردار جو نئی ڈیفی نیشن چاہتا ہے،اسے زیادہ

واضح کر کے پیش کیا جانا چاہیے۔کیا یہ مرد وزن کے برابر
کے حقوق تک کا مطالبہ ہے یا اس سے بھی آگے کی کوئی
بات ہے۔''(۱۰۰)

اس مضمون میں یہ جملہ بھی موجود ہے:

''اگر صرف تانیثی ادب پر توجہ مرکوز کی گئی تو نیک نیتی کے
باوجود خواتین قلم کاروں کا الگ ڈبہ خود بخود بن جائے گا
۔''(۱۰۱)

ترقی پسند نظم پر اُن کی رائے دعوتِ فکر دیتی ہے:

''ترقی پسند نظموں میں عمومی طور پر تیز نعروں کی آندھی
کے باعث تخلیقی لو بجھ جاتی ہے۔اسی لیے ترقی پسند نظمیں
عام طور پر سپاٹ سٹیٹمنٹ سے آگے نہیں بڑھ
پاتیں۔''(۱۰۲)

یہ مثالیں واضح کرتی ہیں کہ حیدر قریشی کی تخلیقی تنقید میں فکری عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور قاری کو ان کی تحریروں میں کے ذریعے اصل فن کے پارے کے بارے میں کافی کچھ مل جاتا ہے۔

(۷) عصری آگہی

عصری آگہی کا محض اتنا ہی مفہوم نہیں ہے کہ ادیب یا ادب اپنے عہد کی سرگرمیوں اور تبدیلیوں سے واقف ہو کیونکہ یہ واقفیت تو ایک عام صحافی کو بھی حاصل ہوتی ہے،اس کے اصل مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''ادب کی اصل کارکردگی اس بات میں ہے کہ وہ خود
آئینہ بن کر عصر کے آئینے کے روبرو آ جائے۔اگر ایسا ہو تو
پھر ادب اور عصر دو متوازی قوتوں کی طرح ایک دوسرے
کو متحرک،مرتعش اور منعکس کرنے لگیں گے۔''(۱۰۳)

حیدر قریشی کے تنقیدی وژن میں عصری آگہی کا یہی ارفع مفہوم پایا جاتا ہے۔انھوں نے جہاں اپنی عصری تنقید میں نقد و نظر،تحقیق و تنقیح،موازنہ و مقابلہ اور تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے وہاں اُردو ادب کے بڑے بڑے مسائل کو عمرانی،نفسیاتی،سیاسی،اقتصادی اور اخلاقی سطحوں پر زیرِ بحث لانے کی شعوری کاوش بھی کی ہے۔اس حوالے سے ان کے درج ذیل مضامین خصوصی توجہ کے مستحق ہیں:

۱۔ مغربی ممالک میں اُردو ادب کی صورت حال
۲۔ یورپ کی نوآبادِ اُردو بستیوں میں اُردو کا مستقبل
۳۔ مغربی ممالک میں اُردو کی صورتِ حال
۴۔ یہ ایک صدی کا قصہ ہے
۵۔ اُردو زبان اور ادب کے چند مسائل
۶۔ تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اُردو کا منظر
۷۔ یورپی ممالک میں اُردو شعروادب۔ایک جائزہ
۸۔ اردو نظم روایت سے جدیدیت تک
۹۔ ایٹمی جنگ کا خطرہ
۱۰۔ مابعد جدیدیت:اور عالمی صورتِ حال

ان مضامین کا مطالعہ یہ باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ حیدر قریشی عصری مسائل وعوارض پر گہری نظر رکھنے والے ادیب اور نقاد ہیں۔ان تحریروں میں موضوع کی تہہ داری، دردمندی، بصیرت، فکری سنجیدگی، جدید رجحانات کے اشارے، نئے طرزِ احساس کی ضرورت، حقائق شناسی اور دانش وری کے عصری نقوش وافر مقدار میں مل جاتے ہیں۔انکشاف وعرفان کے یہ مراحل جب خوش اُسلوبی سے طے ہونے لگتے ہیں تو ڈاکٹر وزیر آغا کی بات سچ نظر آنے لگتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

''ادیب جب اپنے عصر کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے تو
اس کے اندر کی تخلیقی مشین متحرک ہو کر اسے روحِ عصر
سے ہم رشتہ کر دیتی ہے۔پھر جب وہ ادب تخلیق کرتا ہے
تو اس میں محض ان دونوں کا امتزاج نہیں ہوتا بلکہ تخلیق
کار کی اپنی ذات کی آمیزش سے ایک ایسی شئے خلق ہو
جاتی ہے جو بے مثال بھی ہوتی ہے اور لازوال
بھی۔''(۱۰۴)

یہ بیان اپنی جگہ صداقت کا حامل ہے اور گہرے غوروفکر کا متقاضی ہے۔حیدر قریشی کے تنقیدی عمل میں یہی عصری آگہی فعال نظر آتی ہے، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ روحِ عصر کو اپنے شعور کا حصہ بنا کر لکھتے ہیں۔اُن کا ذہنی اُفق معاصر تنقیدی منظرنامے میں منفرد شناخت کا حامل ہے۔طولِ کلام سے دامن بچاتے ہوئے محض چند ضروری حوالوں کی نشاندہی کی جارہی ہے۔یہ مثال گزشتہ مباحث پر بھی روشنی ڈالتی ہے:

''اہلِ مغرب کی اپنی ترجیحات ہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے
میں اُردو کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔اب ویسی اہمیت عربی اور
جاپانی کو دی جارہی ہے تو اہلِ مغرب کے ''نظریۂ ضرورت'' کو سمجھا
جاسکتا ہے۔ساختیات کے مغربی دانشوروں نے جس طرح جنرل
تھیوری کا حربہ آزمانے کی کوشش کی تھی کہیں ادب کے عالمی دھارے
کا بھی ویسا ہی مقصد تو نہیں ہے؟''(۱۰۵)

ادب کے حوالے سے لوگوں کے بدلتے رویوں کو حیدر قریشی نے جس نظر سے دیکھا اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''ادب کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے کی بجائے
کمی آرہی ہے۔مادہ پرستی کے غلبہ سے لے کر ٹی وی
چینلز تک اس کے بہت سے اسباب ہیں۔لیکن ایک بڑا
سبب خود ادیبوں کی ادب سے بے توجہی ہے جو ادبی شعور
کی کمی یا ادبی شعور نہ ہونے کے باعث ہے۔''(۱۰۶)

ان اسباب کا جائزہ لینے کے بعد وہ کچھ اور ادبی مسائل کو قدرے وسیع تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

''جدید عصری تقاضے اپنی جگہ اہمیت کے حامل
ہیں۔کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی شان نے اہلِ
دنیا کو حیران کر رکھا ہے۔تاہم تخلیقی ادب، کسی تقاضے اور
ڈیمانڈ کو پیش نظر رکھ کر تخلیق نہیں ہوتا۔نئے عصری
تقاضوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لیکن وہ
سارے اثرات ہر تخلیق کار پر اس کی صلاحیت اور توفیق
کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور اپنی داخلی تخلیقی قوت کے
ساتھ ہی وہ ان کا اظہار کر پاتا ہے۔''(۱۰۷)

حیدر قریشی کے ہاں عصری آگہی کا شعور تہذیبی اور علمی تناظرات بھی مہیا کرتا ہے۔ان کی تحریروں میں عصری آگہی کے دو دائرے بنتے نظر آتے ہیں۔پہلے دائرے میں اُن کے ذاتی مشاہدات وتجربات اور علمی رویے شامل ہیں اور دوسرے دائرے میں ان کی فکر آفاقی قدروں کو خود میں سمیٹتے نظر آتی ہے، اگر وہ چاہتے تو اپنے معاصرین کی طرح یہ تمام مسائل علامتی اُسلوب میں پیش کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے اپنی تنقید کو علامتی ابہام سے دور رکھا اور وضاحتی انداز اپناتے ہوئے دل کی بات کہہ دی ہے۔تاہم دل کی اس بات میں تفکر اور تعقل کا عنصر اپنی جگہ پوری توانائی کے

ساتھ موجود ہے۔علامت اور تجرید کی صورت گری ان کے تخلیقی عمل خصوصاً غزل اور افسانے میں تو صاف نظر آتی ہے لیکن ان کی تنقید میں وضاحت کے تمام اسالیب موجود ہیں۔اُس اسلوب کو بھی ان کی عصری آگہی کا لازمی جز شمار کرنا چاہیے۔

(۸) تخلیقی اُسلوبِ تنقید

حیدر قریشی نے اپنے دوسرے تنقیدی مجموعے ''تاثرات'' کے دیباچے (عرضِ حال) میں یہ اعتراف کیا تھا:

''میرے سارے تنقیدی مضامین کی کتابوں میں درج
میرے سارے تنقیدی مضامین کو میرے تاثرات ہی سمجھا
جانا چاہیے،ایک قاری کے تاثرات ......ایک تخلیق کار
کے تاثرات۔''(۱۰۸)

حیدر قریشی بذاتِ خود ایک اچھے اور سنجیدہ تخلیق کار ہیں۔ان کی ادبی سرگرمیوں میں شاعری، انشائیہ نگاری، یاد نگاری، خاکہ، نگاری، افسانہ نگاری اور سفر نامہ نگاری کا خاصا اہم حصہ ہے۔یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں کم و بیش یہی مذکورہ موضوعات زیرِ بحث نظر آتے ہیں۔اگر غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر قریشی نے اپنی تنقید کے ذریعے تخلیقی عمل کو ہی از سرِ نو دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔بازیافت کا یہ عمل زیادہ تر شاعری اور افسانوی اصناف تک محدود رہا ہے اور ان کے اپنے تخلیقی منظر نامے کو نئے حوالے سے متعارف کراتا ہے۔اگرچہ وہ خود اچھے شاعر اور اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی تنقیدی زبان شعری اور افسانوی اسالیب سے قصداً گریز کرتی نظر آتی ہے اور یہی وصف ان کی تنقیدات میں اعتبار و وقار قائم کرتا ہے۔

تنقید اور تخلیق کے باہمی ارتباط پر ڈاکٹر وزیر آغا کا نقطۂ نظر بھی اچھی معلومات فراہم کرتا ہے:

''جدید اُردو تنقید نے تخلیق اور تخلیقی عمل کے ساتھ جو
معاملہ کیا ہے،اس سے تخلیق کے تجزیاتی مطالعے کی روش
کو تحریک ملی ہے اور متن کے اعماق میں چھپے ہوئے وہ
معانی سطح پر آئے ہیں جن سے خود مصنف بھی بظاہر آشنا
نہیں ہوتا۔یوں گویا تخلیق کو از سرِ نو تخلیق کر کے، نہ صرف
خود تخلیقی تجربے سے گزرا ہے بلکہ اس نے قاری کو بھی
تخلیق مکرر کی مدد سے جمالیاتی حظ کی تحصیل کا موقع فراہم
کر دیا ہے۔''(۱۰۹)

حیدر قریشی نے نئی اور جدید تنقید کی اس جہت کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔ان کے پیش کردہ

تجزیات میں تفہیم اور توضیح کا عمل پہلو بہ پہلو ملتا ہے۔اسی خوبی کی وجہ سے اپنی جچی تلی آرا اور مدلل اندازِ نگارش کی بدولت قارئین کے حلقے کو وسیع بنا دیا ہے۔

تنقیدی اصول جب تخلیقی سطح پر برتے جاتے ہیں تو پھر اُسلوب میں ایک خاص نوع کی نامیاتی حرارت پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث تنقیدی مضمون قاری کے دل و دماغ پر خوش گوار اثرات مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔حیدر قریشی کے ہاں یہ تمام کیفیات موجود ہیں۔

(۹) ادبی دیانت داری

حیدر قریشی نے اپنے تمام تنقیدی محاکموں میں ادبی دیانت داری کے اہم تقاضوں کو مدِ نظر رکھا ہے۔تنقیدی عمل ان کے نزدیک ایک ایسا سماجی وظیفہ ہے جسے حقیقت نگاری کی بنیادوں پر استوار کر کے ہی آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کئی مقامات پر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا تنقیدی اُسلوب روایتی سانچوں سے قدرے مختلف ہوتا جا رہا ہے۔تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی ادبی دیانت اور تہذیبی شرافت ادب کی تعمیری قوتوں کو مہمیز لگاتی چلی جاتی ہے۔ان کی تنقید افراط و تفریط سے بچتے بچاتے تلاش و توازن کے سفر پر گامزن رہتی ہے اور انفرادی تجربے اور مشاہدے کو اجتماعی شعور میں ڈھالنے کا سلیقہ جانتی ہے۔

ہمارے ہاں محض کتاب کو دیکھ کر تنقیدی مضامین لکھنے کا رواج عام ہے،خصوصاً تقریباتی مضامین اسی اصول پر لکھے جاتے ہیں (اگرچہ سنجیدہ نقاد ایسا نہیں کرتا) لیکن حیدر قریشی کے تنقیدی مضامین پڑھ کر علم ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کو از اوّل تا آخر پڑھ کر قلم اٹھاتے ہیں۔ان کے پیش کردہ تجزیات پڑھ کر قاری جان جاتا ہے کہ یہ آرا گہرے مطالعے کے بعد تحریر کی گئی ہیں۔ایک مثال دیکھئے:

''اس ناول میں دو مردوں میں بٹی ہوئی محبت کے کچے
جذبوں کو پختہ زبان میں بیان کیا ہے۔جذبات کے کچے
پن اور الفاظ کی پختگی نے اس ناول کو ایک دل چسپ
انداز عطا کر دیا ہے۔''(۱۱۰)

غلام جیلانی اصغر کے شعری مجموعہ ''میں اور میں'' پر اظہار کرتے ہوئے حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''غلام جیلانی اصغر کی نظموں کا مزاج بنیادی طور پر ترقی
پسند شعراء کی نظمیہ شاعری کی توسیع ہے۔نظموں کے بہت
سارے ٹکڑوں کا غزلیہ انداز اگرچہ راشد کے ہاں ''ایران
میں اجنبی'' کی فارسیت کے زیرِ اثر بھی ابھرا ہے لیکن ان
کی نظموں میں غزلیہ انداز نظموں کا واضح اور فیصلہ کن

اختتام ان کو فیض ،ساحؔر اور احمد ندیم قاسمی کے ساتھ
جوڑتا نظر آتا ہے۔''(۱۱۱)

البتہ زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب حیدر قریشی منشایاد کے کلیات ''شہر فسانہ'' کے پچاس افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ ایک ہی مضمون میں پیش کرتے ہیں۔یہ مضمون ''حاصلِ مطالعہ'' میں شامل ہے۔اس طرح کی تحریروں سے قاری کو یہ اعتبار بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس تحریر کا مطالعہ کر رہا ہے وہ محض فرضی اندازے نہیں ہیں بلکہ ایک ناقد کی ادبی دیانت کے بے لاگ تنقیدی تبصرے ہیں۔

(۱۰) موضوع اور اُسلوب کی سنجیدگی

حیدر قریشی کے تنقیدی مضامین میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔ان کا باطنی ردِ عمل جذبات کا اظہار تو کرتا ہے لیکن اس میں جذباتیت کا کوئی عنصر موجود نہیں ہوتا۔اگر وہ چاہتے تو اُسلوب کے آزادانہ استعمال سے من مانی کی صورتیں پیدا کر سکتے تھے مگر اپنے اسلوب کو حقائق کی بازیافت اور تحلیل و تجزیے کیلئے وقف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اُسلوب کے بنیادی اوصاف پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اُسلوبیات کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کوئی
خیال،تصور، جذبہ، یا احساس زبان میں کئی طرح بیان کیا
جا سکتا ہے۔زبان میں اس نوع کی یعنی پیرائیہ بیان کے
اختیار کی مکمل آزادی ہے۔شاعر یا مصنف قدم قدم پر
پیرائیہ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔پیرائیہ بیان
کی آزادی کا استعمال شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری
بھی، اور اس میں ذوق،مزاج،ذاتی پسند و ناپسند،صنف
یا ہیئت کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کو بھی
دخل ہو سکتا ہے۔''(۱۱۲)

سید عابد علی عابد نے انھی عناصر کو اُسلوب کی جذباتی،تخیلی اور جمالیاتی اوصاف قرار دیا ہے۔اُسلوب کی سنجیدگی کا تعلق اصلاً جذباتی وصف کے ساتھ جا ملتا ہے۔یہ وصف خیال افروزی کے تابع ہوتا ہے۔اُسلوب کی یہ خاصیت فن پارے کی تہہ داری میں اضافہ کرتی ہے اور تنقید میں اس کی موجودگی دلائل و براہین کو باوقار انداز سے پیش کرتی ہے۔حیدر قریشی کے تنقیدی مضامین میں اس وصف کی خاصی مثالیں موجود ہیں۔محض چند نمائندہ مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔اُسلوب کی یہ سنجیدگی اس وقت واضح صورت اختیار کر لیتی ہے جب وہ کسی ادیب یا فن پارے کا موازنہ دوسروں کے ساتھ کر رہے ہوتے تھے:

''اکبر حمیدی اپنے انداز کا پہلا رزمیہ شاعر ہے اور اس کی
رزمیہ غزلوں کا ترقی پسند رزمیہ شاعری یا اقبال کی رزمیہ
کی روایت سے کوئی تعلق نہیں۔ترقی پسندوں اور اقبال
دونوں کے ہاں ایسی شاعری میں جارحانہ انداز ملتا ہے
جبکہ اکبر حمیدی مدافعانہ انداز میں کھڑا ہے۔''(۱۱۳)

شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ناول کی ایک اور خوبی جس نے مجھے شروع میں چونکا دیا
وہ کسی تصویر کی پراسراریت کا احساس دلانا تھا۔بنی ٹھنی
کی تصویر کے بارے میں پرانی روایت کے بیان سے
لے کر من موہنی کی تصویر تک.....''(۱۱۴)

ایسی مثالوں سے ان کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔حیدر قریشی کے ہاں سنجیدگی کا عمل متنوع اُسلوبیاتی مظاہر میں ڈھل کر مجسم ہوتا ہے۔یہ اُسلوب جہاں سادگی اور سنجیدگی کا زائیدہ ہے وہاں بے ساختگی، بے تکلفی اور مدعا نویسی کو بھی ہم راہ رکھتا ہے۔ایجاز و اختصار اور خیال کی ارفعیت جیسے اہم عناصر اپنے مقام پر نظر آتے ہیں۔

اُسلوب کی سنجیدگی کا بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ناقد غیر ضروری مباحث کے بجائے اصل موضوع کے حوالے سے بات کرتا ہے۔اس طرح ناقد کے اپنے افکار و نظریات اور افتادِ طبع پر بھی روشنی پڑتی ہے۔یہ اُسلوب کا وہ آہنگ ہے جہاں فکر و تخیل اُفقی اور عمودی سطحوں پر اظہار کی قوت حاصل کرتے ہیں۔حیدر قریشی نے اس سنجیدگی کو داخلی اور خارجی حوالوں سے منکشف کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اگر ان کے ہاں بھی دوسرے نقادوں کی طرح شوخ و شنگ جملے اور تجزیات در آتے ان کی مدعا نویسی اور منطقیت کو سخت نقصان پہنچتا۔یہ سنجیدگی ان کی پختہ فکری اور شخصی وقار کا لازمی حصہ ہے۔یہی معیاری اُسلوب ان کی تنقید کو معتبر بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حامد اللہ افسر،تنقیدی اُصول اور نظریے،کوہ نور پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۶۴ء،ص۱۹۲۰

2- Cuddon.,A Dictionary of Literary Terms,Penguine,1992,London,PNo166

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی،تعبیر کی شرح،اکادمی بازیافت،کراچی،۲۰۰۴ء،ص۶۹

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی،تعبیر کی شرح،ص۶۹
۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی،تعبیر کی شرح،ص۶۹
۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا،تنقید اور جدید اردو تنقید،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۱۹۸۹ء،ص۱۶
۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر،تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت) سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء،ص۹۶
۸۔ حیدر قریشی،مغربی ممالک میں اردو کی صورت حال (مضمون)،مشمولہ،تاثرات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۲ء،ص۲۷
۹۔ حیدر قریشی،مغربی ممالک میں اردو کی صورت حال (مضمون)ص۲۸
۱۰۔ مغربی ممالک میں اردو کی صورت حال (مضمون)ص۲۹،۲۸
۱۱۔ مغربی ممالک میں اردو کی صورت حال (مضمون)ص۳۰
۱۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،ادب کی صورت حال (مضمون) مشمولہ معاصر ادب،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور۔۱۹۹۱ء،ص۱۶
۱۳۔ حیدر قریشی،یورپ کی نوآباد اُردو بستیوں میں اُردو کا مستقبل (مضمون) مشمولہ،تاثرات،ص۲۵،۲۴
۱۴۔ مغربی ممالک میں اُردو کی صورتِ حال (مضمون)ص۳۰
۱۵۔ حیدر قریشی،ڈاکٹر حامد اشرف کی تنقید نگاری (مضمون) مشمولہ،تاثرات،ص۹۷
۱۶۔ ڈاکٹر حامد اشرف کی تنقید نگاری،ص۹۷
۱۷۔ حیدر قریشی،''تاثر اور تنقید''عبدالرب اُستاد کے مضامین کا مجموعہ (تبصرہ) مشمولہ تاثرات،ص۹۶
۱۸۔ حیدر قریشی،''تاثر اور تنقید''،ص۹۵
۱۹۔ حیدر قریشی،نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (تبصرہ) مشمولہ،تاثرات،ص۹۹
۲۰۔ نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (تبصرہ) ص۱۰۰
۲۱۔ ایلیٹ.ٹی.ایس،تنقید کا منصب (مضمون) مشمولہ ایلیٹ کے مضامین،مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۹ء،ص۲۶۰
۲۲۔ ایلیٹ.ٹی.ایس،تنقید کا منصب (مضمون) ص۲۵۸
۲۳۔ حیدر قریشی،ہمت رائے شرما کی دو کتابیں (مضمون) مشمولہ حاصلِ مطالعہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۰۸ء،ص۱۰۷
۲۴۔ حیدر قریشی،''بے ارادہ''کے افسانے،مشمولہ حاصلِ مطالعہ،ص۱۳۷
۲۵۔ حیدر قریشی''بے ارادہ''کے افسانے،ص۱۳۸

۲۶۔ آلِ احمد سرور،فکشن کیا؟ کیوں؟اور کیسے؟ (مضمون) مشمولہ نظر اور نظریے،اُردو اکیڈمی سندھ،کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۷۱
۲۷۔ حیدر قریشی،پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں (مضمون) مشمولہ،تاثرات ص۹۱
۲۸۔ حیدر قریشی،پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں (مضمون) مشمولہ،تاثرات ص۹۱
۲۹۔ آلِ احمد سرور،فکشن کیا؟ کیوں؟اور کیسے (مضمون) ص۶۰
۳۰۔ حیدر قریشی،کئی چاند تھے سرِ آسماں (مضمون) مشمولہ،حاصل مطالعہ،ص۱۶۹
۳۱۔ کئی چاند تھے سرِ آسماں (مضمون)ص۱۶۹
۳۲۔ کئی چاند تھے سرِ آسمان (مضمون)ص۱۶۹
۳۳۔ کئی چاند تھے سرِ آسمان (مضمون)ص۱۷۰
۳۴۔ حیدر قریشی،ایک دن بیت گیا (مضمون) مشمولہ حاصل مطالعہ،ص۱۷۵
۳۵۔ نورالحسن نقوی،فنِ تنقید اور اُردو تنقید نگاری،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۰ء،ص۴۳
۳۶۔ حیدر قریشی،ایک دن بیت گیا (مضمون)ص۱۷۶
۳۷۔ حیدر قریشی،جمیل زبیری کے سفرنامے،مشمولہ حاصلِ مطالعہ،ص۸۹
۳۸۔ حیدر قریشی،جمیل زبیری کے سفرنامے،ص۸۹
۳۹۔ حامد اللہ افسر،تنقیدی اُصول اور نظریے،ص۲۳
۴۰۔ حیدر قریشی،جمیل زبیری کے سفرنامے،ص۹۱
۴۱۔ حیدر قریشی،ابنِ بطوطہ کا سفرنامہ،مشمولہ''تاثرات''،ص۱۲۹
۴۲۔ حیدر قریشی،اوراقِ گم گشتہ (مضمون) مشمولہ حاصل مطالعہ،ص۵۸
۴۳۔ حیدر قریشی،میراجی،شخصیت اور فن،مشمولہ،حاصل مطالعہ،ص۶۵
۴۴۔ محمد حسن عسکری،کچھ اُردو نثر کے بارے میں (مضمون) مشمولہ مجموعہ محمد حسن عسکری،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۴ء،ص۲۹۹
۴۵۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا،اُردو میں سوانحی ادب:فن اور روایت،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۱۹
۴۶۔ حیدر قریشی،تمنا بے تاب (تبصرہ) مشمولہ حاصل مطالعہ،ص۱۸۹
۴۷۔ تمنا بے تاب (تبصرہ)ص۱۸۹
۴۸۔ تمنا بے تاب (تبصرہ)ص۱۸۹
۴۹۔ تمنا بے تاب (تبصرہ)ص۱۹۱

۵۰۔ حیدرقریشی، یادخزانہ(مضمون)مشمولہ حاصل مطالعہ،ص۱۹۳

۵۱۔ حیدرقریشی، یادخزانہ(مضمون)،ص۱۹۳

۵۲۔ حیدرقریشی، ایک آواز(تبصرہ)،مشمولہ، تاثرات،ص۱۳۵،۱۳۴

۵۳۔ حیدرقریشی، ایک آواز(تبصرہ)،ص۱۳۵

۵۴۔ حیدرقریشی، اکبرحمیدی کی غزلیں، ایک مطالعہ(مضمون)مشمولہ، حاصل مطالعہ،ص۲۰۰

۵۵۔ حیدرقریشی، اکبرحمیدی کی غزلیں، ایک مطالعہ(مضمون)،ص۲۰۹

۵۶۔ کرامت علی کرامت، شاخِ صنوبر(شعری مجموعہ)،تبصرہ حیدرقریشی، مشمولہ، تاثرات،ص۱۳۳

۵۷۔ شاداب احسانی، پسِ گرداب(شعری) مجموعہ)،تبصرہ حیدرقریشی، مشمولہ تاثرات،ص۱۴۳

۵۸۔ حیدرقریشی، ہم کہ ٹھہرے اجنبی(مضمون)،مشمولہ تاثرات،ص۱۵۸

۵۹۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی(مضمون)ص۱۵۹

۶۰۔ حیدرقریشی، پروین شاکر، نسائی شاعری کی آن(مضمون)مشمولہ، حاصل مطالعہ،ص۱۹۷

۶۱۔ حیدرقریشی، پروین شاکر، نسائی شاعری کی آن(مضمون)ص۱۹۷

۶۲۔ ممتازحسین، تنقید کے چند بنیادی مسائل،(مضمون)مشمولہ ادب اور شعور، اُردو مرکز، کراچی، ۱۹۶۱،ص۱۸۰

۶۳۔ سیدخالد جامعی، سرقے کی روایت تاریخ کی روشنی میں(مضمون)مشمولہ جریدہ، شمارہ نمبر۲۷، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۴ء،ص۱

۶۴۔ غلام محمد قاصؔر، بحوالہ اُردو غزل کا انتقام از حیدرقریشی، مشمولہ تاثرات،ص۱۸۹

۶۵۔ اُردو غزل کا انتقام،ص۱۸۹

۶۶۔ اُردو غزل کا انتقام،ص۱۹۲

۶۷۔ حیدرقریشی، عمران شاہد بھنڈر کی مضحکہ خیزیاں، جعل سازیاں اور سرقہ، مشمولہ تاثرات،ص۲۰۹

۶۸۔ حیدرقریشی، عمران شاہد بھنڈر کی مضحکہ خیزیاں، جعل سازیاں اور سرقہ، مشمولہ تاثرات،ص۲۰۹

۶۹۔ حیدرقریشی، پروین کمار اشک کے ماہیے(مضمون)مشمولہ اُردو ماہیا تحقیق وتنقید، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء،ص۱۴۹

۷۰۔ حیدرقریشی، نذیر فتح پوری کے ماہیے(مضمون)مشمولہ، اُردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۱۵۶

۷۱۔ حیدرقریشی، پیپل کی چھاؤں میں(پیش لفظ)مشمولہ اُردو ماہیا تحقیق وتنقید،ص۴۲۸

۷۲۔ ممتازحسین، تنقید کے چند بنیادی اُصول(مضمون)مشمولہ، ادب اور شعور، اُردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ء،

ص۱۶۹

۷۳ حیدرقریشی، عرضِ حال(دیباچہ)مشمولہ تاثرات،ص۱۰

۷۴۔ عرضِ حال(دیباچہ)،ص۱۰

۷۵۔ عرضِ حال(دیباچہ)ص۱۰

۷۶۔ عرضِ حال(دیباچہ)ص۱۰

۷۷۔ ڈاکٹر ناصرعباس نیرؔ، جدیدیت کی فکری اساس، مشمولہ، نقاط، شمارہ نمبر۵، دسمبر۲۰۰۷ء، پورب اکادمی، اسلام آباد،ص۴۴

۷۸۔ حیدرقریشی، ابتدائیہ(دیباچہ)مشمولہ حاصل مطالعہ،ص۱۰

۷۹۔ حیدرقریشی، ابتدائیہ(دیباچہ)،ص۹

۸۰۔ حیدرقریشی، عبداللہ جاوید کثیر الجہت ادیب(مضمون)مشمولہ، تاثرات،ص۴۵

۸۱۔ حیدرقریشی، تاثر اور تنقید،(مضمون)مشمولہ تاثرات،ص۹۵

۸۲ حیدرقریشی، ''بےارادہ'' کے افسانے(مضمون)مشمولہ، حاصل مطالعہ،ص۱۳۷

۸۳ محمدحسن عسکری، تنقید کا فریضہ(مضمون)مشمولہ مجموعہ حسن عسکری،ص۲۶۰

۸۴۔ حیدرقریشی، تیسرے ہزاریے کے آغاز پراُردو کا منظر(مضمون)مشمولہ، حاصل مطالعہ،ص۲۷

۸۵ تیسرے ہزاریے کے آغاز پراُردو کا منظر،ص۲۷

۸۶۔ حیدرقریشی، ناصرعباس نیر کی ادبی شخصیت(مضمون)مشمولہ، تاثرات،ص۱۵۷

۸۷۔ حیدرقریشی، نئے تنقیدی مسائل اور امکانات(مضمون)مشمولہ، تاثرات،ص۹۹

۸۸۔ ایلیٹ، ٹی۔ایس، تنقید کا منصب(مضمون)مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی مشمولہ ایلیٹ کے مضامین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء،ص۲۵۸

۸۹۔ تنقید کا منصب(مضمون)ص۲۵۸

۹۰۔ حیدرقریشی، ہرمن ہیسے کا ناول ''سدھارتھ''(مضمون)مشمولہ، تاثرات،ص۳۵

۹۱۔ ہرمن ہیسے کا ناول(مضمون)''سدھارتھ''،ص۳۷،۳۶

۹۲۔ ہرمن ہیسے کا ناول(مضمون)''سدھارتھ''،ص۳۸

۹۳ احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید(مضمون)مشمولہ تنقیدی مضامین، مرتب پروفیسر فضل الحق، ناشر، شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۹۲ء،ص۸۳

۹۴۔ ڈاکٹر وقاراحمد رضوی، معروضی تنقید کیا ہے؟(مضمون)مشمولہ اخبارِ اُردو، شمارہ نمبر۲، جلد۳۲،

فروری،۲۰۱۴ء،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،ص ۸

۹۵۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی،معروضی تنقید کیا ہے؟(مضمون)ص ۹

۹۶۔ حیدرقریشی،فرحت نواز کی نظمیں (مضمون)مشمولہ،تاثرات،ص ۴۷

۹۷۔ حیدرقریشی، ہمت رائے شرما جی کی دو کتابیں (مضمون)مشمولہ حاصل مطالعہ،ص ۱۰۷

۹۸۔ حیدرقریشی، اکبر حمیدی کی غزلیں، ایک مطالعہ(مضمون)مشمولہ حاصل مطالعہ،ص ۲۰۰

۹۹۔ ڈاکٹر باقر سجاد رضوی،مغرب کے تنقیدی اُصول،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۰۵ء،ص ۱۴۷

۱۰۰۔ حیدرقریشی،ڈاکٹر شہناز نبی کی تنقید نگاری (مضمون)مشمولہ،تاثرات،ص ۱۰۵

۱۰۱۔ حیدرقریشی،ڈاکٹر شہناز نبی کی تنقید نگاری (مضمون) ص ۱۰۶

۱۰۲۔ حیدرقریشی، میں اور میں (غلام جیلانی اصغر کے شعری مجموعے پر تاثرات)مشمولہ،تاثرات،ص ۷۱

۱۰۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ادب میں عصریت کا مفہوم،مشمولہ پاکستانی ادب (حصہ نثر)مرتبین ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد،۱۹۹۵ء،ص ۹۱

۱۰۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ادب میں عصریت کا مفہوم،ص ۹۰

۱۰۵۔ حیدرقریشی، یہ ایک صدی کا قصہ ہے(مضمون)مشمولہ، حاصل مطالعہ،ص ۱۵

۱۰۶۔ حیدرقریشی، اُردو زبان وادب کے چند مسائل (مضمون)مشمولہ حاصل مطالعہ،ص ۲۱،۲۰

۱۰۷۔ حیدرقریشی، اُردو زبان وادب کے چند مسائل،ص ۲۱

۱۰۸۔ حیدرقریشی،عرضِ حال (دیباچہ)مشمولہ تاثرات،ص ۱۰

۱۰۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا، چند باتیں وزیر آغا کے ساتھ (مصاحبہ)از شناور اسحاق،مشمولہ نئے مکالمات، مرتب شاہد شیدائی، عابد خورشید، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۰ء،ص ۱۳۰

۱۱۰۔ حیدرقریشی، کسک (تجزیاتی مضمون)مشمولہ تاثرات،ص ۱۴۲

۱۱۱۔ حیدرقریشی، میں اور میں (مضمون)مشمولہ تاثرات،ص ۷۰

۱۱۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اُسلوبیات،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء،ص ۱۵

۱۱۳۔ حیدرقریشی، اکبر حمیدی کی غزلیں ایک مطالعہ(مضمون)مشمولہ، حاصل مطالعہ،ص ۲۰۱

۱۱۴۔ حیدرقریشی، کئی چاند تھے سرِ آسماں (مضمون)مشمولہ حاصل مطالعہ،ص ۱۷۰،۱۶۹

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

باب پنجم

حاصلِ تحقیق

باب پنجم

حاصلِ تحقیق

حیدر قریشی کا اصل نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے تاہم ادبی دنیا میں وہ ''حیدر قریشی'' کے قلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کا آبائی علاقہ خانپور (رحیم یار خان) ہے۔ آپ نے ۱۹۶۸ء میں میٹرک، ۱۹۷۰ء میں ایف اے، ۱۹۷۲ء میں بی اے اور ۱۹۷۵ء میں ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ دورانِ تعلیم وہ ملازمت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۹۲ء میں وہ پاکستان سے ہجرت کر کے جرمنی چلے گئے اور تا حال جرمنی کے ایک خوبصورت شہر ہیئرس ہائم میں مستقل سکونت پذیر ہیں۔

حیدر قریشی جتنا عرصہ پاکستان میں رہے اُس دوران ادبی سطح پر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کر چکے تھے۔ اس دور میں اُن کی ادبی تخلیقات ''اوراق'' (لاہور) روزنامہ نوائے وقت (راولپنڈی) روزنامہ جنگ (راولپنڈی) اور امروز (ملتان) میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ جرمنی جانے کے بعد یہ تمام ادبی سرگرمیاں اپنے جوبن پر نظر آتی ہیں۔ ایک ہمہ جہت ادیب ہونے کی حیثیت سے ادب کی مختلف اصناف مثلاً افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفر نامہ، غزل، نظم، ماہیا، یادنگاری اور تنقید و تحقیق میں معیاری تصانیف کا اضافہ کیا ہے۔

حیدر قریشی کی تخلیقی نثر میں افسانہ نگاری کو خاص مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے اب تک کل ۱۲۷ افسانے تحریر کیے ہیں جو دو مجموعوں کی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' تجدید اشاعت گھر، اسلام آباد نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا جبکہ دوسرا مجموعہ ''قصے کہانیاں'' الگ کتابی شکل میں تو سامنے نہیں آیا البتہ انٹرنیٹ پر موجود رہا جسے کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ''افسانے'' کے زیرِ عنوان بصورت کتاب شائع کر دیا گیا تھا۔ ''افسانے'' کی اشاعت ۱۹۹۹ء میں معیار پبلی کیشنز، دہلی نے کی تھی، ان کے اہم اور نمائندہ افسانوں کے تراجم ہندی اور انگریزی میں ہو چکے ہیں۔

اُنھوں نے جدید اور منفرد اُسلوب میں افسانے لکھے ہیں جن کا بیش تر مواد حقیقی اور معروضی دنیا سے اخذ کیا گیا ہے۔ اردگرد کے روزمرہ مشاہدات و تجزیات کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کے علاوہ علمی مسائل کو بھی اپنے فکر و فن میں خصوصی جگہ دی ہے۔ عالمی مسائل و عوارض کے تناظر میں تین افسانے لائقِ توجہ ہیں:

۱۔ حوّا کی تلاش (مشمولہ: روشنی کی بشارت)
۲۔ گلاب شہزادے کی کہانی (مشمولہ: روشنی کی بشارت)

۳۔کاکروچ (مشمولہ: قصے کہانیاں)

یہ تینوں افسانے عالمی جنگوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اور انسانوں کے مشترکہ مفادات، تنازعات اور خودغرضانہ مقاصد پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں۔حیدرقریشی کے فکری نظام میں اس نوع کے مسائل روپ بدل بدل کر ظاہر ہوتے ہیں اور قاری کے فکر ونظر کو متحرک کرتے ہیں۔اِن افسانوں کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ عالمی جنگ چاہے دنیا کے کسی بھی حصے سے آغاز کرے اُس کے پس منظر میں مشرق اور مغرب دونوں کی سیاسی غلطیاں لازماً کارفرما ہوں گی۔

بہرحال اِن جنگ ناموں کا انجام رجائیت پر مبنی ہے اور حیدرقریشی مستقبل کے منظرنامے سے پُر اُمید نظر آتے ہیں۔یہ افسانے اجتماعی شعور کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

حیدرقریشی کے ہاں موضوعات کا تنوع متاثر کرتا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں حیات وکائنات کے اہم مظاہر مثلاً فلسفۂ تقدیر، رومانیت ،عشق ومحبت ،قومی شعور، اصلاح اور صوفیانہ تجربات کو کامیابی سے بیان کرتے ہیں۔پاک وہند کی تقسیم کے حوالے سے بھی اُن کے افسانے متاثر نظر آتے ہیں۔ان المیوں سے دوچار لوگوں کا احوال پڑھنے والوں پر خاص کیفیت مرتب کرتا ہے،البتہ ایک افسانہ ’’کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار‘‘ قدرے مختلف موضوع پر مشتمل ہے اس میں اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو جھوٹ سچ بول کر جرمنی حکومت کو محض اس لیے دھوکا دیتے ہیں کہ اُن کو جرمنی میں مستقل سکونت کا موقع مل جائے۔

حیدرقریشی نے جہاں فکری عناصر کو فکشنی پیرائے میں بیان کیا وہاں فنی اور اُسلوبیاتی نزاکتوں کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔اِن کے پیش کردہ کردار نامیاتی وحدت کا عمدہ نمونہ بن کر اپنے بھرپور وجود کا احساس دلاتے ہیں۔پلاٹ کی بندش کسی حد تک پیچیدگی کی طرف مائل ہے لیکن حسبِ ضرورت سادہ پلاٹ کا برتاؤ چند جگہوں پر ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔

زبان وبیان کی صفات جگہ جگہ پر روپ بدلتی رہتی ہیں۔شاعرانہ اندازِ بیان کے متوازی روایتی سنجیدہ اظہاریہ بھی موجود ہے۔کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنی بات منوانے کے لیے تمام حدیں پار کرسکتے ہیں،ایسے نازک مقام پر وہ تاریخی حکایات اور اقوالِ زریں کا استعمال کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔اِن عناصر کی موجودگی افسانے کے بعض مقامات ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بناتی ہے۔

حقیقت نگاری کا فن کارانہ اظہار اُن کے ادبی مقاصد کا حصہ ہے اور اس کے حصول کی خاطر وہ علامت اور خیال افروزی کا سہارا لیتے ہیں۔اخفاو تحیر کا یہ عمل افسانے کی مجموعی فضا بہتر بناتا ہے۔ڈرامائیت اِن کے افسانوں کا اہم عنصر ہے۔جس کے باعث افسانوں کے ظاہری اور باطنی تحریکات نئی توانائی حاصل کرتی ہیں۔حیدرقریشی کے اُسلوب کا ایک نمایاں وصف ایجاز واختصار ہے۔جواُن کے موضوعات میں آفاقی تاثر پیدا کرتا ہے۔یہ کہنا غلط نہ

ہوگا کہ اِن کے تمام افسانے سماجی فلاح وبہبود اور اجتماعی مقاصد کا بلیغ اشاریہ ہیں۔

حیدرقریشی کی تخلیقی نثر پر جب بات ہوگی تو اُن کی خاکہ نگاری کا ذکر لازماً آئے گا۔خاکہ نگاری کی صنف پر اُن کی کتاب **’’میری محبتیں‘‘** ادبی حلقوں میں مقبول ہے۔یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول میں اہل خانہ مثلاً والد، والدہ ، دادا، نانا، تایا، ماموں اور بہن پر یادگار خاکے قلم بند کیے ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ادبی احباب جیسا کہ میرزا ادیب ،فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، اکبر حمیدی اور خانپور کے قریشی دوستوں کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔’’میری محبتیں‘‘ کے تقریباً تمام خاکے ماضی پرستی کی کیفیت میں ڈوب کر لکھے گئے ہیں۔حیدرقریشی جرمنی جانے کے بعد اپنے قریبی رشتہ داروں کی شدید کمی محسوس کررہے تھے اور اِن خاکوں کے ذریعے یادِ ماضی کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی کاوش نظر آتی ہے۔خاکہ نگار کو انسانی نفسیات سے گہری دلچسپی ہے اسی لیے جگہ جگہ گہرے شخصی تجزیات نظر آتے ہیں۔خاکہ چاہے گھر کے کسی قریبی فرد کا ہو یا دوست کا اِن دونوں میں شخصیت کی باطنی اور فطری خوبیوں اور خامیوں کا بھرپور جائزہ ملتا ہے۔ہر شخصیت کے حوالے سے ایسے ایسے نفسیاتی نکتے بیان کردیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اُس شخصیت کے قریب محسوس کرتا ہے۔

ان خاکوں میں کئی مقامات پر مافوق الفطرت عناصر چھائے نظر آتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ قاری اُن کو شک کی نگاہ سے دیکھے اور یقین نہ کرے لیکن حیدرقریشی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔وہ دل کی بات پر عمل کرتے ہوئے ہر بات بے تکلف لکھ دیتے ہیں۔طنز ومزاح کا برمحل استعمال ان خاکوں کی دل چسپی بڑھاتا ہے۔وہ طنز مزاح کے تمام حربے اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے برتنے کے قائل ہیں ان کے مزاج میں شائستگی اور جمالیاتی اُسلوب کے گہرے رنگ موجود ہیں۔حیدرقریشی نے جس طرح افسانوں میں شاعرانہ اُسلوب کو برتا ہے بالکل وہی طریقہ خاکوں میں آزماتے نظر آتے ہیں۔خاکوں میں یہ شعری وسائل لطف پیدا کرتے ہیں اور زیرِ مطالعہ شخصیت کی تفہیم میں اضافہ کرتے ہیں۔یہ شعری زبان وبیان ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنے ہر خاکے کا آغاز شعر سے کرتے ہیں۔یہ شعر بظاہر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن خاکے میں پیش کی جانے والی شخصیت کے کئی پوشیدہ پرتیں کھول دیتا ہے۔یہ تمام اشعار حیدرقریشی کے طبع زاد ہیں اور شخصیت کے ظاہر وباطن کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔شعر کی زبان سے کچھ ایسی اَن کہی باتیں کہہ دی گئی ہیں جن کا نثری اظہار شاید ممکن نہ تھا۔یہ شعر ایک ایسا ذریعہ ہے جسے سہارا بنا کر خاکے میں موجود شخصیت کے باطن میں جھانکا جاسکتا ہے۔

حیدرقریشی نے سوانحی ادب کی طرف توجہ دی اور اس ضمن میں یادنگاری کے توسط سے اپنی زندگی کی تلخ وشیریں یادیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔یادنگاری کا تمام ذخیرہ **’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘** کے زیرِ عنوان طبع ہوا اور جلد ہی ادبی حلقوں میں مقبول ہوگیا۔یادنگاری کی صنف اُردو ادب میں نئی ہے تاہم انگریزی اور دیگر زبانوں میں اس کا چلن عام ہے۔یہ صنف سوانح عمری، خودنوشت ، خاکہ نگاری ، رپورتاژ اور سوانحی مضمون سے یکسر جداگانہ مزاج رکھتی

ہے۔ یہ خالصتاً شخصی اور نجی واقعات پر مشتمل بیانیہ ہوتا ہے جو زمانی ترتیب یا شعور کی رو کے زیرِ اثر لکھا جا سکتا ہے۔ اس کا بڑا مقصد اُن یادوں کو سمیٹنا ہے جو بالعموم فراموش کر دی جاتی ہیں۔ انگریزی میں یادنگاری کے لیے "Reminiscence" کی اصطلاح برتی جاتی ہے۔

اُردو ادب میں حیدر قریشی نے اس صنف کو اپنی تمام تر تکنیکی خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے۔ اُن کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' اُن دوستوں، عزیزوں، شناساؤں اور تعلق داروں کے واقعات پر مبنی ہے جن کا ذکر خاکوں میں نہیں آ سکا تھا یا اگر ذکر آیا بھی تو اُن کے حوالے سے کئی باتیں ہونے سے رہ گئی تھیں۔ اِس کمی کو پورا کرنے کی خاطر یادنگاری کا قرینہ برتا گیا ہے۔ یہ کتاب بظاہر قلم برداشتہ لکھی گئی ہے لیکن واقعات کا چناؤ اور اُن کی تفہیم و ترسیل کو ہر ممکن طریقے سے پُرکشش بنایا گیا ہے۔ کرداروں کی تحلیلِ نفسی کے ساتھ اپنی زندگی کے اہم اور غیر اہم واقعات کو خاص معنویت اور مقصدیت کے تحت ابھارا گیا ہے۔ اس کتاب میں افسانوی رنگ نمایاں ہے اور انشائی اُسلوب میں خاکہ نگاری کے نقوش بھی جلوہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ حیدر قریشی کو روحانیت سے جو خاص لگاؤ ہے اُسے افسانوں میں بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اس روحانیت کے مزید واقعات یادنگاری کے پیرائے میں بیان کر کے قاری کے شوق کو مہمیز لگائی گئی ہے۔

حیدر قریشی کی ادبی زندگی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے اس پہلو کو اگر قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے تو وہ ''کھٹی میٹھی یادیں'' ہی ہے۔ یہاں اُن کی ادبی کائنات چمکتی دمکتی نظر آتی ہے۔ پاک و ہند کے علاوہ وہ ادیب جو دیگر مغربی ممالک میں آباد ہیں اور حیدر قریشی اُن سے مل چکے ہیں۔ ان کا حال جاننے کے لیے اس کتاب سے رجوع ضروری ہے۔ قریبی احباب کا ذکر باندازِ دگر آیا ہے جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ حیدر قریشی نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ یادنگاری کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا اُس کا تعلق سچ کے ساتھ ہے۔ یہ وہ سچ ہے جو اُن پر بیتا ہے، دیکھا ہے یا سنا ہے۔ وہ اپنے اس انکشافی سچ کو تخلیق کار کی سوغات قرار دیتے ہیں۔

اُردو ادب میں یادنگاری کی یہ کتاب انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ حیدر قریشی نے اس صنف کے حوالے سے بانی یا موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن اُن کا شمار ایسے اولین بنیاد گذاروں میں لازماً ہوگا جنھوں نے شعوری سطح پر اس صنف کو برتا ہے۔ اُن سے قبل کسی اور کتاب کا حوالہ نظر نہیں آتا جس میں یادنگاری کی ہیئت میں کاروبارِ زیست محفوظ کرنے کی کاوش کی گئی ہو۔ یہ کتاب مستقبل میں کئی نئے مباحث پیدا کرے گی۔

حیدر قریشی نے انشائیہ نگاری میں بھی اپنی قابلیت اور تخلیقی جوہر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے کم انشائیے لکھے لیکن اس کے باوجود اُن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دس انشائیوں پر مشتمل مجموعہ **''فاصلے قربتیں''** الگ کتابی صورت میں شائع تو نہیں ہوا تاہم اُن کے کلیات **''عمرِ لاحاصل کا حاصل''** میں شامل ہے۔ مستقبل قریب میں یہ مجموعہ الگ کتاب کے طور پر دستیاب ہوگا، ابھی طباعت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ہر انشائیے کا آغاز ہر ایک شعر سے کرتے ہیں۔ یہ شعر انشائیے کے مرکزی دھارے سے کچھ اس طرح جڑا ہوتا ہے کہ جیسے اُسی شعر کو پھیلا کر انشائیہ بنا دیا گیا ہے یا اپنے خیالات کو سمیٹ کر شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ بہرحال انشائیے کی قرأت مکمل کر لینے کے بعد قاری جب دوبارہ اُس شعر کو پڑھتا ہے تو ایک نیا جہانِ معنی نئے نئے حقائق منکشف کرتا دکھاتی دیتا ہے۔

انشائیے کا فن اُسلوبیاتی سطح پر بڑے وسیع امکانات کا حامل ہے اور ہر تخلیق کار اپنی اپنی اُفتادِ طبع کے مطابق انشائیے کو مختلف سانچوں میں ڈھال سکتا ہے۔ حیدر قریشی کے ہاں اشیاء اور رویوں کو فلسفیانے کا عام رجحان ملتا ہے۔ یہی وصف اُن کے انشائیوں میں موجزن ہے۔ انشائیے کے تکنیکی امور کو ذہن میں تازہ رکھتے ہوئے فکریاتی مسائل سے تعرض کیا ہے اور جہاں کہیں اُنھیں محسوس ہوا کہ تفکر کا آہنگ ذرا بلند ہو گیا ہے تو وہ فوراً اُسے دھیما کر لیتے ہیں تا کہ انشائی لطافتیں اپنی جگہ برقرار رہیں۔

فکری موضوعات پر بات کرتے ہوئے وہ ہر قسم کے ابہام اور پیچیدگی سے دامن بچاتے ہیں۔ گہری سنجیدگی اور تلخی کو امکان بھر کم رکھتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کی پرچھائیاں نظر آ جاتی ہیں۔ حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکریات کا ایک پورا نظام فعال صورت میں موجود ہے۔ ان فکری منطقوں کی جڑیں سماجیات میں پیوست ہیں۔ جن کا کام سماجی اقدار کے کھوکھلے پن کو منکشف کرنا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کذب و افترا اور منافقت کے رویے عام ہے۔ ایک سچا تخلیق کار بسا اوقات اِن مسائل کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا لیتا ہے۔ تا کہ اجتماعی شعور کی تربیت کی جائے، حیدر قریشی نے انشائیوں کے ذریعے یہ فریضہ انجام دینے کی سعی کی ہے۔ اگرچہ انشائیہ نگاری کا یہ منصب نہیں ہوتا تاہم حیدر قریشی نے کمال احتیاط سے اپنے دل کی بات انشائی اُسلوب میں کہہ ڈالی ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ زیرِ بحث مسئلہ کے ممکنہ پہلوؤں پر بات کرنے کے دوران فکری اور منطقی اصول بھی اخذ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اخذ کردہ اُصول نہ صرف سیاق و سباق کے حوالے سے دل چسپی بڑھاتے ہیں بلکہ اِن سے ہٹ کر بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرتے تھے یہ اُصول بڑی حد تک خود مکتفی ہیں اور اِن کی حیثیت اقوالِ زریں جیسی بن جاتی ہے۔

حیدر قریشی کی تخلیقات پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ سائنسی علوم خصوصاً حیاتیات، نفسیات اور طبیعیات میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ یہ اُن کے نظامِ فکر کی خاصیت ہے کہ شعری اور نثری تخلیقات میں یہی سائنسی علوم کسی نہ کسی حوالے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ''قربتیں اور فاصلے'' میں موجود کچھ انشائیے طبیعیات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ خالص تخلیقی اصناف میں سائنسی علوم کا داخلہ ممنوع تو نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تخلیقی لوازم اُس کی وجہ سے متاثر نہ ہوں۔ حیدر قریشی نے اگرچہ اپنی جانب سے پوری پوری احتیاط برتی ہے، پھر بھی بعض مقامات پر انشائیہ غیر ضروری سائنسی بوجھ تلے دبتا جا رہا ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں روزمرہ زندگی کے واقعات کے بکھرے نظر آتے ہیں بلکہ اُن کی ادبی زندگی کے تلخ وشیریں واقعات کا عکس بھی ملتا ہے۔ اُن کی انشائیوں میں ادبی گروہ بندی اور خود ساختہ ادیبوں پر گہرے طنز ملتے ہیں۔ یہ تلخی اور طنز یہ اُسلوب اتنا واضح اور براہِ راست ہے کہ انشائیہ اِس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ طنز، مزاح اور تلخی کی لہریں انشائی اُسلوب میں اُس وقت قابل قبول ہوں گی جب اِن کی مقدار اور شدت کو ہزار پردوں میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہو۔ انشائیے کا فن بہت نازک ہے اگر ذرا سی آنچ تیز ہوجائے تو اچھا بھلا انشائیہ مضمون بن کر رہ جاتا ہے۔ انشائی حدود سے تجاوز کرنا اس صنف کے ساتھ زیادتی ہے۔ حیدر قریشی نے محض چند ایک انشائیوں میں اپنے قلم کو زیادہ آزادی دی ہے وگرنہ زیادہ تر اُن کے ہاں توازن کی کیفیت ملتی ہے۔

انشائیہ کی صنف میں شخصی زاویہء نظر اور داخلیت کے جوہر دکھانے کی خاصی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ حیدر قریشی نے اس صنف سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور اپنے انشائیوں میں مشاہدۂ باطن کے جوہر دکھائے ہیں اُن کے ہاں فرد کی داخلی اور نفسی زندگی کی خاص اہمیت ہے جسے وہ اپنے تخلیقی وجدان کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باطن میں چھپے راز اور رویے انشائی اُسلوب میں منکشف کرنا اُن کا خاص کمال ہے۔ حیدر قریشی کے انشائیے نفسیاتی اور روحانی حوالوں سے اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔

حیدر قریشی کی تخلیقی جہت کا اظہار سفرنامہ نگاری کے ذریعے بھی ہوا ہے۔ اُنھوں نے ۱۹۹۶ء میں عمرے اور ۲۰۰۳ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ یہ دونوں اسفار کتابی صورت میں بعنوان **''سوئے حجاز''** شائع ہوئے تھے۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس مذہبی سفر کے دوران فکری اور روحانی سطح پر مزید کئی سفر مکمل کیے ہیں۔ قاری کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حیدر قریشی نے اس سفرنامے میں نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی باطنی تبدیلیوں ک کا اظہار کیا ہے۔ ''سوئے حجاز'' میں ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے غیر شعوری طور پر کہانی پن کا عنصر اس میں شامل کر دیا ہے۔ جس کے باعث کتاب کی دل چسپی بڑھ گئی ہے۔

حیدر قریشی نے جس طرح اپنی تخلیقی نثر کے دیگر مظاہر میں طبع زاد اشعار درج کیے ہیں بالکل اُسی انداز کو ''سوئے حجاز'' میں بھی قائم رکھا ہے، البتہ کچھ جگہوں پر دوسرے شاعروں کا کلام بھی نظر آ جاتا ہے۔ اِن تمام اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر قریشی بہت سی ایسی باتیں جو نثر میں لکھنے کے خواہش مند تھے اُنھیں بوجوہ شعری پیرائے میں لکھ دیا ہے۔ خوفِ فسادِ خلق کے باعث شعری اظہاریے کو ترجیح دی ہے۔

''سوئے حجاز'' میں فکری عناصر کی شمولیت متاثر کن ہے۔ مناسکِ عمرہ یا حج کے دوران وہ اردگرد کی تمام اشیا پر گہری نظر رکھتے ہیں اور روزمرہ کی عام اشیا کو تاریخی، سماجی اور ثقافتی حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ احرام کا تجزیہ کرتے ہیں تو اُنھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سفید کپڑے کا یہ اَن سلا پارچہ مکمل برہنگی اور مکمل لباس کے درمیان کڑی ہے، ساتھ ہی وہ یہ اُصول بھی اخذ کر لیتے ہیں کہ جہاں دینِ اسلام نے برہنگی کی ممانعت کی وہاں

مکمل لباس پہننے سے بھی روک دیا ہے اور انسانوں کے لیے لباس کے درمیانی صورت پیدا کر کے دکھا دی ہے۔ یہ سوچنے کا ایک منفرد انداز ہے۔

حیدر قریشی نے ''سوئے حجاز'' میں تصورِ توحید پر عالمانہ اور فاضلانہ مباحث اٹھائے ہیں اور شرک کی حدود واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ الٰہیاتی مسائل سے اُن کی گہری دل چسپی کا اظہار سفرنامے میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ معروف انشائیہ نگار اور نقاد اکبر حمیدی نے ''سوئے حجاز'' کو روحانی سفرنامہ قرار دیا ہے۔ یہ سفرنامہ تاریخی اور مذہبی حوالوں سے بھی ہماری معلومات میں خاصا اضافہ کرتا ہے۔

مکہ اور مدینہ منورہ کے تاریخی اور مقدس مقامات پر تفصیلاً بات کی ہے۔ وہ اس بات کا افسوس بھی کرتے ہیں کہ سعودی حکومت نے اتنی اہم جگہوں کو ضائع کر کے اُن پر نئی تعمیرات کرالی ہیں۔ ''سوئے حجاز'' کا پورا ایک باب '' مکہ کے تاریخی اور مقدس مقامات''عہدِ رسالتؐ کی یادگاروں پر لکھا گیا ہے۔

اس سفرنامے میں تصوف کے حوالے سے بھی گراں قدر نکات پیش کئے گئے ہیں۔ سوئے حجاز میں یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ تصوف میں گہری دل چسپی رکھتے ہیں اور صوفیائے کرام اور مقبروں سے بھی اُن کو خاص قلبی لگاؤ ہے۔ یہ تصوف برائے شعر گفتن یا خانقاہیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا بلکہ اس میں اجتماعیت کا گہرا شعور نظر آتا ہے جس میں ایک ایسی حرکی قوت پائی جاتی ہے جو انسان کو بلند مقام پر فائز دیکھنے کی خواہش مند ہے۔

یہ سفرنامہ اسی موضوع کے دوسروں سفرناموں سے اس طرح منفرد ہو جاتا ہے کہ عموماً اس موضوع پر لکھے گئے سفرناموں میں یکسانیت بھرمار ہوتی ہے اور قاری محض چند صفحے پڑھ کر اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''سوئے حجاز'' میں موضوع اور اُسلوب کی رنگارنگی نے محفل آرائی کا سماں پیدا کر دیا ہے۔ ہر قسم کا قاری حسب ضرورت اس محفل سے مستفید ہوسکتا ہے۔ اس سفرنامے میں مذہب بیزار لوگوں پر خصوصاً توجہ صرف کی گئی ہے۔ اُن کی ذہنی حالت اور تشکیک پسندی کو نئے زاویے سے سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ ایسے ملحد اور بے دین لوگوں کے نظریات کی نفی عقلیت ہی کی سطح پر کر دی گئی ہے۔ حیدر قریشی کے نزدیک لادینیت محض فیشن کے طور پر اُبھری تھی اور لوگوں نے خود کو دانشور کہلانے کے شوق میں بے دینی کو خود پر طاری کر لیا تھا۔ اس نوع کی موضوعاتی وسعت اور فلسفیانہ تفکر نے ''سوئے حجاز'' کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

''سوئے حجاز'' کا موضوعاتی کینوس خاصا وسیع ہے اس میں ایک عہد کی تاریخ بند ہے اور جن مسائل پر بات کی گئی ہے اُن کا براہِ راست تعلق تاریخ، ثقافت، عمرانیات، نفسیات، الٰہیات، سیاسیات اور اقتصادیات کے ساتھ ہے۔ وہ جس حوالے سے بات کرتے ہیں اُس میں سنجیدگی اور گہرائی پائی جاتی ہے جذباتیت کا اُن کے ہاں گذر نہیں ہے۔ اپنی بات کو نرم آہنگ اُسلوب میں کہنے کا فن جانتے ہیں اور اُسلوب نگارش بھی ایسا اپناتے ہیں کہ دل کی بات دل پر اثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دین سے سچی نسبت اور حضور اکرمؐ سے گہرا قلبی لگاؤ اُن کے ایمان کا لازمی

حصہ ہے۔ یہی عقیدت اور محبت ''سوئے حجاز'' میں رنگ بدل بدل کر ظاہر ہوتی ہے۔ حیدر قریشی نے عمرے کا سفر جتنی سہولت اور خوشی کی حالت میں طے کیا تھا اور اپنے قیام کے دوران جن لطافتوں سے فیض یاب ہوئے تھے اُس کا ذکر کھل کر کیا ہے اور پڑھنے والا بھی اُس خوش گوار تجربے کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس حج کا سفرنامہ ذرا بدلا ہوا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اب ہجوم بڑا ہے، ہر جگہ رش کا عالم، ایسی حالت میں جب ارد گرد کا ماحول دیکھا تو اُس میں انتشار اور بدنظمی کے گہرے بادل منڈلاتے نظر آئے۔ بدنظمی کا بڑا واقعہ اُس وقت پیش جب وہ جدہ ایئر پورٹ پر اُترے اور اُن کا بیش تر سامان افراتفری کے عالم میں گُم ہو گیا، صرف کندھے کا وہ بیگ سلامت رہا جس میں نقدی اور سفری کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ یہ سامان اُن کو نہ مل سکا بہر حال سفر کے دیگر مراحل طے کیے اور ہوٹل پہنچ گئے۔

حیدر قریشی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے ہجوم کو حکومت نے کتنے بہترین طریقوں سے منظّم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے مقامات پر ہنگامے کا سامان پیدا ہو گیا تھا۔ حج کے مقدس موقع پر جہاں اور مسائل تشویش ناک تھے وہاں گداگری کے باعث بھی خاصی پریشانی تھی۔ یہ گداگر حرم شریف کے اندر بھی موجود تھے اور جدید طرز اپنا کر پیسے بٹورنے میں لگے ہوئے تھے۔ موبائل فون کی وجہ سے تمام فقیروں کا مضبوط نیٹ ورک بنا ہوا تھا اور جہاں کہیں لوگ زیادہ پیسے تقسیم کرتے موبائل کے ذریعے دوسروں دوستوں کو اُس جگہ بلوا لیتے تاکہ اُن کی بھی چاندی ہو جائے۔

یہ بظاہر وہ واقعات ہیں جو روزمرہ کے معمول کا حصہ بن چکے ہیں اور عموماً سفرنامہ نگار انھیں نظر انداز بھی کر جاتا ہے، لیکن حیدر قریشی نے یہ سب کچھ ایک بچے کی نظر سے دیکھا ہے جس کے لیے ہر منظر، ہر واقعہ، ہر ہنگامہ، ہر حرکت اور ہر رویہ نیا ہے۔ ''سوئے حجاز'' کی مطالعہ پذیری کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ یہاں پڑھنے والوں کو اپنی پسند کے مطابق ہر شے مل جاتی ہے۔

حیدر قریشی نے ''سوئے حجاز'' کے آخری باب میں کچھ تجاویز پیش کی ہیں جن کو اگر سنجیدگی سے سمجھا جائے تو اُن تمام بدانتظامیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے جو آئے دن لوگوں کو پیش آتی ہیں۔ اِن تجاویز کا تعلق عملی مسائل کے ساتھ ہے۔ یہ سفرنامہ اپنے موضوع، فکر، اُسلوب، وژن اور افادیت کے اعتبار سے دل چسپی سے پڑھا جاتا رہے گا۔

حیدر قریشی کا شعری سرمایہ لایق توجہ ہے۔ اُنھوں نے غزل، ماہیا اور آزاد نظم کے حوالے سے پانچ شعری مجموعے تخلیق کیے ہیں جو خانپور، لاہور اور اسلام آباد سے شائع ہوئے، انھی کتابوں پر مشتمل کلیات ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' سرور اکادمی، جرمنی نے ۱۹۹۸ء میں شائع کر دی تھی یہ کلیات آنے کے بعد بھی شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا رہا لہٰذا اس سرمائے کو ایک اور نئے کلیات **''قفس کے اندر''** شامل کر دیا گیا ہے، یہ کلیات عکاس انٹرنیشنل اور نایاب پبلی کیشنز خانپور کے مشترکہ تعاون سے ۲۰۱۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ حیدر قریشی کا کلیاتِ نظم و نثر ''عمر لا حاصل کا

حاصل'' میں بھی پانچ شعری مجموعے شامل ہیں۔

حیدر قریشی نے جدید غزل کہی ہے جو عصریت کے اہم تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی غزل میں تخیل کی پھلجھڑی نہیں چھوڑتے بلکہ حیات و کائنات کے جیتے جاگتے مسائل کو شعری زبان اور شعری اُسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ غزلیں سماجیات سے خاصا مواد حاصل کرتی ہیں اور ارد گرد موجود قدروں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا شعور عطا کرتی ہیں۔

حقائق کی تصویر کشی کرنا اور داخلی و خارجی دنیاؤں کی سیر کرانا اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اُن کی کوشش یہی رہی ہے کہ وہ سماجی پہلوؤں کے ممکنہ گوشوں کو اپنے شعروں میں محفوظ کر دیں۔ شعور کی پختگی نے اُن کے قلم کا رُخ ادب برائے زندگی کی طرف موڑ دیا ہے، اس عملی کے دوران جہاں زندگی کے صحت مند رجحانات شاعری میں اپنی جگہ بناتے نظر آتے ہیں وہاں تلخ مسائل کی جھلکیاں بھی تخلیقی سفر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ زندگی کا حقیقت پسندانہ طرز عمل اُن کی شعری فضا کا ناگزیر جز ہے۔ سماجی اقدار کی شکست و ریخت اور بے اطمینانی جس طرح ہر حسّاس شخص کو پریشان کرتی ہے اس طرح حیدر قریشی جیسا زود رنج شاعر اِن مسائل پر زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ سماجیات کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ اُن کا محبوب مشغلہ ہے اور پھر اِن تمام ثمرات کو شاعری کا حصہ بنا لینا اُن کا کمالِ فن بھی ہے۔ اُن کی باریک بین نظر قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے پر قادر ہے۔

حیدر قریشی نے جذبۂ محبت اور اس کے متعلقات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اِن موضوعات پر ہونے والی شاعری اثر آفرینی اور دل نشینی کی خصوصیات سے مزین ہے۔ اُن کی غزل میں غم جہاں اور غم دوراں کے ذائقے منفرد انداز میں قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ رومانوی عناصر، رجائیت، تصوف، ذاتی تجربات و مشاہدات، دنیا کی بے ثباتی، جمالیاتی رنگ و آہنگ اور فنی لوازم کا سلجھا ہوا استعمال متاثر کن ہے۔ لفظی تکلفات اور فارسیت کا چلن اُن کی غزل میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کا طریق یہی رہا ہے کہ احساس کی ترجمانی کا حق سیدھے سبھاؤ ادا ہو جائے، یہی سادہ اُسلوب روح کی ترجمانی کا فریضہ پورا کر دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنی غزل کو حسین و لطیف جذبات کی ترسیل کا مضبوط زینہ بنایا ہے۔ اُن کا رنگِ سخن معاصر غزل گو شعرا میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو مقدور بھر آرائشی خود فریبی سے پاک رکھا ہے۔ غزل کی ایمائیت، اشاریت اور رمزیت کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ اُن کی غزل کا ہر شعر جذبات کی صداقت، سوز گداز اور جذب و سرور کا دل کش بیانیہ ہے۔

حیدر قریشی کی غزل میں کسی خیالی یا تخیلی محبوب کی تلاش بیکار ہے۔ اُن کا محبوب اس مادی دنیا کا باسی ہے۔ جو گوشت پوست کا بنا ہوا ہے اور بشر ہے۔ وہ اپنی غزل میں محبوب سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ شکوہ شکایت کرتے ہیں اور کہیں کہیں قدرے ناراضی اور برہمی کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔

اُن کی غزل میں کچھ مقامات پر بے نیازی اور استغنا کا عنصر بھی ملتا ہے یہ اصل میں اُن کی بے ریا زندگی کا حقیقی عکس ہے۔اُن کی شخصیت ہر قسم کے تصنع سے دور ہے اور یہی وصف اُن کی شاعری کا حوالہ بھی بن جاتا ہے، اگر وہ کسی جگہ اظہارِ شکست بھی کریں تو اپنی شخصیت کا توازن ضرور برقرار رکھتے ہیں۔حیدر قریشی کی شخصیت اور اُسلوب میں گہرا ربط ہے، اگرچہ اُن کے شعروں کی مثال فارسی ضرب المثل ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' جیسی ہے تاہم ہر شعر کے باطن میں شخصیت کا اصلی آہنگ موجود ہے اور قاری کو اپنے وجود کا بار بار احساس دلاتا رہتا ہے۔ یہ اُن کی ریاضت کا کمال ہے کہ اُن کی شخصیت کا نکھار اور اُسلوب کا وقار ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔

حیدر قریشی کا مخصوص فکری نظام اُن کی تمام اصناف میں محسوس کیا جا سکتا ہے، اس نظام کا کلیدی نقطہ تصورِ خدا کے گرد گھومتا ہے۔غزل میں تصورِ خدا اور فلسفۂ توحید کے مضامین سمونا آسان بات نہیں، اس کے باوجود حیدر قریشی نے اس موہنی صنف میں اپنے دل کی باتیں بیان کر دی ہیں۔

دورِ جدید میں جہاں ہمارے دانشور ادیب اپنی روشن خیالی کا ثبوت فراہم کرنے کیلئے لادینی کی طرف مائل ہوتے ہیں اس کے برعکس حیدر قریشی خدا پرستی پر قائم رہ کر فعال ادبی سرگرمیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔وہ اپنی روزمرہ گفت گو اور انٹرویوز میں بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ خدا کی ذات پر کامل یقین رکھتے ہیں بلکہ اس یقین کے کئی ذاتی تجربات سے بھی گزر چکے ہیں۔یقین کی اس قوت نے اُن کے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی ہے۔

حیدر قریشی کی غزل میں فنی محاسن کا خاص التزام ملتا ہے، جس میں تلمیحات، تشبیہات، استعارات کے عمدہ قرینوں کے ساتھ تغزل، صنعتِ تضاد، تکرارِ لفظی، مجاز مرسل، سہل ممتنع، دو لفظی، سہ لفظی اور چہار لفظی تراکیب کا استعمال اور ہندی الفاظ اور ہندی روایت کا اتباع بھی نظر آتا ہے۔ یہ غزلیں ایک بڑے ادیب کے قلم سے نکلی ہیں اور اِن کا مطالعہ ادبی دنیا میں کئی نئے سوال اٹھائے گا۔حیدر قریشی کی غزل فکر و نظر اور اپنے برتاؤ کے باعث جدید حسّیت کی نمائندگی کرتی ہے۔

حیدر قریشی نے صنفِ ماہیا پر خاصا کام کیا ہے۔اس صنف کے ساتھ اُن کی دل چسپی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی تینوں سطح پر نظر آتی ہے۔اُن کے تمام ماہیے مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ان کی دستیابی کتابوں کے ذریعے بھی ممکن ہے اور انٹرنیٹ پر بھی اِن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ماہیا ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا اظہار و بیان کے حوالے سے کینوس بہت وسیع ہے۔حیدر قریشی نے اس صنف کی وسعت سے ممکنہ حد تک فائدہ اٹھایا ہے، اگر اُن کے پیش کردہ ماہیوں پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حیات و کائنات کے اہم موضوعات پر معیاری ماہیے موزوں کیے گئے ہیں۔حیدر قریشی کو حضور اکرمؐ کے ساتھ جو گہری عقیدت اور والہانہ محبت ہے اُس کا اظہار اُن کی تقریباً ہر صنف میں

دیکھا جا سکتا ہے۔عشق و محبت کا یہی رویہ ماہیے کے توسط سے بھی اظہار پاتا ہے۔نعتیہ موضوع کے ماہیے یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ حیدر قریشی نے اپنے فکر و فن کے چراغ روشن کرنے کے خاطر حبِ رسولؐ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا ہے۔نعتیہ ماہیوں کے علاوہ حمدیہ ماہیے بھی اپنا جادو جگاتے نظر آتے ہیں۔حیدر قریشی نے ۱۹۹۶ء میں روضۂ رسول اور ۲۰۰۳ء میں خانۂ خدا میں حاضری کا شرف حاصل کیا تھا۔ یہ اسفار بالآخر روحانی کیفیات کا موجب بھی ثابت ہوئے۔حیدر قریشی نے اپنی اُن نادر کیفیات کو ماہیے کے ذریعے ہی محفوظ کیا ہے۔

شاعرانہ کیفیت چاہے کسی بھی قسم کی ہو اُس کا دورانیہ کم ہوتا ہے اور یہ بات تو طے ہے کہ ایسی کیفیات کا اظہار نثری بیانات میں اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے تاہم شعری اسالیب میں ان نادر الوقوع جذبات و احساسات کو کسی حد تک ضرور محفوظ کیا جا سکتا ہے اور خصوصاً ماہیا جیسی مختصر سہ مصرعی صنف تو شاعر کے لئے کئی طرح کی آسانیاں بھی پیدا کر دیتی ہے۔حیدر قریشی نے اس حوالے سے جو ماہیے تخلیق کیے وہ اُن کے سفرنامے ''سوئے حجاز'' میں شامل ہونے کے علاوہ کلیات میں بھی موجود ہیں۔

آپ نے حمدیہ اور نعتیہ ماہیے تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت علیؓ کے فرمودات سے اکتساب کرتے ہوئے کئی ماہیے لکھے ہیں اور پھر صوفیائے کرام سے نیازمندی کی وجہ سے بھی ایسے خوبصورت اور دل پذیر ماہیے موزوں کیے جو توجہ کے مستحق ہیں۔حیدر قریشی کا قاری اپنی پسند اور ذوق کے مطابق اس شعری منظر ناموں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ان ماہیوں میں تہذیبی اور ثقافتی موضوعات پر بھی کافی کچھ ملتا ہے۔

حیدر قریشی نے شاعری میں آزاد نظم کے کئی تجربے کیے ہیں، ان تجربات کا زیادہ تر تعلق موضوعاتی حوالے سے بنتا ہے۔اُن کے ہاں فطرت پسندی کے نقوش خاصے گہرے ہیں بیش تر نظموں میں یہی مظاہر فطرت قاری کی توجہ اپنی جانب جذب کرتے نظر آتے ہیں۔

فطرت پسندی کے باعث وہ کئی سائنسی تصورات کو اپنی نظموں میں سہولت سے استعمال کر جاتے ہیں مثلاً اُن کی نظم ''خلا'' کا موضوع بگ بینگ (Big Bang) ہے جسے پڑھ کر آزاد نظم کی وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔اگر دیگر بڑے بڑے موضوعات کو دیکھا جائے تو حیدر قریشی کی نظموں میں ثقافتی تصورات فلسفیانہ جہات، دین اسلام سے لگاؤ، رومانیت اور عشق و سرمستی کے عناصر سے واسطہ پڑتا ہے۔اگر فنی اور اُسلوبیاتی سطح پر ان کی نظموں پر توجہ کی جائے تو وہاں خود کلامی، تجرید و تجسیم، علامت، تلمیحات، سوز و گداز، محاکات، منظر کشی، ایمائیت، امیجری جیسے اعلیٰ عناصر ان نظموں کے معنوی حسن کو نکھارتے دکھائی دیتے ہیں۔

حیدر قریشی نے اپنے ادبی سفر کے دوران تحقیقی موضوعات کی طرف بھی توجہ دی ہے۔جس عرصے میں ماہیا نگاری کی تحریک عروج پر تھی اُس دوران اس صنف کے کئی مسائل ایسے سامنے آئے جو تحقیق طلب تھے لیکن اُس وقت تک کسی اور ادیب اور محقق نے اُن مسائل پر تحقیق نہیں کی تھی۔حیدر قریشی نے ماہیے کی ابتدا، اوزان اور

تحریری ہیئت کے خدوخال واضح کرنے کے لیے پاک وہند کے معیاری ادبی جرائد میں تحقیقی مضامین کا سلسلہ شروع کردیا جو بعدازاں پانچ کتابوں کی صورت میں جمع کردیا گیا تھا اور اِن کتابوں کا کلیات بعنوان ''اُردو ماہیا: تحقیق وتنقید'' بھی چھپ کر سامنے آ گیا تھا۔

حیدرقریشی یک موضوعی محقق ہیں کیونکہ اُن کی تمام تر تحقیقات کا مرکز ومحور صرف ماہیا ہے۔اس صنف کے بنیادی موضوعات پر دادِ تحقیق دی ہے جس کی وجہ سے اب یہ صنف اردو ادب میں اپنی الگ اور منفرد شناخت کے باعث خاص مقام رکھتی ہے،اگر ماہیے کی صنف پر تحقیقی حوالے سے نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ اپنے ابتدائی سفر میں یہ صنف ہیئت کے اعتبار سے اُلجھاؤ کا شکار رہی ہے۔حیدرقریشی نے جدید تحقیقی اصولوں کو کام میں لاتے ہوئے ماہیے کے آغاز وارتقا،اصل اوزان،تحریری ہیئت،موضوعات،اسالیب،مزاج اور تکنیکی حوالوں کو واضح کردیا ہے۔اس ضمن میں دستاویزی تحقیق کا سہارا لیتے ہوئے ہمت رائے شرما کو اُردو ادب کا پہلا ماہیا نگار قرار دیا، لیکن اُن کی تحقیقات مزید آگے چلتی ہیں اور ماہیے کے فروغ میں خواتین کا حصہ اور ادبی رسائل وجرائد میں ماہیے کی اشاعت اور مقبولیت پر بھی نئے تحقیقی زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔

حیدرقریشی نے اگرچہ اپنی تحقیقات میں کافی لوگوں سے اختلاف کیا لیکن یہ علمی اختلاف ذاتی اختلاف کا رنگ اختیار نہیں کرتا۔اُن کی تحقیق میں توازن،غیر جانبداری،معتدل تحقیقی روش،مستقل مزاجی،وضاحتی اُسلوب اور بے لاگ تجزیات دعوتِ فکر دیتے ہیں۔حوالوں کے اندراج میں خاص احتیاط کا مظاہرہ اُن کا نمایاں تحقیقی وصف ہے۔اپنی تحقیقی غلطی کو کشادہ دلی سے قبول کرنے کا رجحان بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔عروض سے واقفیت کی وجہ سے اُن کا طرز استدلال محکم اور مدلل ہوجاتا ہے،اپنی تحقیق کے دوران جتنے دعوے کیے اُن کو مضبوط علمی دلائل سے مزین بھی کیا ہے۔

حیدرقریشی بطور فعال ادبی نقاد منفرد شناخت قائم کرچکے ہیں،تنقید کی طرف اُن کا میلان اور رجحان اُن کی ابتدائی ادبی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ان کی تنقیدی سرگرمیوں کا دائرہ ہمہ گیر ہے۔وہ اپنے اولین تنقیدی سفر میں ماہیے کے حوالے سے نئی نئی باتیں متعارف کراتے ہیں اور پھر وقت گذرنے کے ساتھ افسانہ،ناول،شاعری،سفرنامے اور دیگر بڑے بڑے ادبی اور نظری مسائل پر اُن کے تنقیدی مضامین پاک وہند اور یورپی رسائل میں پڑھنے کو ملنا شروع ہوجاتے ہیں۔

اُن کی تنقید اس خصوص میں لائق توجہ ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ امریکہ،کینیڈا اور یورپ میں لکھے جانے والے اردو ادب پر تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔حیدرقریشی کے مطابق مغربی ممالک میں جہاں اچھے ادیب کم تعداد میں اُردو کی خدمت کررہے ہیں وہاں بڑی تعداد اُن جعل ساز ادیبوں (مردوخواتین) کی موجود ہے جو محض روپے پیسے کی فراوانی کے زور پر ادیب بن گئے ہیں اور پاک وہند کے پیشہ ور شاعروں سے

مجموعے لکھوا کر اپنے نام شائع کرارہے ہیں۔اس ادبی کاروبار نے مغرب میں مافیا کی شکل اختیار کرلی ہے اور یہ دھندا کامیابی سے پھلتا پھولتا جارہا ہے۔

یہ درحقیقت بہت جرأت کی بات ہے۔اس جرأت رندانہ کا مرتکب ہونے کی وجہ سے یورپ کے پیش تر لکھاری اُن سے ناراضی کا اظہار کرچکے ہیں۔حیدرقریشی نے کئی کتابوں کے تنقیدی دیباچے تحریر کیے ہیں اور وہ جب کسی کتاب پر لکھتے ہیں تو پھر پوری ایمان داری سے اُس کے محاسن ومعائب بیان کرتے ہیں۔حیدرقریشی نے اپنی تمام تنقیدات میں کفایت لفظی اور سادگی کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے۔بات کھرے اور دوٹوک لہجے میں کرتے ہیں،اگر کسی کی کمزوری کو نمایاں کرنا مقصود ہو تو اخلاقیات کے تمام تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔حقیقت پسندی اور معروضیت اُن کی تنقید کے نمایاں اوصاف ہیں۔اُن کا تنقیدی طریقِ کار تشریحی اور توضیحی ہے۔وہ اپنے تنقیدی عمل میں ایسے فکری عناصر کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والوں کی تربیت ہوتی ہے۔

حیدرقریشی کا تنقیدی اُسلوب تخلیقی عناصر سے مملو ہے وہ بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے مبہم نہیں بناتے بلکہ نہایت سادگی سے جو محسوس کرتے ہیں اُس سادہ علمی انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔تنقید کے جدید اسالیب اُن کے پیش نظر ہیں اور وہ اُن سے حسبِ ضرورت استفادہ کرتے ہیں۔

حیدرقریشی کا تمام ادبی سرمایہ فنی اور فکری حوالے سے نئے مباحث پیدا کرتا ہے۔نئے لکھنے والوں پر اُن کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماہیے کی صنف پر اُنھوں نے جن بنیادی لوازم کو متعارف کرایا تھا اب اُسی کی پیروی کی جارہی ہے۔اُردو ادب میں ماہیے کی ہیئت،وزن اور مزاج پر اُن کی تحقیقات اور تنقیدات کو اہمیت دی جاتی ہے۔

افسانہ نگاری میں اُن کے منفرد تجربات کا دائرہ خاصا وسیع ہے اور آنے والا محقق اِن کے افسانوں پر مزید نئے سوال اٹھائے گا۔حیدرقریشی نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے فکشن کے جدید اسالیب متعارف کرائے جن میں تنوع اور وسعتِ فکر کے کئی امکانات پوشیدہ ہیں۔

حیدرقریشی کی ادبی خدمات پر اُردو ادب کے سنجیدہ قلم کاروں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے وقیع ادبی کام کی بدولت سنجیدہ ادبی حلقوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے۔آپ کثیر الجہات ادیب ہونے کے ناطے اُردو ادب کی صحت مند روایت کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں،اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ جدید عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے فکری اور احساساتی سطحوں پر حسبِ مقدور حصہ ڈالا ہے۔ حیدرقریشی کا مخصوص فکری نظام اُن کی ہر صنف میں انفرادیت کے جوہر رکھتا ہے۔

■■

کتابیات

(بنیادی مآخذ)

(۱) حیدرقریشی،افسانے (''روشنی کی بشارت''اور''قصے کہانیاں''ایک جلد میں) معیار پبلی کیشنز دہلی،۱۹۹۹ء

(۲) حیدرقریشی،روشنی کی بشارت (افسانے) تجدید اشاعت گھر،اسلام آباد،لاہور۔۱۹۹۲ء

(۳) حیدرقریشی،فاصلے،قربتیں (انشائیے) مشمولہ عمرِ لاحاصل کا حاصل (کلیاتِ نظم ونثر) ایجوکیشنل پبلشنگ،ہاؤس،دہلی،۲۰۰۹ء

(۴) حیدرقریشی،سُوئے حجاز (سفرنامہ) معیار پبلی کیشنز،دہلی،۲۰۰۰ء

(۵) حیدرقریشی،سُوئے حجاز (سفرنامہ،سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ) سرور ادبی اکادمی جرمنی،۲۰۰۴ء

(۶) حیدرقریشی،کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری) عکاس انٹرنیشنل،اسلام آباد،۲۰۱۳ء

(۷) حیدرقریشی،میری محبتیں (خاکے)' ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء

(۸) حیدرقریشی،میری محبتیں (خاکے)،ناشر: معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء

(۹) حیدرقریشی،دردسمندر (غزلیں،نظمیں اور ماہیے) مشمولہ عمرِ لاحاصل کا حاصل (کلیاتِ نظم و نثر) ایجوکیشنل پبلشنگ،ہاؤس،دہلی،۲۰۰۹ء

(۱۰) حیدرقریشی،دعائے دل (غزلیں،نظمیں) ناشر: نصرت پبلشرز لاہور،۱۹۹۷ء۔

(۱۱) حیدرقریشی،سلگتے خواب (غزلیں)' ناشر: تجدید اشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد،مطبوعہ۱۹۹۱ء

(۱۲) حیدرقریشی،عمرِ گریزاں (غزلیں،نظمیں اور ماہیے) تجدید اشاعت گھر لاہور،اسلام آباد،۱۹۹۶ء

(۱۳) حیدرقریشی،غزلیں،نظمیں،ماہیے (چار مجموعوں کا مجموعہ) ناشر: سرور ادبی اکادمی،جرمنی،۱۹۹۸ء

(۱۴) حیدرقریشی،محبت کے پھول (ماہیے)' ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور،مطبوعہ۱۹۹۶ء

(۱۵) حیدرقریشی،اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق وتنقید) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز،اسلام آباد،۱۹۹۷ء

(۱۶) حیدرقریشی،اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی،۱۹۹۹ء

(۱۷) حیدرقریشی،اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (تحقیقی مضامین)
ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔۱۹۹۹ء

(۱۸) حیدرقریشی اردو ماہیا (ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں شامل ہے)

(۱۹) حیدرقریشی،اردو ماہیا تحقیق وتنقید (ماہیے کی تحقیق وتنقید پر پانچ یکجا کتابیں) الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۰ء

(۲۰) حیدرقریشی،تاثرات (تنقیدی مضامین) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۲ء

(۲۱) حیدرقریشی،حاصلِ مطالعہ (تنقیدی مضامین) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۰۸ء

(۲۲) حیدرقریشی،عمرِ لاحاصل کا حاصل،(گیارہ کتابیں یکجا) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۲۰۰۹ء

(۲۳) حیدرقریشی،قفس کے اندر (چھے یکجا شعری مجموعے) نایاب پبلی کیشنز خانپور،۲۰۱۳ء

(ثانوی مآخذ)

(۱) آل احمد سرور''ادب اور نظریہ''ادارہ فروغِ اُردو،لکھنؤ،طبع (دوم)۱۹۵۴ء

(۲) آل احمد سرور''فکرِ روشن''،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،طبع (اول)۱۹۹۵ء

(۳) آل احمد سرور''نظریہ اور نظریے''،اُردو اکیڈمی،سندھ،کراچی،طبع (اول)۱۹۸۷ء

(۴) ابوسلمان شاہ جہان پوری،''خواجہ حسن نظامی خاکے اور خاکہ نگاری''پورب اکادمی،اسلام آباد، طبع (اول)۲۰۰۷ء

(۵) ابوالکلام قاسمی''مشرقی شعریات اور اُردو تنقید کی روایت''،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،طبع (اول) ۱۹۹۲ء

(۶) ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر،غزل اور متغزلین،اردو مرکز،لاہور،طبع (اول)۱۹۵۴ء

(۷) احتشام حسین،سید''ذوق ادب اور شعور''،لکھنؤ،فروغِ اُردو،طبع (اول)۱۹۷۵ء

(۸) احمد ندیم قاسمی،''میرے ہم سفر''،اساطیر،لاہور،طبع (اول)۲۰۰۲ء

(۹) احمد ندیم قاسمی،''میرے ہم قدم''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور (اول) طبع،۲۰۰۷ء

(۱۰) احمد انصاری''غزل اور غزل کی تعلیم''،مکتبہ عالیہ،لاہور،طبع (اول)۱۹۸۷ء

(۱۱) اخلاق احمد دہلوی''اور پھر بیان اپنا''،اردو مرکز،لاہور طبع (اول)۱۹۵۷ء

(۱۲) اعجاز راہی،ڈاکٹر''اردو افسانہ میں علامت نگاری''،ریز پبلی کیشنز،راولپنڈی،طبع (اول)۲۰۰۲ء

(۱۳) اکبر حمیدی''جدید اردو انشائیہ''اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،طبع (اول)۱۹۹۱ء

(۱۴) انوار احمد،ڈاکٹر،''اردو افسانہ تحقیق وتنقید''،بیکن بکس،ملتان،طبع (اول)۱۹۸۸ء

(۱۵) انور سدید، ڈاکٹر ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع (سوم) ۱۹۹۶ء

(۱۶) اے حمید، ''سنگ دوستاں''، جودت پبلی کیشنز، لاہور طبع (اول) ۱۹۸۴ء

(۱۷) بشیر سیفی، ڈاکٹر ''اردو میں انشائیہ نگاری''، نذیر سنز، لاہور طبع (اول) ۱۹۸۹ء

(۱۸) بشیر سیفی، ڈاکٹر ''خاکہ نگاری، فین اور تنقید'' نذیر سنز، لاہور، طبع، ن د

(۱۹) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر ''ادبی تحقیق کے اصول''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع (اول) ۱۹۹۲ء

(۲۰) جمیل جالبی، ڈاکٹر ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، طبع (سوم) ۱۹۸۵ء

(۲۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر ''ادب، کلچر اور مسائل'' ، رائل بک کمپنی، کراچی، طبع (اول) ۱۹۸۶ء

(۲۲) جمیل جالبی، ڈاکٹر ''ادبی تحقیق''، مجلس ترقی ادب، طبع (اول) لاہور ۱۹۹۴ء

(۲۳) جمیل جالبی، ڈاکٹر ''ایلیٹ کے مضامین' سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور طبع (اول) ۱۹۸۹ء

(۲۴) جمیل جالبی، ڈاکٹر ''معاصر ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع (اول) ۱۹۹۱ء

(۲۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر ''نئی تنقید'' رائل بک کمپنی، کراچی، طبع (اول) ۱۹۸۵ء

(۲۶) جیلانی کامران ''تنقید کا نیا پس منظر'' مکتبہ عالیہ، لاہو طبع، ن د

(۲۷) جیلانی کامران ''ہمارا ادبی و فکری سفر'' ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع (اول) ۱۹۸۷،

(۲۸) چراغ حسن حسرت، ''مردم دیدم'' دارالاشاعت، لاہور (طبع اول) ۱۹۳۹ء

(۲۹) حامد اللہ افسر ''تنقیدی اصول اور نظریے''، کوہ نور پبلی کیشنز، لاہور، طبع (اول) ۱۹۶۴ء

(۳۰) حامد بیگ مرزا، ڈاکٹر، ''اردو افسانے کی روایت''، پاکستان اکادی ادبیات پاکستان،
اسلام آباد، طبع (اول) ۱۹۹۱ء

(۳۱) خلیق انجم ''متنی تنقید'' سنگت پبلی کیشنز، لاہور، طبع (دوم) ۲۰۰۴ء

(۳۲) خورشید جہاں، ڈاکٹر ''جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات''، منشا پبلی کیشنز، انڈیا
طبع (اول) ۱۹۸۹ء

(۳۳) رشید احمد صدیقی ''گنج ہائے گراں مایہ''، آئینہ ادب، لاہور طبع (اول) ۱۹۶۴ء

(۳۴) رشید حسن خان ''ادبی تحقیقی، مسائل اور تجزیہ''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ طبع (اول) ۱۹۷۹ء

(۳۵) رفاقت علی شاہد، مرتب ''تحقیقی شناسی''، القمر انٹر پرائز، لاہور، طبع (اول) ۲۰۰۳ء

(۳۶) ریاض احمد ''تنقیدی مسائل''، بک سٹال، لاہور طبع (اول) ۱۹۶۱ء

(۳۷) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ''مغرب کے تنقیدی اصول''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
، طبع (اول) ۲۰۰۵ء

(۳۸) سلطانہ بخش، ڈاکٹر ''اردو میں اصول تحقیق'' (حصہ اول) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
طبع (اول) ۱۹۸۶ء

(۲۹) سلطانہ بخش، ڈاکٹر ''اردو میں اصول تحقیق'' (حصہ دوم) ورڈ ویژن پبلشرز، اسلام آباد
طبع (دوم) ۲۰۰۱ء

(۴۰) سلیم اختر، ڈاکٹر ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع (پچیس) ۲۰۰۴ء

(۴۱) سلیم اختر، ڈاکٹر ''افسانہ حقیقت سے علامت تک''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع (اول) ۱۹۷۱ء

(۴۲) سلیم اختر، ڈاکٹر ''انشائیہ کی بنیاد''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع (اول) ۱۹۸۶ء

(۴۳) سلیم اختر، ڈاکٹر ''پاکستانی ادب'' اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، طبع (اول) ۱۹۹۵ء

(۴۴) سلیم اختر، ڈاکٹر ''تخلیق شخصیات اور تنقید سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور طبع (اول) ۱۹۸۹ء

(۴۵) سلیم اختر، ڈاکٹر ''داستان اور ناول کا تنقیدی مطالعہ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع (اول) ۱۹۹۱ء

(۴۶) سلیم اختر، ڈاکٹر ''نفسیاتی تنقید'' مجلس ترقی اردو، لاہور طبع (اول) ۱۹۸۶ء

(۴۷) سعید شباب ''حیدر قریشی سے لئے گئے انٹرویو' نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ہالینڈ طبع (اول) ۲۰۰۴ء

(۴۸) شاہد احمد دہلوی ''گنجینۂ گوہر''، مکتبہ نیا دور، کراچی طبع (اول) ۱۹۶۲ء

(۴۹) شاہد احمد دہلوی ''بزم خوش نفساں'' ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتبہ) مکتبہ اُسلوب، کراچی
، طبع (اول) ۱۹۸۵ء

(۵۰) شجاع احمد زیبا ''اردو میں قلمی خاکے'' اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی طبع (اول) ۱۹۹۳ء

(۵۱) شمس الرحمٰن فاروقی ''افسانے کی حمایت میں''، مکتبہ جامعہ دہلی، طبع، (دوم) ۱۹۸۱ء

(۵۲) شمس الرحمٰن فاروقی ''تعبیر کی شرح''، اکادمی بازیافت کراچی، طبع (اول) ۲۰۰۴ء

(۵۳) شہزاد منظر، ''ردعمل''، منظر پبلی کیشنز، لاہور طبع (اول) ۱۹۸۵ء

(۵۴) صدیق کلیم ''نئی تنقید''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد طبع (اول) ۲۰۰۷ء

(۵۵) ضمیر علی بدایونی ''جدید اور بعد جدیدیت'' اختر مطبوعات لاہور، طبع (اول) ۱۹۹۹ء

(۵۶) ضمیر علی بدایونی ''مابعد جدیدیت کا دوسرا رخ''، مکتبہ شہزاد، طبع، کراچی (اول) ۲۰۰۶ء

(۵۷) ضیاء الحسن، ڈاکٹر ''اردو'' تنقید کا عمرانی دبستان''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ن د

(۵۸) طارق سعید ''اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
، طبع (اول) ۱۹۹۶ء

(۵۹) طائرہ اقبال ''منٹو کا اسلوب''، فکشن ہاؤس، لاہور طبع (اول) ۲۱۰۲ء

(۶۰) عابدعلی عابد،سید''اُسلوب''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہورطبع (دوم)۲۰۰۱ء

(۶۱) عابدعلی عابد،سید''اُصول انتقادِادبیات''،مجلس ترقیٔ ادب،لاہورطبع،۱۹۶۰ء

(۶۲) عبادت بریلوی''تنقیدی زاویے''،مکتبہ اردو،لاہورطبع (اول)۱۹۵۱ء

(۶۳) عبدالحق مولوی''چندہم عصر''،اردواکیڈمی سندھ،کراچی،طبع (دوم)۱۹۶۱ء

(۶۴) عبدالرحمان،مولانا''مرۃ الشعر،لاہور بک ایمپوریم،طبع،ن د،

(۶۵) عبدالقادر،قاضی،ڈاکٹر''تصنیف وتحقیق کے اصول''،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد طبع (اول)۲۰۰۳ء

(۶۶) عطش درانی،ڈاکٹر''اردوتحقیق،،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آبادطبع (اول)۲۰۰۳ء

(۶۷) فارغ بخاری''البم''فنون پبلشرز،،لاہوطبع (اول)۱۹۷۸،

(۶۸) فرحت اللہ بیگ،مرزا''نذیراحمد کی کہانی،کچھ ان کی میری زبانی''،اردواکیڈمی،کراچی طبع (پنجم)۱۹۷۹ء

(۶۹) فردوس انور،قاضی،ڈاکٹر،''اردوافسانہ نگاری کے رجحانات''،مکتبہ عالیہ،لاہور،طبع (اول)۱۹۹۰ء

(۷۰) فضل الحق،پروفیسر''تنقیدی مضامین''،شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،دہلی طبع (اول)۱۹۹۲ء

(۷۱) فرمان فتح پوری،ڈاکٹر''اردوافسانہ اورافسانہ نگار''،مکتبہ جامعہ،دہلی طبع (اول)۱۹۸۱ء

(۷۲) فرمان فتح پوری،ڈاکٹر''اردوشاعری کا فنی ارتقاء''،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،طبع (اول)۱۹۹۴ء

(۷۳) فرمان فتح پوری،ڈاکٹر''اردوفکشن کی مختصر تاریخ''،بیکن بکس ملتان طبع (اول)،۲۰۰۶ء

(۷۴) فرمان فتح پوری،ڈاکٹر''اردونثر کا فنی ارتقا''،الوقار پبلی کیشنز لاہورطبع (دوم)۱۹۹۷ء

(۷۵) قمررئیس پروفیسر،''نیاافسانہ،مسائل اورمیلانات''،،اردواکادمی،دہلی،طبع (اول)۱۹۹۲ء

(۷۶) کلیم الدین احمد''اردوتنقید پرایک نظر''،اپورب اکادمی سلام آباد،طبع (دوم)۲۱۰۲ء

۷۷ گوپی چند نارنگ،''ادبی تنقیداوراسلوبیات''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہورطبع (دوم)،۲۰۰۸ء

(۷۸) گوپی چند نارنگ''اردوافسانہ،روایت ومسائل''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،طبع (دوم)۱۹۸۶ء

(۷۹) گیان چند،ڈاکٹر''تحقیق کا فن''،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آبادطبع (سوم)۱۹۹۴ء

(۸۰) مبین مرزا،''اردو کے بہترین شخصی خاکے''(جلداول)،الحمراپبلشنگ،طبع (اول)۲۰۰۲ء

(۸۱) محمدافضال،ڈاکٹر،''اردوناول میں سماجی شعور''،اسلام آباد،پورب اکادمی،طبع (اول)۲۰۰۹ء

(۸۲) محمدحسن عسکری،''کلیات''،لاہورسنگ میل پبلی کیشنز،طبع (اول)۱۹۹۴ء

(۸۳) محمدحسین،ڈاکٹر''ادبی تنقید''،لکھنو،فروغ اردو،طبع،(اول)۱۹۷۳ء

(۸۴) محمدطفیل،''آپ''،لاہور،ادارہ فروغِ اردو،طبع (اول)۱۹۶۷ء

(۸۵) محمدطفیل،''صاحب''،لاہور،ادارہ فروغ اردو،طبع (اول)۱۹۵۵ء

(۸۶) محمدطفیل''مجی''،لاہورادارہ فروغ اردوطبع،(اول)۱۹۸۱ء

(۸۷) محمدطفیل''محترم''،لاہور،ادارہ فروغ اردو،طبع (اول)۱۹۶۸ء

(۸۸) محمدطفیل''مکرم''،لاہورادارہ فرغ اردو،طبع،(اول)۱۹۷۰ء

(۸۹) محمدعقیل،سید،''غزل کے نئے جہات'' مکتبہ جدید،دہلی،طبع (اول)۱۹۸۹ء

(۹۰) محمدعمررضا،ڈاکٹر''اردومیں سوانحی ادب،فن اورروایت''،فکشن ہاؤس،لاہور،طبع (اول)۲۰۱۲ء

(۹۱) محمدوسیم انجم''حیدرقریشی،فکروفن''،انجم پبلشرز،راولپنڈی،طبع (اول)۱۹۹۹ء

(۹۲) محی الدین قادری زور''روحِ تنقید''،مکتبہ معین الادب،لاہور،طبع (اول)،۱۹۵۵ء

(۹۳) ممتازحسین،''ادب اورشعور''،کراچی،اردواکیڈمی،طبع (اول)۱۹۶۱ء

(۹۴) ممتازشیریں،منٹونہ نوری نہ ناری،مکتبہ شہرزاد،کراچی،طبع (سوم)۱۹۸۵ء

(۹۵) ممتازمفتی''اوراوکھےلوگ''،فیروزسنز،لاہور،طبع (دوم)۱۹۹۱ء

(۹۶) منزہ یاسمین''حیدرقریشی،شخصیت اورفن،خانپورمیاں محمدبخش پبلشرز،طبع (اول)۲۰۰۳ء

(۹۷) میراجی''مشرق ومغرب کے نغمے''،لاہور،اکادمی پنجاب طبع (اول)۱۹۵۸ء

(۹۸) میمونہ انصاری، ڈاکٹر''تنقیدی رویے،لاہور،مکتبہ میری لائبریری،طبع (اول)۱۹۸۹ء

(۹۹) ناصرعباس نیرّ،ڈاکٹر''لسانیات اورتنقید''،اسلام آباد پورب اکادمی طبع،۲۰۰۹ء

(۱۰۰) نجیبہ عارف،ڈاکٹر''رفتہ وآئندہ''،پورب اکادمی،،طبع،(اول)۲۰۰۸ء

(۱۰۱) نذرخلیق،ڈاکٹر''حیدرقریشی کی ادبی خدمات''،خانپور،میاں محمدبخش پبلشرزطبع (اول)۲۰۰۳ء

(۱۰۲) نذیرفتح پور،سنجئے گوڑبولے حیدرقریشی،فن اورشخصیت،پوناانڈیا،اسباق پبلی کیشنز،س ن

(۱۰۳) نورالحسن نقوی''فن تنقیداورتنقیدنگاری''،،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،طبع (اول)۱۹۹۰ء

(۱۰۴) وزیرآغا،ڈاکٹر''اردوشاعری کا مزاج''،جدیدناشرین،طبع،لاہو(اول)۱۹۶۵ء

(۱۰۵) وزیرآغا،ڈاکٹر''تنقیداورجدیداردوتنقید،انجمن ترقی اردوپاکستان،کراچی،طبع (اول)۱۹۸۹ء

(۱۰۶) وزیرآغا،ڈاکٹر''نئے مکالمات''مرتبین،شاہدشیدائی،عابدخورشید،لاہورجمہورپبلی کیشنزطبع،۲۰۱۰ء

(۱۰۷) وقاراحمدرضوی،سیدڈاکٹر،''تاریخ نقد،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،طبع (اول)۲۰۰۴ء

(۱۰۸) وقارعظیم،سید''داستان سے افسانے تک''اردواکیڈمی کراچی،طبع (اول)۱۹۶۶ء

(۱۰۹) وقارعظیم،سید''فن اورفنکار''،اردومرکز،لاہور،طبع (اول)۱۹۹۶ء

(۱۱۰) یونس خان ''لسانی فلسفہ اور فکشن کی شعریات، لاہور دارالشعور، طبع، ۲۰۰۱ء

ادبی رسائل اور تحقیقی جرائد

(۱) ''الماس'' (تحقیقی مجلّہ) شمارہ نمبر ۴، ۳، ۲۰۰۲ء شعبہ اردو، شاہ عبدالطیف یونیورسٹی، خیر پور، سندھ
(۲) ''الماس'' (تحقیقی مجلّہ) شمارہ نمبر ۷، ۲۰۰۴ء شعبہ اردو، شاہ عبدالطیف یونیورسٹی خیر، پور سندھ
(۳) ''اوراق'' (سہ ماہی) (افسانہ، انشائیہ نمبر) مارچ، اپریل ۱۹۷۲، لاہور
(۴) ''اوراق'' (افسانہ نمبر) جنوری، فروری ۱۹۷۷ء لاہور
(۵) ''اوراق'' (جدید نظم نمبر) جولائی، اگست ۱۹۷۷ء لاہور
(۶) ''اوراق'' (سالنامہ) جنوری، فروری، ۱۹۸۰ء لاہور
(۷) ''اوراق'' (بہار نمبر) اپریل، مئی ۱۹۸۲، لاہور
(۸) ''اوراق'' (انشائیہ نمبر) اپریل، مئی ۱۹۸۵ء لاہور
(۹) ''اوراق'' (خاص شمارہ) اپریل، مئی ۱۹۸۷، لاہور
(۱۰) ''اوراق'' (سالنامہ) نومبر، دسمبر ۱۹۸۷، لاہور
(۱۱) ''اوراق'' (خاص نمبر) جون، جولائی، ۱۹۸۹، لاہور
(۱۲) ''اوراق'' (سالنامہ) جنوری، فروری ۱۹۹۰، لاہور
(۱۳) ''اوراق'' (خاص شمارہ) جون، جولائی ۱۹۹۲، لاہور
(۱۴) ''اوراق'' (خاص شمارہ) جولائی، اگست، ۱۹۹۴، لاہور
(۱۵) ''اوراق'' (سالنامہ) فروری، مارچ ۱۹۹۵، لاہور
(۱۶) ''اوراق'' (سالنامہ) جنوری، فروری ۱۹۹۶، لاہور
(۱۷) ''اوراق'' (سالنامہ) جنوری، فروری ۱۹۹۷، لاہور
(۱۸) ''اوراق'' (خاص نمبر) فروری، مارچ ۲۰۰۳، لاہور
(۱۹) ''اوراق'' (خاص نمبر) نومبر، دسمبر ۲۰۰۵، لاہور
(۲۰) ''بازیافت'' (تحقیقی مجلّہ) شمارہ ۱۴، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور
(۲۱) ''بازیافت (تحقیق مجلّہ) شمارہ ۱۵، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور
(۲۲) ''تحقیق'' (تحقیقی مجلّہ) شمارہ ۱۴، ۲۰۰۶ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو
(۲۳) ''تحقیق (تحقیقی مجلّہ) شمارہ ۱۵، ۲۰۰۷ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو
(۲۴) ''تحقیق'' (تحقیقی مجلّہ) شمارہ ۱۶، ۲۰۰۸ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو

(۲۵) ''تحقیق'' (تحقیقی مجلّہ) شمارہ ۱ (طبع ثانی) ۲۰۰۹ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو
(۲۶) ''تحقیق'' (تحقیقی مجلّہ) جلد ۱۸، شمارہ ۲، ۲۰۱۰، شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو
(۲۷) ''تحقیق'' (تحقیقی مجلّہ) جلد ۱۹، شمارہ ۱، ۲۰۱۱ء، شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو
(۲۸) ''خیابان'' (اصاف سخن نمبر) ۲۰۰۱ء، شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی
(۲۹) ''خیابان'' (اضاف سخن نمبر) ۹۵، ۱۹۹۴، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی
(۳۰) ''ذہن جدید'' (سہ ماہی) جلد ۱۷، شمارہ ۵۰، دسمبر تا فروری ۲۰۰۸ء، نئی دہلی
(۳۱) ''ذہن جدید'' (سہ ماہی) جلد ۱۸، شمارہ ۵۱، مارچ تا اگست، ۲۰۰۸ء نئی دہلی
(۳۲) ''ذہن جدید'' (سہ ماہی) جلد ۱۹، شمارہ ۵۲، ستمبر ۲۰۰۸ تا فروری ۲۰۰۹ء، نئی دہلی
(۳۳) ''ذہن جدید'' (سہ ماہی) جلد ۱۹، شمارہ ۵۳، مارچ تا مئی ۲۰۰۹، نئی دہلی
(۳۴) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) شمارہ ۱۴۱، جولائی، ستمبر ۱۹۹۴، لاہور
(۳۵) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) شمارہ ۱۴۵، جولائی، دسمبر ۱۹۹۵، لاہور
(۳۶) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) شمارہ ۱۴۳، جنوری، مارچ ۱۹۹۵، لاہور
(۳۷) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) ۱۵۱، اپریل، جون، ۱۹۹۷، لاہور
(۳۸) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) شمارہ ۱۴۹، اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۱، لاہور
(۳۹) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) ۱۷۱، اپریل، جون ۲۰۰۲، لاہور
(۴۰) ''صحیفہ'' (سہ ماہی) شمارہ ۱۸۷، جنوری، مارچ، ۲۰۰۶، لاہور
(۴۱) ''عکاس'' (حیدر قریشی نمبر) شمارہ ۴، اکتوبر، ۲۰۰۵ء اسلام آباد
(۴۲) ''عکاس'' (گوپی چند نارنگ نمبر) شمارہ ۹ مئی، ۲۰۰۹، اسلام آباد
(۴۳) ''عکاس'' شمارہ ۱۰، جنوری، ۲۰۱۰ء اسلام آباد
(۴۴) ''عکاس'' شمارہ ۱۱ مئی، ۲۰۱۰، اسلام آباد
(۴۵) ''عکاس'' شمارہ ۱۳، مارچ ۲۰۱۱، اسلام آباد
(۴۶) ''عکاس'' شمارہ ۱۵، اگست، ۲۰۱۲، اسلام آباد
(۴۷) ''عکاس'' شمارہ ۱۷، مارچ ۲۰۱۳، اسلام آباد
(۴۸) ''عکاس'' شمارہ ۱۸، جولائی ۲۰۱۳، اسلام آباد
(۴۹) ''فکر و تحقیق'' (سہ ماہی) جلد ۱۱، شمارہ ۱، جنوری، فروری مارچ ۲۰۰۸، نئی دہلی
(۵۰) ''فکر و تحقیق'' (سہ ماہی) جلد ۱۱، شمارہ ۴، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۸ نئی دہلی

(۵۱) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی جلد۱،شمارہ۲، جولائی ،دسمبر،۲۰۰۹اسلام آباد

(۵۲) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی ،جلد۲،شمارہ۱،جنوری، جون۲۰۱۰،اسلام آباد

(۵۳) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی جلد۲،شمارہ۲، جولائی ،دسمبر،۲۰۱۰،اسلام آباد

(۵۴) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی شمارہ۴، جولائی ،دسمبر۲۰۱۱

(۵۵) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی شمارہ۷،جنوری، جون،۲۰۱۲،اسلام آباد

(۵۶) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی شمارہ۸، جولائی ،دسمبر،۲۰۱۲،اسلام آباد

(۵۷) ’’معیار‘‘(تحقیق مجلّہ)شعبہ اردو، بین الاقوامی یونیورسٹی شمارہ۹،جنوری، جون،۲۰۱۳،اسلام آباد

لغات

(۱) اُردولغت (تاریخی اُصولوں پر) (اُردولغت بورڈ،کراچی ۱۹۸۷ء)

(۲) تشریحی لغت (مرتبین،اُردوسائنس بور،لاہورڈ،۲۰۰۱ء)

(۳) علمی اُردولغت (وارث سرہندی،علمی کتاب خانہ،،لاہور۱۹۹۰ء)

(۴) فرہنگِ آصفیہ (مولوی سیداحمد دہلوی،ترقی اُردو بورڈ،نئی دہلی۱۹۹۰ء)

(۵) قومی اُردولغت (ڈاکٹرجمیل جالبی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد۲۰۰۲ء)

(۶) نوراللغات (مولوی نورالحسن نیر،نیشنل بک فاونڈیشن،راولپنڈی۱۹۸۹ء)

(۷) ہندی اُردولغت (راجہ جیسورراؤ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد۱۹۸۸ء)

فرہنگِ اصطلاحات (اُردو)

(۸) فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ(ڈاکٹرجمیل جالبی، جامعہ عثمانیہ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۹۱ء)

(۹) کشاف تنقیدی اصطلاحات (ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد۱۹۸۵ء)

(۱۰) تنقیدی اصطلاحات (ڈاکٹرسلیم اختر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہورطبعِ اول(۲۰۱۱ء)

اُصولِ تحقیق

(۱) ابنِ کنول،تحقیق وتدوین۔کتابی دنیا،دہلی،مئی،۲۰۰۶ء

(۲) اسد فیض،اُردوتحقیق،مسائل ومعیار،ہم عصر پبلی کیشنز،ملتان،۲۰۰۱ء

(۳) اعجاز راہی،ڈاکٹر،تحقیق اوراصولِ وضعِ اصطلاحات،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۷ء

(۴) تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،ادبی تحقیق کے اُصول،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۹۲ء

(۵) خلیق انجم،ڈاکٹر،متنی تنقید،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،۲۰۰۶ء،

(۶) رشید حسن خان،ادبی تحقیق،مسائل اور تجزیہ،علی گڑھ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،نئی دہلی،طبع اول،۱۹۶۷ء

(۷) رفاقت علی شاہد،تحقیق شناسی،القمرانٹرپرائزز،لاہور،۲۰۰۳ء

(۸) عطش درانی،ڈاکٹر،اُصولِ ادبی تحقیق،نذیرسنزایجوکیشنل پبلشرز،لاہور،۲۰۱۱ء

(۹) گیان چند،ڈاکٹر،تحقیق کافن،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۰۲ء

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

سوانحی خاکہ

حیدر قریشی۔شخص و عکس

مرتّب :ارشد خالد

مدیر عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)

نام: قریشی غلام حیدر ارشد قلمی نام: حیدر قریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر۱۹۵۳ء ‘(درست خاندانی روایت:۱۳/جنوری۱۹۵۲ء)

مقامِ پیدائش: چناب نگر

آبائی علاقہ: رحیم یار خاں‘ خان پور(سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے(اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: شاعری میں: غزل‘نظم‘ماہیا

اصنافِ ادب: نثر میں:افسانہ‘خاکہ‘انشائیہ‘سفر نامہ‘یادنگاری‘تحقیق وتنقید،حالاتِ حاضرہ

کتب کی تفصیل:

شاعری

’’سلگتے خواب‘‘ (غزلیں)‘ناشر:تجدید اشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۱ء

’’عمرِ گریزاں‘‘ (غزلیں‘نظمیں اور ماہیے)‘ناشر:تجدید اشاعت گھر لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

’’محبت کے پھول‘‘ (ماہیے)‘ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

’’دعائے دل‘‘(غزلیں‘نظمیں)ناشر:نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ۱۹۹۷ء۔

’’غزلیں‘نظمیں‘ماہیے‘‘(چاروں مجموعوں کا مجموعہ)ناشر:سرور ادبی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ۱۹۹۸ء۔

’’درد سمندر‘‘(غزلیں‘نظمیں اور ماہیے)یہ مجموعہ کلیات’عمرلاحاصل کا حاصل‘میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر

’’روشنی کی بشارت‘‘(افسانے)ناشر:تجدید اشاعت گھر،اسلام آباد،لاہور۔ مطبوعہ۱۹۹۲ء۔

’’قصے کہانیاں‘‘(افسانے)یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔افسانے میں شامل ہے۔

’’افسانے‘‘(روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)‘ناشر:معیار پبلی کیشنز دہلی۔ مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

’’ایٹمی جنگ‘‘(تین افسانے اردو اور ہندی میں)ناشر:معیار پبلی کیشنز دہلی۔مطبوعہ۱۹۹۹ء۔

’’میں انتظار کرتا ہوں‘‘(افسانوں کا ہندی ترجمہ)ناشر:ساہتیہ بھارتی،دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔

AND I WAIT (اب تک کے سارے افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۸ء

’’میری محبتیں‘‘(خاکے)ناشر:نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ۱۹۹۶ء۔

’’میری محبتیں‘‘(خاکے)،ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء۔

’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘(یادنگاری)پہلے یہ الگ سے شائع نہیں کی،عمرِ لاحاصل کا حاصل میں شامل ہے۔اب سال ۲۰۱۳ءمیں تین ابواب کے اضافوں کے ساتھ پاکستان سے الگ کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز،خانپور۔مطبوعہ۲۰۱۳ء

’’ سُوئے حجاز‘‘(سفر نامہ۔عمرہ کا احوال)‘ناشر:معیار پبلی کیشنز،دہلی۔مطبوعہ ۲۰۰۰ء۔

’’ سُوئے حجاز‘‘(سفر نامہ،سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)،ناشر:سرور ادبی اکادمی جرمنی۔مطبوعہ۲۰۰۴ء۔

’’فاصلے،قربتیں‘‘(انشائیے)یہ کتاب ابھی الگ سے شائع نہیں کی،’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘میں شامل ہے۔

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات۔میگزین سائز۲۸۴صفحات

ناشر:معیار پبلی کیشنز۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۵ء

عمرِ لاحاصل کا حاصل

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات،لائبریری ایڈیشن۔

میگزین سائز۶۱۲صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔مطبوعہ۲۰۰۹ء

عمرِ لاحاصل کا حاصل (انٹرنیٹ ایڈیشن)

مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی کلیات، لائبریری ایڈیشن۔

میگزین سائز ۶۸۰ صفحات (بعد کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ء

کے بعد ۲۰۱۲ء تک کی تخلیقات کے اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ ایڈیشن

قفس کے اندر

چھ شعری مجموعے ایک ساتھ۔۔عوامی اور اکانومی ایڈیشن ایک ہزار سے زائد صفحات کا میٹر صرف ۱۵۲ صفحات میں

سلگتے خواب　　عمرِ گریزاں　　محبت کے پھول

دعائے دل　　دردسمندر　　زندگی

ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد بہ اشتراک نایاب پبلی کیشنز خانپور۔ مطبوعہ ۲۰۱۳ء

تحقیق وتنقید

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین) ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔ خانپور مطبوعہ ۱۹۹۵

حاصلِ مطالعہ (تنقیدی مضامین) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مطبوعہ ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ء

تاثرات (تنقیدی مضامین اور تبصرے)۔ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۱۲ء

ستیہ پال آنند کی ''۔ بُودنی نابُودنی'' (مضامین)۔ ناشر: عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد۔ ۲۰۱۳ء

مضامین اور تبصرے (نئے مضامین کا مجموعہ) زیر اشاعت۔ ناشر: عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد۔ ۲۰۱۴ء

ہمارا ادبی منظر نامہ (تنقید کے چھ مجموعے ایک جلد میں) ناشر: عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ ۲۰۱۴ء

اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق وتنقید) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔ اسلام آباد۔ مطبوعہ ۱۹۹۷ء

اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔ راولپنڈی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین) ناشر: معیار پبلیکیشنز دہلی۔ ۱۹۹۹ء

اردو ماہیا (ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔ یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں شامل ہے)

ماہیے کے مباحث (مضامین۔ یہ کتاب ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' میں شامل ہے)

اردو ماہیا تحقیق وتنقید (ماہیے کی تحقیق وتنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں)

ناشر: الوقار پبلی کیشنز۔ لاہور۔ مطبوعہ ۲۰۱۰ء

حالاتِ حاضرہ

منظر اور پس منظر (9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)

ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء

خبر نامہ (خبروں پر تبصروں کا سلسلہ)۔ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۶ء۔

اِدھر اُدھر سے (خبروں پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ) ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۸ء

چھوٹی سی دنیا (مشرق ومغرب کے پس منظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ)

۲۰۱۲ء میں اس مختصر کتاب کا انٹرنیٹ ایڈیشن شائع کیا گیا

حالاتِ حاضرہ (مذکورہ چاروں کتابوں کو ایک جلد میں یکجا کر کے ای بک آن لائن کر دی گئی ہے۔ ۲۰۱۳ء)

بطور مرتب

شفق رنگ: (ضلع رحیم یار خان کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور، مطبوعہ اپریل ۱۹۷۹ء

کرنیں: (بھاولپور ڈویژن کے شعراء) ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور۔ مطبوعہ اپریل ۱۹۸۰ء

سرائیکی غزل: (سرائیکی میں ایک بحث کے ساتھ غزلوں کا انتخاب)

ناشر: جدید ادب پبلی کیشنز، خانپور مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۰ء

پہلا ورق: (اوراق کے اداریے) ناشر: مکتبہ ہم زبان کراچی۔ مطبوعہ ۱۹۹۰ء

ادارت

ادبی رسالہ ''جدید ادب'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔ ۱۷ شمارے شائع کیے۔ ان میں ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات تک کے شمارے شامل ہیں۔

جرمنی سے جدید ادب ۱۹۹۹ء میں دوبارہ شروع کیا گیا لیکن دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ چند برسوں کی بندش کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء سے یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔ یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔ www.jadeedadab.com

اب اس لنک سے بھی جدید ادب کو حاصل کیا جا سکتا ہے: http://jadeedadab.blogspot.de/

ان کوائف کی ترتیب تک اس کے ۱۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس ششماہی رسالہ کے سجاد ظہیر نمبر اور میرا جی نمبر

شائع ہو چکے ہیں۔حیدرقریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ: www.haiderqureshi.com

---

اہم ای لائبریریز: **ان بلاگس میں حیدرقریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں**

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://haider-qureshi.blogspot.de/

اس لنک پر حیدرقریشی پر لکھی گئی،مرتب کی گئی کتب ورسائل کی پی ڈی ایف فائلز موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

حیدرقریشی کی تمام کتابیں اس لائبریری میں بھی موجود ہیں

http://issuu.com/haiderqureshi

حیدرقریشی کی کتابوں تک رسائی مزید آسان،ایک اور لائبریری اور دو نئے مربوط بلاگس

https://archive.org/search.php?query=uploader%3A%22
haider_qureshi2000%40yahoo.com%22&sort=-publicdate

حیدرقریشی کی تمام ۲۷ کتابیں پانچ کلیات کی صورت میں:

http://my27books.blogspot.de/

حیدرقریشی کی تمام کتابیں الگ الگ صورت میں:

http://kuliat-library.blogspot.de/

ادبی بلاگس **ان بلاگس پر حیدرقریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔**

سوئے حجاز: http://soo-e-hijaz.blogspot.de/

''روشنی کی بشارت''،''قصے کہانیاں''اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

خاکوں کا مجموعہ''میری محبتیں'':http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

یادوں کا مجموعہ''کھٹی میٹھی یادیں'':http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

انشائیوں کا مجموعہ''فاصلے،قربتیں'':http://inshaiya.blogspot.de/

دو خاص بلاگس کلکتہ اور دہلی کا سفر،باتصویر

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

حیدرقریشی کی البم: زندگی تصویروں کے آئینے میں

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

وکی پیڈیا کے صفحات

حیدرقریشی : **http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi**

جدید ادب : **http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab**

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

ادبی اعتراف

حیدرقریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔حیدرقریشی فکروفن مصنف:محمد وسیم انجم

(مطبوعہ ۱۹۹۹ء)ناشر:انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔حیدرقریشی فن اور شخصیت

مرتبین: نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔حیدرقریشی کی ادبی خدمات

مرتب: ڈاکٹر نذر خلیق (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان

۴۔حیدرقریشی شخصیت اور فن۔۔۔منزہ یاسمین کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ۔سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء

ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۵۔حیدرقریشی سے لیے گئے انٹرویوز

مرتب:سعید شباب(مطبوعہ۲۰۰۴ء) ناشر:نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ عکاس حیدرقریشی نمبر۔۔۔مدیرومرتب:ارشدخالد

ناشر:عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

۷۔حیدرقریشی کی شاعری مرتب:ہردے بھانو پرتاپ

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔(مطبوعہ۲۰۱۳ء)

۸۔حیدرقریشی شخص وعکس مدیرومرتب:ارشدخالد

ناشر:عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد(۲۰۱۴)

۹۔حیدرقریشی کاادبی سفر عامرسہیل کاایم فل کاتحقیقی مقالہ کتابی صورت میں

ناشر:

حیدرقریشی پرترتیب دیئے گئے گوشےاورمطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ''اسباق''پونہ شمارہ:فروری تااپریل۱۹۹۳ء۔ایڈیٹر:نذیرفتح پوری

۲۔حیدرقریشی(بطورافسانہ نگار)مطبوعہ ماہنامہ''شاعر''بمبئی۔

شمارہ مئی تادسمبر۱۹۹۷ء۔ہم عصراردوادب نمبر۔۔۔ ایڈیٹر : افتخارامام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدرقریشی''ہفت روزہ ہوٹل ٹائمز اسلام آباد۲۲مئی تا ۲۸ مئی۱۹۹۸۔ مرتبین:اختررضاکیکوٹی،محمدوسیم انجم

۴۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی''ادبِ عالیہ''وہاڑی۔شمارہ مارچ۲۰۰۲ء۔ایڈیٹرز:ریاض ہانس

۵۔خصوصی مطالعہ''مہرِ امروز''مطبوعہ ماہنامہ کائنات شمارہ مئی۲۰۰۴ء

(urdudost.com) ایڈیٹر:خورشیداقبال

۶۔گوشہءحیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر:افتخارامام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی ادب ساز دہلی(تقریباً۵۰صفحات میگزین سائز پرمشتمل)

شمارہ:۶،۷،جنوری تاجون۲۰۰۸ء،ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ''**عمرِ لاحاصل کاحاصل**''

مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰) مدیر:ارشدخالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق ونقاد،مطبوعہ،ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد

(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء) مدیر:ارشدخالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب:''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ۲۰۱۱ء۔مدیرومرتب:ارشدخالد

۱۱۔ایک گوشہ حیدرقریشی کے لیے۔دوصفحات پرمشتمل۔ روزنامہ پیغام دہلی

شمارہ:۱۰رمئی۲۰۱۴ء،ایڈیٹر:مطیع الرحمٰن عزیز

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

ڈاک کامستقل پتہ: **Haider Qureshi**

Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim, Germany.

ٹیلی فون نمبر:0049-6190-930078 ای میل:haider_qureshi2000@yahoo.com

---

بحوالہ عکاس اسلام آباد شمارہ اکتوبر۲۰۰۵ءحیدرقریشی نمبرمدیرارشدخالد

اگست۲۰۱۴ءتک تازہ ترین اضافوں کے ساتھ

خصوصی نوٹ

حیدرقریشی کے اوریجنل ورک کے حوالے سے اب تک ستائیس کتابیں منظرِ عام پرآچکی ہیں۔

شاعری:چھ مجموعے۔۔۔افسانے:دومجموعے۔۔۔خاکہ نگاری:ایک مجموعہ

یادنگاری:ایک مجموعہ۔۔۔انشائیہ نگاری:ایک مجموعہ۔۔۔سفرنامہ:ایک مجموعہ

ماہیا کی تحقیق وتنقید:پانچ کتابیں۔۔۔۔متفرق تنقیدی مضامین:چھ کتابیں

حالاتِ حاضرہ:کالموں کے چارمجموعے

یہی ۲۷کتابیں متفرق اورمختلف ایڈیشنز کی صورت میں پینتیس کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔یہ صرف اوریجنل ورک کے ذیل میں آنے والی کتابیں ہیں۔مرتب کردہ کتب اورادبی رسائل کی ایڈیٹنگ کوان میں شمارنہیں کیا گیا۔

تاثرات

ڈاکٹر رشید امجد

(اسلام آباد)

حیدر قریشی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔نظم ونثر دونوں میں اُن کی انفرادیت حیثیت ہے۔''جدید ادب'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی اُن کا کام اہم ہے۔اس جریدے کے خاص نمبر اب حوالے کا درجہ رکھتے ہیں۔حیدر قریشی میری نسل کے بعد آنے والی نسل کے ادیب وشاعر ہیں۔ہم لوگوں نے ساٹھ کی دہائی کے بعد علامتی رویوں کو اپنایا اور نئی لسانی تشکیلات کے حوالے سے لکھنے کا آغاز کیا۔حیدر قریشی کے جریدے''جدید ادب'' نے نئے رویوں اور رجحانات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔بطور افسانہ نگار اور شاعر حیدر قریشی کی اپنی ایک پہچان ہے۔تخلیقی جہتوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنقیدی میدان میں بھی اپنی اہمیت قائم رکھی۔ماہیا اور جدید نظم کے حوالے سے ان کے مضامین نے نئی جہتوں کا آغاز کیا۔اُن کی بنیادی خوبی اُن کا کھرا پن اور سچ کہنے کا حوصلہ ہے جس کی وجہ سے انھیں کئی بار تیز وتند حملوں کا شکار بھی ہونا پڑا لیکن اُنھوں نے ثابت قدمی سے ان سب اعتراضات کے نہ صرف جواب دیئے بلکہ اپنے موقف کو پوری دلیل سے واضح کیا اور کر رہے ہیں۔

حیدر قریشی کے فکر وفن پر کئی جامعات میں کام ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے۔عامر سہیل کا یہ مقالہ حیدر قریشی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔مقالہ نگار نے جستجو اور لگن کے ساتھ حیدر قریشی کے بنیادی مزاج اور اُن کے تنقیدی اور تحقیقی کام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اس مقالے کی اشاعت سے جہاں مقالہ نگار کے اس تحقیقی کام کی اہمیت واضح ہوگی وہیں حیدر قریشی کے فکر وفن کے کئی پہلو بھی نمایاں ہوں گے جو اُردو ادب کے قاری کے لیے دل چسپی کا سبب ہوں گے۔

حیدر قریشی کا کام بہت پھیلا ہوا ہے ایک مقالے میں اس کا احاطہ ممکن نہیں لیکن عامر سہیل نے امکان بھر کوشش کی ہے کہ بنیادی پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے حیدر قریشی کے کام سے ادبی قاری کو متعارف کرا سکیں اور وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب رہے ہیں۔

ڈاکٹر لدمیلا وسیلئیوا

(ماسکو، روس)

حیدر قریشی کی ادبی خدمات کے عنوان سے عامر سہیل کا ایم فل اردو کا مقالہ زیرِ نظر ہے۔۔۔۔۔یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپنے جا رہا ہے اور میرا کام اس پر اپنے مجموعی تاثرات ظاہر کرنا ہے۔۔۔۔۔حیدر قریشی ایک عرصے سے اردو کی ادبی دنیا میں اپنی تحریروں سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی ادبی سرگرمیاں دنیا کے ہر اُس کونے میں مشہور ہو چکی ہیں جہاں اردو کا نام ہے۔اکثر حیدر قریشی کا ذکر یورپ میں اردو ادب کے سفیر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔حیدر قریشی کی کثیر الجہت تخلیقات پر کئی باوقار ادیب اپنی رائے لکھ چکے ہیں اور برصغیر کے دونوں ممالک میں یونیورسٹیوں کے طالب علم ان کی ہمہ پہلو ادبی خدمات کے موضوع پر اپنے علمی مقالے بھی لکھ چکے ہیں۔

عامر سہیل نے بھی یہی موضوع چُن کر حیدر قریشی کے ادبی سفر کو اپنے زاویے سے دیکھنے کی اور خود اپنے طریقے سے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔اپنا علمی کام عامر سہیل نے بڑی محنت اور لگن سے کیا ہے۔ ۳۱۶ صفحات پر مشتمل اس ضخیم تحریر کو حیدر قریشی پر موجودہ ادب میں ایک نمایاں اضافہ کہنا بالکل بجا ہوگا۔

میرے خیال میں اس مقالے کا موضوع بذاتِ خود بڑی اہمیت کا حامل ہے اور عصری دنیا میں اردو زبان اور زبان والوں کے متعدد مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔یہ مسائل کئی طرح کے ہیں جو نہ صرف اردو کی ''نئی بستیوں'' سے بلکہ برِصغیر پاک و ہند سے بھی وابستہ ہیں۔ایک نہایت اہم عالمی پیمانے کا مسئلہ مغربی دنیا میں اپنی جگہ کے حصول یا دوسرے الفاظ میں ایک نئی، اجنبی دنیا میں خود اپنی تلاش کا، مشرقی ممالک سے آنے والے تارکین وطن کا مسئلہ ہے، جس کے نفسیاتی، مذہبی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی جیسے کئی پہلو ہیں۔قومی شناخت کا دوسرا اہم ترین مسئلہ براہ راست طور پر قومی زبان اور ادب سے وابستہ ہے۔یہاں خالص ادبی مسائل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو موضوع کے انتخاب اور کرداروں کی نوعیت سے لے کر نئی طرزِ تحریر اور نئے اسلوب اپنانے کی کوششوں تک کا احاطہ کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔یہ سارے مسائل بہترین طور پر مغربی ملکوں میں آباد اردو ادیبوں کی تخلیقات میں منعکس ہوتے ہیں، جن کے درمیان حیدر قریشی کی تصانیف کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔زیرِ نظر مقالے میں ایک منفرد زاویہ نظر سے حیدر قریشی کی ادبی کارکردگی کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس کی روشنی میں سارے مذکورہ بالا مسائل اجاگر ہو جاتے ہیں اور ان پر گہری سوچ کے لیے دعوت دیتے ہیں۔

آج کل دیارِ مغرب میں بسے ہوئے اردو لکھنے والوں کو اپنے آباو اجداد کے مادرِ وطن کی تہذیبی وثقافتی روایات کو بھلا نہ دینے اور نوجوان نسل کو اپنی قومی شناخت کو باشعور طور پر محسوس کرانے کا ایک سنجیدہ فرض درپیش

ہے جس کی عمل آوری میں حیدر قریشی کی جیسی تحریریں مددگار ہوسکتی ہیں۔ دوسری طرف یہی تصانیف اردو ادب کے پورے دھارے سے الگ نہ ہوتے ہوئے برصغیر کے اردو کے قارئین کو اپنے نئے مقام اور اپنے خصوصی مسائل سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی تجربات سے پاکستان اور ہندوستان کے اردو ادب کو مالا مال کرتی ہیں۔ حیدر قریشی کی مختلف اصناف کی تصانیف کے عامر سہیل کے مطالعے کے بنا پر قاری اسی طرح کے نتائج پر پہنچ سکتا ہے۔

عامر سہیل کے مقالے کی معلوماتی حیثیت بھی خاص طور سے قابلِ تعریف ہے۔ مقالہ نگار نے ایک تو بڑے سلیقے سے حیدر قریشی کے پورے ادبی ذخیرے کی اور ان پر لکھی ہوئی اور ان سے تعلق رکھنے والی تحریروں کی مکمل فہرست بنائی ہے۔ خود حیدر قریشی کی تصانیف کی درجہ بندی کر کے مقالہ نگار نے ہر صنف کی تفصیلات پیش کیں اور ان کی سب تصانیف پر موجود تنقیدی سرمائے کا تعارف کرایا ہے۔ عصری دور کے کسی اور اردو ادیب کی تصانیف اور اس سے منسلک ادب کے بارے میں زیادہ وسیع، واضح اور باترتیب تفصیلات کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر محمد الطاف یوسفزئی

(شعبۂ اُردو۔ ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ)

اُردو ادب کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو مغرب کا جدید منظر نامہ جو صورتِ حال متعارف کراتا ہے اُس میں حیدر قریشی کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ ان کا متنوع تصنیفی سرمایہ ہر سنجیدہ قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے، میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ بلند سطح کے ذوقِ سلیم اور گہرے پس منظری مطالعے کے بغیر حیدر قریشی جیسے ہمہ جہت اور صاحبِ طرز ادیب کی تحریروں سے حظ اُٹھانا محال ہے۔ اپنی تبحر علمی اور خوش ذوقی کی بنا پر جس سادگی و پرکاری سے عامر سہیل نے حیدر قریشی جیسے کثیر الجہت ادیب کو ایم فل کے مقالے میں سمیٹ کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہ بجائے خود اُن کی ناقدانہ اور محققانہ صلاحیتوں اور طباعی کی روشن دلیل ہے۔

میرے خیال میں یہ حیدر قریشی کی خوش بختی ہے کہ اُنھیں ایک ایسا قلم کار میسر آیا جس نے رسمی تبصرہ نگاری اور عمومیت سے گریز کرتے ہوئے جدید اُصولِ تحقیق اور متوازن تنقیدی جوہر کی بدولت اُن کے ادبی مقام پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے۔ حیدر قریشی کی متنوع اور رنگا رنگ تحریروں کی تفہیم و تحسین کے سلسلے میں عامر سہیل کی یہ علمی کاوش حوالے کی کتاب ثابت ہوگی جس سے شائقین ادب کے لیے مستفید ہونے کی راہیں نکلتی رہیں گی۔

ڈاکٹر عابد سیال

(شعبۂ اردو۔ نمل یونیورسٹی۔ اسلام آباد)

حیدر قریشی معاصر اردو ادبی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کی کئی جہات ہیں جن میں تخلیقی حوالے سے افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، سفرنامہ نگاری، یادداشتیں، غزل، نظم اور ماہیا ان کی پہچان ہیں۔ انھوں نے تخلیقِ ادب کے ہر میدان میں نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ ذخیرہ بہم کیا ہے بلکہ معیار اور انفرادیت کے اعتبار سے بھی ان کی نظم و نثر اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق اور تنقید کے حوالے سے ان کی خدمات بہت قابل توجہ ہیں۔ اردو میں ماہیے کی مقبولیت کے ابتدائی زمانے میں ماہیے کی ہیئت اور مزاج کی شناخت اور تعین کے حوالے سے ان کا مدلّل اور مفصل کام یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد مضامین اور متفرق تحریریں ملکی و بین الاقوامی جرائد میں تواتر کے ساتھ چھپتی رہی ہیں، جرأتِ اظہار اور صاف گوئی جن کا نمایاں وصف ہے۔ یہ سارا کام بجا طور پر اس قابل ہے کہ اس کو تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنایا جاتا اور حیدر قریشی کی شخصیت اور فن کے متنوع گوشوں کو اجاگر کیا جاتا۔ یہ کام میرے عزیز اور قابل دوست عامر سہیل نے سرانجام دیا ہے۔

عامر سہیل خود ایک خوش خیال شاعر بھی ہیں اور تحقیق کے مردِ میدان بھی۔ تخلیقی ادب کی رمز و اشارت کے آشنا بھی ہیں اور تجزیہ و تنقید کی پہلوداریوں کے واقف بھی۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی مقالے کا ایک اور روپ ہے جس پر ایک طرف انھیں ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ سے ایم۔فل (اردو) کی ڈگری عطا کی گئی ہے اور دوسری طرف قارئین و شائقینِ اردو ادب اس کی پذیرائی کریں گے۔ سندی تحقیق میں کم ہی مقالے ایسے ہوتے ہیں جو امتحانی ضرورت سے آگے بڑھ کر باقاعدہ ادبی تصنیف کا درجہ پاسکیں۔ عامر سہیل کی یہ تصنیف نہ صرف ان کے لیے باعثِ تحسین ہے بلکہ ان کے شعبے اور یونیورسٹی کے لیے بھی باعث اعزاز ہے کہ وہاں ہونے والا تحقیقی کام باقاعدہ اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ میرے لیے اس کتاب کی اشاعت دوگونہ مسرت کا باعث ہے کہ اس کے ممدوح میرے کرم فرما ہیں اور مصنف میرے دوست۔ میں ہر دو شخصیات کو کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

انٹرنیٹ پرحیدرقریشی کی کتابوں کی دستیابی نہایت مربوط اور آسان، متعدد دیگر بلاگس اور لنکس کے مقابلہ میں یہ تین لنک آسان ترین ہیں

حیدرقریشی کی اب تک کی تمام ۲۷ کتابیں الگ الگ کتاب کی صورت میں

http://my27books.blogspot.de/

حیدرقریشی کی تمام کتابیں اصنافِ ادب کے مطابق کلیات کی صورت میں

http://kuliat-library.blogspot.de/

حیدرقریشی کے فن کے حوالے سے مرتب کی گئی اور لکھی گئی کتابیں

اخبار و ادبی رسائل کے نمبر اور گوشے

اور یونیورسٹی کے تحقیقی مقالات اس لنک پر

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

جملہ کتابیں براہِ راست مطالعہ بھی کی جا سکتی ہیں اور ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے ذاتی ریکارڈ، اپنی ای لائبریری میں بھی رکھی جا سکتی ہیں۔

حیدرقریشی پر اب تک ہونے والا یونیورسٹی سطح کا تحقیقی کام

براہِ راست

۱۔حیدرقریشی شخصیت اور فن ۔۔۔۔منزہ یاسمین (**ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ** سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء)
(اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، پاکستان)

۲۔حیدرقریشی شخصیت اور ادبی جہتیں ۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالرب استاد (تحقیقی مقالہ برائے **پی ایچ ڈی** ۲۰۱۳ء)
(گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)

۳۔حیدرقریشی۔حیات و خدمات انجم آراء (**ایم فل کا مقالہ** سال ۲۰۱۳ء)
(کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا)

۴۔حیدرقریشی کی ادبی خدمات ۔۔۔۔عامر سہیل (تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو، ۲۰۱۴ء)
(ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان)

۵۔حیدرقریشی کی شاعری کا مطالعہ۔۔۔ہردے بھانو پرتاپ (**ایم فل کا مقالہ**، سال ۲۰۱۴ء)
(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۶۔حیدرقریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ۔۔۔رضینہ خان (**ایم فل کا مقالہ** سال ۲۰۱۴ء)
(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

بالواسطہ

۱۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث ۔۔۔۔شازیہ حمیرہ
سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے **ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ**

۲۔اردو میں ماہیا نگاری از ڈاکٹر صبیحہ خورشید
سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■